مولانا وحید الدّین خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم الله الرحمن الرحیم

قال اللہ
وقال الرسول ﷺ

مولانا وحید الدّین خاں

قال اللہ

حکمتِ قرآن

قرآن ۲۳ سال میں نجماً نجماً (تدریجی طور پر) اترا۔ اس اسلوب نزول کی حکمت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ وقل رب زدنی علما (طٰہٰ ۱۱۴) اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور کہو کہ اے میرے رب، میرا علم زیادہ کر دے۔

مکہ میں قرآن کے ذریعہ جو دعوتی مہم چل رہی تھی، اس میں بار بار لوگوں کی طرف سے نئے نئے سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ اور ان مسائل کا حل دریافت کیا جاتا تھا جن کی بابت قرآن میں ابھی کچھ نہیں اترا تھا۔ مثلاً مشرکین کی زیادتیوں کے بارہ میں قرآن میں یہ حکم اترا تھا کہ ان پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب ان کا شکار ہونے والے مسلمان یہ کہتے تھے کہ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے لڑکر اس کا خاتمہ کریں۔ ایسی حالت میں مخلص اہلِ ایمان فطری طور پر یہ چاہتے تھے کہ قرآن کا وقفۂ نزول کم ہو تاکہ بقیہ معاملات میں بھی جلد از جلد خدا کی رہنمائی مل جائے۔ جزئی احکام والے قرآن کے بجائے مکمل احکام والا قرآن ہمیں حاصل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن جس ترتیب و تدریج سے اتر رہا ہے وہ اتفاقی نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا طے شدہ منصوبہ ہے۔ قرآن اسی طرح اسی اسلوب میں اترتا رہے گا یہاں تک کہ فطری طور پر وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

اہلِ ایمان کو اس سے روکا گیا کہ وہ مستقبل میں اترنے والے قرآن (یا احکام قرآن) کو حال میں اتارنے کے خواہش مند ہوں۔ اس کے بجائے تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تمہارے فہم قرآن میں اضافہ کر دے۔ قرآن کی اگلی آیتوں کے بارہ میں تعجیل کے بجائے تمہیں اس حکمت کو جاننے کی کوشش کرنا چاہیے کہ قرآنی احکام کے نزول میں تدریج کیوں رکھی گئی ہے۔

مصلح کے لیے جائز نہیں کہ وہ جلد باز بنے۔ دعوت کے حالات میں لوگوں کو جہاد پر اکسانا، تعمیر فکر کے دور میں اجتماعی اقدام کا حکم سنانا، جن مواقع پر صبر و اعراض مطلوب ہے وہاں قتال کی آیتوں کے حوالے دینا، یہ سب اسی کے ذیل میں داخل ہے۔

شیطان کا خطرہ

قرآن کی سورہ نمبر، میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس اتارا، جو تمہارے بدن کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت بھی۔ اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ تاکہ لوگ غور کریں۔ اے آدم کی اولاد، شیطان تم کو بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوادیا، اس نے ان کے لباس اتروائے، تاکہ ان کو ان کے سامنے بے پردہ کردے۔ وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے (الاعراف ۲۶ - ۲۷)

خدا نے انسان کو لباس دیا جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کے حسن و وقار کو بڑھانے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی کے روحانی وجود کے لیے بھی اسی طرح ایک لباس ضروری ہے۔ یہ لباس تقویٰ ہے۔ تقویٰ آدمی کا معنوی لباس ہے۔ جو اس کو ایک طرف شیطان کے حملوں سے بچاتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے باطن کو سنوار کر اس کو جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے قابل بناتا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس کیا ہے۔ یہ ہے —— اللہ کا خوف، حق کا اعتراف، اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک معیار رکھنا، اپنے کو بندہ سمجھنا، تواضع کو اپنا شعار بنانا، دنیا میں گُم ہونے کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ رہنا۔ آدمی جب ان چیزوں کو اپنائے تو وہ اپنے اندرونی وجود کو ملبوس کرتا ہے۔ اور وہ اگر اس کے خلاف رویہ اختیار کرے تو وہ اپنے اندرون کو ننگا کر لیتا ہے۔ ظاہری جسم کو کپڑے کا بنا ہوا لباس ڈھانکتا ہے۔ اور باطنی جسم کو تقویٰ کا لباس۔

آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو بہکاتا ہے۔ وہ خدا کے ممنوعہ درخت کو ہر قسم کے خیر کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ وہ ایسے معصوم راستوں سے اس کی طرف آتا ہے کہ آدمی کا گمان بھی نہیں جاتا کہ ادھر سے اس کی طرف گمراہی آرہی ہوگی۔ شیطان آدمی کے تمام نازک مقامات کو جانتا ہے۔ اور انہی نازک مقامات سے وہ اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تاہم شیطان صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے جو اس کے لیے اپنے تمام دروازے کھول دیں۔

اصلاحی مداخلت

قرآن کی اٹھارویں سورہ میں موسیٰؑ اور خضرؑ کا قصہ بیان ہوا ہے۔ خضر غالباً کوئی فرشتہ تھے جو حضرت موسیٰ کی تعلیم کے لیے انسان کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ دونوں نے غالباً مصر اور سوڈان کے درمیانی علاقہ میں ایک لمبا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران حضرت خضرؑ نے تین خاص واقعات کیے۔

ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ راستہ میں خضر نے اس کشتی کو پھاڑ دیا (الکہف ۷۱) حضرت موسیٰؑ نے متعجب ہو کر اس کا سبب پوچھا تو حضرت خضرؑ نے جواب دیا: کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کردوں۔ اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین کر لے لیتا تھا (الکہف ۷۹)

اس واقعہ کی مختلف تفصیلات حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غریب آدمی پانی میں کشتی چلانے کا پیشہ کرتے تھے۔ یہی ان کی معاش کا ذریعہ تھا۔ جس علاقہ میں وہ کشتی چلاتے تھے، وہاں کے بادشاہ کو کوئی جنگی مہم پیش آگئی۔ اس نے حکم جاری کر دیا کہ ہنگامی ضرورت کے تحت اس علاقے میں چلنے والی تمام اچھی کشتیوں کو ضبط کر لیا جائے۔ حضرت خضرؑ کو اس کا علم تھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ کشتی جب مذکورہ علاقہ کے قریب پہنچی تو انھوں نے اس کا ایک تختہ نکال کر اس کو عیب دار بنا دیا تاکہ بادشاہ کے کارندے جب اس کشتی کو دیکھیں تو اس کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دیں۔ بعد کو یا تو حضرت خضرؑ نے یا خود کشتی کے مالکوں نے کشتی کو مرمت کر کے اس کو درست کر لیا۔

اس واقعہ سے نظام قدرت کا ایک پہلو معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں انسان کو اگرچہ آزادی دی گئی ہے۔ مگر خدا کے حکم سے خدا کے فرشتے برابر اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ مقاصد تخلیق فوت ہو رہے ہیں وہاں وہ مداخلت کر کے معاملات کو ازسرنو صحیح رخ پر لگا دیتے ہیں۔ تاہم یہ پورا کام اسباب کے پردہ میں انجام دیا جاتا ہے تاکہ امتحان کا ماحول باقی رہے۔ جو لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے وہ اس کو نظام فطرت کا نقص کہنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ اس قسم کے انتہائی واقعات کی اصل حیثیت اصلاحی مداخلت کی ہوتی ہے، وہ نظام فطرت میں کسی خرابی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ دنیا میں انسان کو آزادی دی گئی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کے اوپر خدا کی نگرانی بھی قائم ہے۔

ایک آیت

قرآن میں یہود کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ ——— اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں بہت سامان رکھو تو وہ فوراً اس کو ادا کر دے گا۔ اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تم اس کے پاس امانت میں ایک دینار رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہیں کرے گا، الایہ کہ تم اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ (آل عمران ۷۵)

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے اندر حق اور ناحق کی تمیز پوری طرح زندہ ہو۔ وہ سچ پر قائم ہونا چاہتے ہوں اور جھوٹ سے بھاگنے والے ہوں۔ وہ ہر آن اپنے آپ کو اللہ کی نگرانی میں سمجھتے ہوں۔ یہ با اصول لوگ ہیں۔ وہ اپنے احساس فرض کے تحت ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔ ان کا حق شناسی کا جذبہ اس کے بغیر مطمئن نہیں ہوتا کہ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کریں۔ وہ کسی حال میں حق سے تجاوز کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔

انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف اپنی خواہش اور اپنے مفاد کو جانتے ہوں۔ وہ چیزوں کو اس اعتبار سے نہ دیکھیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھیں کہ کیا چیز میرے موافق ہے اور کیا چیز میرے خلاف۔

ایسے لوگ کبھی حق کی ادائیگی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور اگر کبھی حق کو ادا بھی کرتے ہیں تو احساس فرض کے تحت نہیں بلکہ حالتِ مجبوری کے تحت۔

ایک انسان وہ ہے جس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے تو وہ اس کو غیر کی ملک سمجھے اور جب مالک تقاضا کرے تو فوراً اصل مالک کو وہ چیز لوٹا دے۔ یہ معیاری انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کا بڑا اجر ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے اندر امانت کا احساس پوری طرح زندہ نہ ہو۔ تاہم ابھی وہ سرکشی کی حد پر نہ پہنچا ہو۔ ایسا شخص بھی چیز کو اصل مالک کی طرف لوٹاتا ہے مگر بار بار کے تقاضے کے بعد۔ دوسرے انسان کی بدترین قسم ہے جس کو غاصب کہا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ چیز کو نہیں لوٹاتا بلکہ جھوٹے دعوے کرکے غیر کی چیز کو اپنی چیز بتاتا ہے۔ ایسا آدمی گمراہی کی آخری حد پر پہنچ چکا ہے۔ ایسے آدمی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

جنگ کا قانون

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین (البقرہ ۱۹۰)	اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں کہنا یہ تھا کہ جو لوگ تمہارے خلاف لڑائی چھیڑیں ان سے دفاع کے لیے لڑو۔ مگر دفاع کو حذف کر کے فرمایا کہ ان سے اللہ کے راستہ میں لڑو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کا دفاع بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتا بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ نے دفاع کرنے کی اجازت دی ہے۔ مومن کا ٹھہرنا بھی اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اس کا چلنا بھی اللہ کے لیے۔

اسی ربانی جذبہ کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ مومن کی جنگ صرف دفاع کی حد تک محدود رہتی ہے۔ جہاں دفاع کا مسئلہ ختم ہوا وہیں اس کی جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مومن جنگ کے دوران ظالم نہیں بنتا۔ وہ صرف جنگجو افراد پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ وہ عورتوں اور بوڑھوں اور بچوں کو نہیں مارتا۔ وہ غیر مقاتلین کو اپنے انتقام کا نشانہ نہیں بناتا۔

"اور زیادتی نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ تم خود کسی کے خلاف جارحیت کر کے جنگ کا آغاز نہ کرو۔ القرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اور کہا گیا ہے کہ زیادتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو تم سے جنگ نہ کرے تم بھی اس سے جنگ نہ کرو (وقیل "لا تعتدوا" ای لا تقاتلوا من لم یقاتل) الجامع لاحکام القرآن ۲/۳۵۰

اسلام کے مطابق، اصل مطلوب چیز امن ہے نہ کہ جنگ۔ اگر کوئی جنگ پر آمادہ ہو تو پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جنگ کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا جائے۔ جب جنگ سے بچنے کی کوشش آخری حد تک ناکام ہو جائے اور فریق ثانی جنگ کا آغاز کر بیٹھے تو اس کے بعد آخری چارہ کے طور پر دفاعی جنگ کی جائے گی۔ مگر جہاں تک جارحانہ جنگ کا تعلق ہے، اسلام کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ فرد انسانی کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ یہ ایک تعمیری کام ہے جو صرف پر امن حالات ہی میں ہو سکتا ہے نہ کہ جنگ اور تشدد کے حالات میں۔

ایک آیت

قرآن (المائدہ ۴۴) میں ہے کہ اور جو کوئی اس کے موافق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون)

ان الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بعض اعمال پر کفر کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر (مسلم کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے) البخاری، کتاب الایمان

اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو لے کر کچھ اسلام پسند حضرات ان مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ما انزل اللہ پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت وہ بہت سے مسلم حکمرانوں کو مرتد اور کافر بتاتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ بدترین گمراہی ہے اور اس نے عالم اسلام میں خارجیت جیسے ایک فتنہ کو دوبارہ شدید تر صورت میں زندہ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان مسلمان کو قتل کر رہے ہیں، بلکہ خود اسلام کی تصویر ایک ایسے مذہب کی ہو گئی ہے جو تشدد اور خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہو۔

اس قسم کی آیات و احادیث کی صحیح تفسیر وہ ہے جو حبر الامت اور امام التفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس سے آدمی خارج از اسلام قرار پاتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد کُفرٌ دونَ کفرٍ ہے۔ یعنی کفر سے کمتر درجہ کا ایک کفر (الترمذی، کتاب الایمان)

قرآن و حدیث میں جہاں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فقہی یا قانونی مفہوم میں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسلوب کلام ہے۔ وہ دراصل زجر میں مبالغہ ہے۔ یہ شدت کلام کی ایک مثال ہے۔ اور ناصحانہ کلام میں ہمیشہ اس قسم کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کبھی ایک قسم کے الفاظ میں اور کبھی دوسری قسم کے الفاظ میں۔ یہ قانونی زبان اور ناصحانہ زبان کا فرق ہے نہ کہ فقہی معنوں میں مسلم اور کافر کا فرق۔

نصیحت اور تنبیہ کبھی سادہ الفاظ میں کی جاتی ہے اور کبھی شدید الفاظ میں۔ مذکورہ مثالیں اسی نوعیت کی شدید انداز کی مثالیں ہیں۔

درود وسلام

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ـــــ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر صلاۃ (درود) بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجو (الاحزاب ۵۶) علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی صلاۃ (درود) رسولؐ پر رحمت بھیجنا ہے۔ فرشتوں کا درود استغفار کرنا ہے اور اہل ایمان کا درود دعا کرنا ہے۔

نبی پر درود وسلام کے بارے میں تفسیروں اور حدیث کی شرحوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس پر بہت سی مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً شیخ شمس الدین سخاوی کی کتاب القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع، وغیرہ۔

حدیث (النسائی، الترمذی) میں ہے کہ وہ شخص بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے (البخیل مَن ذُکِرتُ عندہ فلم یُصَلِّ علیّ) حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا آپ کے احسان عظیم کا شکر ادا کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین کارنامہ انجام دیا۔ آپ نے انسانی تاریخ کو نزاعی نبوت کے دور سے نکال کر تسلیم شدہ نبوت کے دور میں پہنچایا۔ دین توحید کو تحریف کے دور سے نکال کر محفوظ دین کے دور میں پہنچایا۔ انسانی تمدن کو توہمات کے دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچایا۔ خدا کے کلمہ کو مغلوبیت کے دور سے نکال کر غلبہ کے دور میں پہنچایا۔ شریعت الٰہی کو غیر کامل دور سے نکال کر کامل دور میں پہنچایا۔ دین حق کو غیر تاریخی دور سے نکال کر تاریخی دور میں پہنچایا، وغیرہ۔

یہ تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے مشکل مشن تھا۔ اس مشکل ترین مشن میں آپؐ کے ساتھ آپ کے اصحاب اور آپ کے اہل خاندان نے ہر وہ قربانی پیش کی جو اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے درکار تھی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ قیامت تک تمام لوگ رسولؐ پر اور اس مقدس جماعت پر درود وسلام بھیج کر اس کے احسانِ عظیم کا اعتراف کریں۔

جب کوئی شخص کسی کے اوپر احسان کرے تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس پر شکر کا اظہار کیا جائے۔ درود وسلام اسی قسم کے ایک عظیم ترین احسان کا دعا کی صورت میں اعتراف ہے۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ سیّدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

حبِّ شدید

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جائز حدود میں آدمی کسی بھی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ مگر حبّ شدید صرف ایک اللہ سے ہونا چاہیے۔ صرف اللہ کو یہ حق ہے کہ انسان اپنے جذبات محبت کو سب سے زیادہ اس سے وابستہ کرے، اس کی قلبی شیفتگی کا سب سے بڑا مرجع خداوند ذوالجلال ہو۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

ومِنَ النّاسِ مَن یّتخذُ مِن دُونِ اللّٰہ اندَاداً یُحِبّونَہُم کحُبِّ اللّٰہ والّذینَ آمنوا اشدُّ حبّاً لِلّٰہ

اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہیے۔ (البقرہ ۱۶۵)

غیر اللہ کے ساتھ حب شدید کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً پتھر کے بتوں کے ساتھ بڑھا ہوا قلبی لگاؤ۔ اپنے اکابر سے بہت زیادہ عقیدت، قوم کے ساتھ غیر معمولی محبت، وغیرہ۔ آدمی کو جس چیز سے حب شدید ہو اسی کی یاد میں وہ جینے لگتا ہے، اسی کا تذکرہ اس کے لیے سب سے زیادہ محبوب بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری چیزیں رسمی تعلق کے خانہ میں چلی جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ان کے اندر اللہ کے لیے حب شدید نہیں۔ ذاتی مفاد، سیاسی اقتدار، قومی عزت، تاریخی عظمت، اس قسم کی چیزیں ان کے لیے حب شدید کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ خدا ان کے حب شدید کا موضوع نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ قسم کی چیزوں پر ان کے درمیان بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر محبت خداوندی کی بنیاد پر کوئی تحریک ان کے درمیان نہیں اٹھی۔

موجودہ زمانہ میں جو علوم انسانی ظاہر ہوئے ان میں خدا کے وجود کو یکسر حذف کر دیا گیا مگر مسلم دنیا میں کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا جو اس پر تڑپے اور علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کر کے خدا کے وجود کو علمی حیثیت سے ثابت شدہ بنانے کے لیے محنت کرے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اقوام عالم کے اوپر خدا کے دین کی شہادت دی جائے، مگر ساری مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں جو اس کے لیے بے چین ہو اور عمل شہادت کو جاری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

جب زوال آتا ہے

قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (الحدید ۱۶)

امت پر جب وہ لمحہ آتا ہے کہ طول امد کے نتیجہ میں اس کے افراد کے اندر قساوت اور بے حسی پیدا ہو جائے، تو اس وقت ایسا نہیں ہوتا کہ دین کا نام و نشان بالکل مٹ گیا ہو۔ اس وقت جو خرابی پیش آتی ہے وہ یہ کہ دین کے ظواہر تو باقی رہیں مگر دین کی روح کا خاتمہ ہو جائے۔

جب یہ حالت آتی ہے تو لوگوں کے درمیان دین کی دھوم خوب دکھائی دیتی ہے، مگر دین کی اندرونی اسپرٹ کہیں موجود نہیں ہوتی۔ پھل کا چھلکا باقی رہتا ہے مگر اس کا مغز باقی نہیں رہتا۔ حدیث میں اس حالت کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ بل انتم کغثاء (بلکہ تم جھاگ کی مانند ہو گے) سیلاب کا جھاگ بظاہر بہت نمایاں ہوتا ہے، مگر اس کے اندر سیلاب والی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

جب کوئی گروہ اس نوبت کو پہنچتا ہے تو اس کے افراد میں ایمان بس تلفظ کلمہ کی سطح پر ہوتا ہے، مگر معرفت کی سطح پر وہ کلمہ کی حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ذکر کی تکرار تو ہوتی ہے مگر خدا کی سچی یاد ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ وہ قرآن کو تلاوت کی کتاب کی حیثیت سے تو جانتے ہیں مگر وہ اس قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں جو دلوں کو تڑپائے اور آنکھوں کو اشک بار کر دے۔ وہ انسانوں کی بڑائی میں گم ہوتے ہیں مگر خدا کی بڑائی میں جینا انھیں نصیب نہیں ہوتا۔

وہ اپنے نعروں کے ذریعہ فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں مگر وہ اس تقویٰ سے ناآشنا ہوتے ہیں جو ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دے۔ جذباتی تقریریں سن کر مجمع عام میں انھیں روتے دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اس گریہ کو نہیں جانتے جس کے بارہ میں حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ: رجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ (آدمی نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ پڑیں)

ایسے لوگ اسلامی قانون نافذ کرو کے ہنگامے برپا کرتے ہیں مگر ان کا سینہ خضوع اور تواضع کی کیفیت سے خالی ہوتا ہے۔ وہ دعوت کے نام پر سرگرمیاں دکھاتے ہیں مگر انسانوں سے محبت کرنا کیا ہے، اس کو وہ نہیں جانتے۔ وہ قوموں کے خلاف جہاد چھیڑتے ہیں مگر قوموں کے لئے شفقت سے ان کا اندرون بالکل خالی ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر گن کلچر کو فروغ دیتے ہیں، حالاں کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رحمت کلچر کو فروغ دیا جائے۔

ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی کے اوپر تنقید کرتے ہیں تو عیب جوئی اور الزام پر اتر آتے ہیں۔ ان پر کسی کا حق آتا ہو تو وہ حق کی ادائگی کے لئے حساس نہیں ہوتے۔ کسی سے ان کا اختلاف ہو جائے تو فوراً وہ اس کے معاملہ میں بے انصافی پر اتر آتے ہیں۔ وہ اپنے حزب کی حمایت کو جانتے ہیں۔ مگر وہ حق کی حمایت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسے کرتے نہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کو بولتے نہیں۔ ان کی غلطی کو خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے مگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بے ضرر دینداری ان کو بہت پسند ہوتی ہے۔ مگر جس دین سے ان کے مفاد پر زد پڑتی ہو اس دین سے انھیں دل چسپی نہیں ہوتی۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو اسلام کا چمپین سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے کام کا کریڈٹ لینے کے لئے بے تاب رہتے ہیں جس کو انھوں نے انجام نہیں دیا۔ اسلام کو داخلی طور پر اپنانے کی انھیں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ مگر خارجی دنیا میں اسلام کا نمائندہ بننا انھیں بہت مرغوب ہوتا ہے۔

القرطبی نے سورہ حدید کی مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ فضیل بن عباس ایک غلط کام کی طرف مائل ہو گئے۔ اس وقت کسی نے یہ آیت پڑھ دی: الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (الحدید ۱۶) وہ فوراً اس کام سے رک گئے اور کہا کہ بلی و اللہ قد آن (ہاں اے اللہ، اس کا وقت آگیا) جلد ۱۷، صفحہ ۲۵۱

یہی مومن کا مزاج ہے۔ مومن پر کبھی غفلت طاری ہوتی ہے اور وہ غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا احساس اس قدر زندہ ہوتا ہے کہ جب اس کو توجہ دلائی جاتی ہے تو وہ فوراً پلٹ آتا ہے۔ مومن غلطی سے توبہ کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ غلطی میں پڑا رہنے والا۔

عقل سے کام نہ لینا

ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (الانفال ۲۱-۲۲)

(اے ایمان والو) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے، جو داڑھی نہیں رکھتے، جو ملی تشخص کو اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو حق کو سننے کے لیے بہرے بنے ہوئے ہیں، جن کے سامنے حق کی بات آتی ہے مگر اس کو وہ اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس کو اس طرح لیتے ہیں جیسے کہ انھوں نے اس کو نہ سنا اور نہ سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اندھاپن یا بے عقلی ایک ایسا جرم ہے جو نماز اور داڑھی اور ملی تشخص کو چھوڑنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فہم و تدبر انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ اسی بنیاد پر اس کو دوسری مخلوقات پر نوعی امتیاز حاصل ہوا ہے۔ جو آدمی فہم و تدبر کھو دے اس نے گویا اپنی خصوصیت بشری کو کھو دیا۔ اور جو مخلوق اپنی نوعی خصوصیت کو کھو دے اس کے بعد عین فطری ہے کہ وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے۔

"لا یعقلون" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے سامنے سچائی لائی جائے مگر وہ اس کو اہمیت نہ دے سکے۔ وہ اس کو الٹے مفہوم میں لے کر اسے نظر انداز کر دے۔ وہ اس کو کمتر قرار دے کر اس کا مذاق اڑائے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ فوری تاثر کے تحت اس پر غیر متعلق رائے زنی کرنے لگے۔ اس کا ردعمل بے عقلی کا ردعمل ہو نہ کہ عقل کا ردعمل۔

ایسے لوگ اعتراف کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی روح صرف کثیف چیزوں کا ادراک کرتی ہے۔ لطیف چیزوں کو اپنی خوراک بنانے کی صلاحیت ان کے اندر باقی نہیں رہتی۔

عقل والے لوگ

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا
وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ، فبشر عباد۔
الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ
اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک
ھم اولوا الالباب۔
(الزمر ۱۷-۱۸)

اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے ان کے لیے خوش خبری ہے۔ تو تم میرے بندوں کو خوش خبری دے دو، جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ احسن القول کو لو اور اسوء القول کو چھوڑ دو۔ کسی قول کا احسن اور اسوء (اچھا اور برا پہلو) اس کے مفہوم میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے الفاظ میں ہوتا ہے۔ کوئی کلام، خواہ وہ کوئی مقدس کلام کیوں نہ ہو، وہ بہر حال انسانی زبان میں ہوتا ہے۔ انسانی زبان کی محدودیت کی بنا پر اس کے ظاہر الفاظ میں اچھا اور برا، دونوں پہلو نکالنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر اللہ کا ڈر آدمی کو سنجیدہ اور محتاط بنا دیتا ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرنے والے آدمی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام کو نہایت غور کے ساتھ سنتا ہے۔ اس کے بعد وہ کلام کو اس مفہوم میں لیتا ہے جو اس کا اچھا مفہوم ہے۔ وہ کلام کو اس کے بُرے مفہوم میں نہیں لیتا۔

جو لوگ کسی کلام کو بے پروائی کے ساتھ سنیں اور اس کے بعد اس کا ایک برا مفہوم نکال کر اس کو اِدھر اُدھر بیان کرنے لگیں وہ شیطان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بری خبر ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ کلام کو پورے دھیان کے ساتھ سنیں اور پھر اس کا اچھا مفہوم نکال کر اس کو لوگوں کے سامنے پیش کریں، وہ حق کی پیروی کرنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے یہاں اچھی خبر ہے اور ان کے لیے بڑا انعام ہے۔

کلام کو برے مفہوم میں لینے والا آدمی بے عقل آدمی ہے۔ اور جو آدمی کلام کو اچھے مفہوم میں لے وہی عقل والا ہے۔ آخرت میں اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے گا۔

تخلیقی جواب

للذین استجابوا لربھم الحسنی والذین لم یستجیبوا لہ لو ان لھم ما فی الارض جمیعا ومثلہ معہ لافتدوا بہ اولئک لھم سوء الحساب وماواھم جھنم وبئس المھاد (الرعد ۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار کو لبیک کہا ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کی پکار کو نہ مانا، اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے برابر بھی اور بھی تو وہ سب اپنی رہائی کے لیے دے ڈالیں۔ ان لوگوں کا حساب سخت ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں انسان کے انجام کا سارا دارومدار استجابت (Response) پر ہے۔ صحیح استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے انعام ہے اور بری استجابت کا ثبوت دینے والوں کے لیے سزا۔

جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو یہ انسانوں کے لیے سخت ترین امتحان ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں لوگوں کے مزعومات باطل قرار پاتے ہیں۔ جن کو انھوں نے بڑا بنا رکھا تھا وہ چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ مفادات کا پورا نظام منتشر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں بری استجابت یہ ہے کہ آدمی بپھر کر حق کا مخالف بن جائے۔ اور اچھی استجابت یہ ہے کہ وہ ثابت شدہ حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ پہلے انسان کے لیے دوزخ ہے اور دوسرے انسان کے لیے جنت۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کا بھی ہے۔ یہاں بھی سارا انحصار استجابت پر ہے۔ یہاں اس گروہ کو عزت اور ترقی حاصل ہوتی ہے جو تخلیقی استجابت (Creative response) کا ثبوت دے سکے۔ اس کے برعکس جو گروہ غیر تخلیقی ثابت ہو اس کے لیے صرف یہی مقدر ہے کہ اس کو دنیا کے کوڑے خانہ میں جگہ ملے۔ یہاں ایک صورت غیر تخلیقی جواب کی ہے۔ یعنی وہی کا وہی لوٹانا۔ کسی نے پتھر مارا تو اس کو پتھر مارنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کا جواب تخلیقی جواب ہو۔ یعنی آدمی ردعمل سے بچ کر خود اپنے اندرونی کارخانہ میں ایک جواب تخلیق کرے اور اس کو دوسرے کی طرف لوٹائے۔

مرغوباتِ دنیا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : لوگوں کے لیے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی، یہ سب دنیوی زندگی کے سامان ہیں، اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے (آل عمران ۱۴)

خواہشوں کی محبت (حب الشہوات) بہت عام لفظ ہے۔ اس میں دور قدیم کی مرغوب چیزوں سے لے کر موجودہ صنعتی دور کی مرغوب اشیا تک ہر چیز شامل ہے۔ ان دنیوی چیزوں کی چمک دمک آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ آیت کے مطابق، یہ ایک پیدائشی جذبہ ہے، کوئی بھی شخص اس جذبہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ایسی حالت میں ایک مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا بہترین جواب حضرت عمرؓ کی وہ دعا ہے جو صحیح البخاری میں بطور تعلیق روایت کی گئی ہے۔ اس کے مطابق، حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے قرآن کی مذکورہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے کہا : اللّٰھم انا لا نستطیعُ الا ان نفرح بما زینتہ لنا۔ اللّٰھمّ انی اسئلک ان انفقہ فی حقہ (فتح الباری ۱۱/۲۶۳) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں : لا نستطیعُ الا ان نحب ما زُینت لنا، فقنی شرہ وارزقنی ان انفقہ فی حقک (صفحہ ۲۶۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ، یہ ہمارے بس میں نہیں کہ ہم ان چیزوں پر خوش نہ ہوں جن کو تو نے ہمارے لیے مزین کر دیا ہے۔ اے اللہ، میں تجھ سے یہ توفیق مانگتا ہوں کہ ان چیزوں کو میں ان کے حق میں صرف کروں۔

اللہ تعالے کو یہ مطلوب نہیں ہے کہ مرغوبات دنیا کو دیکھ کر آدمی متاثر نہ ہو۔ اگر وہ متاثر نہ ہو تو پھر اس کا امتحان کس چیز میں ہوگا۔ آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر متاثر ہو مگر وہ اس میں لت پت نہ ہو جائے۔ وہ اپنے قلبی تاثر کو عملی روش بننے سے بچائے۔ وہ ظاہری مرعوبیت سے گزر کر اس کے اندرونی غیر مرغوب پہلو کو دیکھ لے۔ دنیا اسے اپنی طرف کھینچے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کھینچ کر خدا کی طرف لے جائے۔

دین میں آسانی

قرآن (البقرہ ۱۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) دوسری جگہ (الحج ۷۸) فرمایا کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وما جعل علیکم فی الدین من حرج)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان ھذا الدین یسر (البخاری، کتاب الایمان) یعنی یہ دین آسان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو: ان خیر دینکم ایسرہ (مسند احمد) آپ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ آسانی پیدا کرو، لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو (یسروا ولا تعسروا)

اسی لیے فقہ میں شریعت کے بارہ میں یہ اصولی مسئلہ وضع کیا گیا ہے کہ: المشقۃ تجلب التیسیر۔ یعنی مشقت آسانی لاتی ہے۔ حنفی عالم زین الدین ابن ابراہیم بن محمد مصری (م ۹۷۰ھ) جو ابن نجیم کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے اصول فقہ پر اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ایک بحث کا عنوان یہ قائم کیا ہے: القاعدۃ الرابعۃ، المشقۃ تجلب التیسیر (چوتھا قاعدہ اس بات پر کہ مشقت آسانی لاتی ہے)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین بذات خود کوئی سہولتوں اور آسانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ دین کے راستہ میں جب حالات کے تحت کوئی مشقت کی صورت پیدا ہو جائے تو وہاں لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈھکیلا جائے گا، بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی اصول کے تحت بیماری میں وضو کے بجائے تیمم ہے۔ سخت بارش میں مسجد کے بجائے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ سفر میں روزہ چھوڑ دینا ہے، وغیرہ۔

یہی اصول ملی زندگی کے لیے بھی ہے۔ جہاں اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں اعراض کی تعلیم ہے۔ جہاں اجتماعی مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو وہاں غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم ہے۔ جہاں سیاسی اصلاح کو نشانہ بنانے میں ہلاکت پیش آنے والی ہو وہاں انفرادی اصلاح پر اپنی کوششوں کو لگانا ہے۔ جہاں شور والے دین میں تباہی ہو وہاں خاموشی والا دین اختیار کر لینا ہے۔

دین میں آسانی کا یہ اصول صرف فرد کے لیے نہیں ہے، وہ جماعت اور قوم کے لیے بھی ہے۔ جس طرح انفرادی معاملات میں مشکل پیش آنے کی صورت میں فرد کے لیے شریعت کا حکم نرم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت کے لیے بھی سخت حالات میں شریعت اپنے تقاضے کو نرم کر دیتی ہے۔

دینی مقصد کے لیے اقدام کرنا بجائے خود ثواب کا ایک عمل ہے۔ مگر جہاں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں شریعت کا حکم بدل جائے گا۔ اب اقدام کے بجائے اعراض اہل اسلام کے لیے شریعت کا مطلوب عمل بن جائے گا۔

اسی طرح مثلاً شریعت کا ایک عمل ہے جس کو اجتماعی صورت میں کرنا مطلوب ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ مظاہرہ میں نقصان کا اندیشہ ہو تو وہاں حکم میں نرمی پیدا کر دی جائے گی۔ اب مظاہراتی انداز کے بجائے غیر مظاہراتی انداز اختیار کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔

اسی طرح ایک معاشرہ ہے جہاں سیاسی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ اگر سیاسی تبدیلی کو نشانہ بنا کر تحریک چلائی جائے تو ہلاکت کی صورت پیش آ جائے گی تو ایسے معاشرہ میں لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے بجائے خود حکم کو بدل دیا جائے گا۔ اب وہاں یہ مطلوب ہو جائے گا کہ سیاسی انقلاب کے محاذ سے ہٹ کر انفرادی اصلاح کے میدان میں پرامن کوششیں کی جائیں۔

اسی طرح ایک موقع جہاں اعلان و اظہار ایک شرعی مطلوب نظر آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ یقین ہے کہ اگر لاؤڈ اسپیکر کی پرشور تقریر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کا منفی رد عمل ہوگا اور اہل اسلام کے لیے شدید تر حالات پیدا ہو جائیں گے۔ تو ایسے حالات میں شور والا عمل ساقط ہو جائے گا، اور شریعت کا تقاضا ہو جائے گا کہ خاموش تدبیر کا انداز اختیار کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔

عسر سے بچنا اور یُسر کا طریقہ اختیار کرنا یہ ہے کہ بوقت عمل یہ دیکھا جائے کہ موجودہ حالات میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں ہے۔ اور پھر ممکن دائرہ میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جائے، نہ کہ ناممکن دائرہ میں سر ٹکرا کر مزید اپنے نقصان میں اضافہ کر لیا جائے۔

بے عملی کا سبب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں قرآن کی دعوت کا اعلان کیا تو وہاں کے بیشتر لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ وہی قدیم نفسیات تھی جو پچھلے پیغمبروں کے انکار کا باعث بنی تھی۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے (بنی اسرائیل ۹۴-۹۵)

پیغمبر لوگوں کے پاس ہدایت لے کر آیا۔ مگر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر کو ان کے لئے انسانی نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مگر وہ اس کو آسمانی پیکر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکے کہ پیغمبر اگر آسمانی پیکر کے روپ میں آئے تو وہ ان کے لئے نمونہ کیسے بنے گا۔ انسانی عمل کے لئے نمونہ وہی شخصیت بن سکتی ہے جس پر انسانی تجربات گزریں۔ جو انسانی طاقت اور انسانی ضعف کے ساتھ دنیا میں رہے۔ جو پیغمبر انسانی اوصاف سے ماورا ہو وہ کسی غیر انسانی مخلوق کے لئے نمونہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ انسان جیسی مخلوق کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا۔

موجودہ زمانہ کا کیس بھی عملی نتیجہ کے اعتبار سے یہی ہے۔ قدیم زمانہ کے منکر پیغمبروں سے اس لئے حیات انسانی کا نمونہ نہ لے سکے کہ وہ انھیں برتر مخلوق کے روپ میں دکھائی نہیں دیا۔ موجودہ مسلمان اس لئے پیغمبر سے نمونہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں کہ وہ پیغمبر کو ہیرو پیغمبر کے روپ میں دیکھتے ہیں نہ کہ اسوہ پیغمبر کے روپ میں۔ ہیرو فخر کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تقلید کے لئے۔ ہیرو کو دیکھ کر قصیدہ خوانی کا جذبہ ابھرتا ہے نہ کہ اس کی پیروی کرنے کا۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ انھوں نے پیغمبر کو اپنا قومی ہیرو بنا لیا۔ اس لئے وہ پیغمبر کے لئے بڑے بڑے الفاظ بول کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر پیغمبر جیسا عمل کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں ابھرتا۔

دلائل قرآن

قرآن میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے اس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں (وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ (المومنون ۱۱۷)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم نے کہا کہ موحد کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، مشرک کہتا ہے کہ خدا کئی ہیں۔ اس طرح ایک خدا کا وجود دونوں کے درمیان متفق علیہ ہوگیا۔ کیونکہ مشرک نے جب کہا کہ خدا کئی ہیں تو ایک خدا کو اس نے پہلے ہی مان لیا۔ اس طرح ایک خدا کا وجود تو اپنے آپ ثابت ہے۔ اب دلیل کی ذمہ داری موحد پر نہیں ہے بلکہ مشرک پر ہے۔ ایک کے بعد بقیہ خداؤں کے وجود پر وہ دلیل لائے۔

یہ سادہ استدلال کا ایک نمونہ ہے۔ ہر معاملہ میں استدلال کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ اور دوسرا علمی۔ کچھ لوگوں کے لئے سادہ دلیل کافی ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ زیادہ علمی انداز میں ان کے سامنے بات کو واضح کیا جائے۔ قرآن میں دونوں سطح کے دلائل موجود ہیں۔

اوپر کی مثال برہان کی سادہ تفسیر ہے۔ مگر اس برہان کی علمی اور سائنٹفک تفسیر بھی یہاں موجود ہے۔ راقم الحروف نے اس کی وضاحت مختلف کتابوں میں کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو تمام حاصل شدہ شہادتیں خالق کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ خالق کے تعدد کی طرف۔ مثلاً وسیع کائنات کے تمام اجزا کا ترکیبی مادہ صرف ایک ہے، اور وہ ناقابل مشاہدہ ایٹم ہے۔ پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہیں مگر سب کی سب متوافق طور پر کام کرتی ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان سب کا ناظم ایک ہی ہے۔ کائنات کا کوئی جزء اپنے عمل کے دوران جب کوئی مسئلہ پیدا کرتا ہے تو اس کا دوسرا جزء فوراً اس کی تلافی کے لئے آجاتا ہے۔ تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہیں۔ مگر دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ دونوں بالکل کاگ وھیل کی طرح مل کر کام کرتے ہیں۔ اگر دونوں کے الگ الگ خدا ہوں تو دونوں میں اس طرح کامل ہم آہنگی نہیں ہو سکتی وغیرہ

ایمان ایک معرفت

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔ الا من تاب و آمن وعمل صالحاً فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئاً۔ (مریم ۵۹ - ۶۰)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھودیا اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

قرآن کی اس آیت میں خلف یا اخلاف سے مراد کسی امت کی بعد کی نسلیں ہیں۔ یہ بعد کو پیدا ہونے لوگ، خود قانون قدرت کے تحت، پہلی نسل کے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مقصد کے بجائے خواہشات کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ ان کے یہاں عبادت کی ظاہری شکل باقی رہتی ہے مگر اس کی اندرونی روح نکل جاتی ہے۔ کسی امت میں بعد کو پیدا ہونے والے افراد کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو ازسر نو ایمان اور توبہ اور عمل صالح کی توفیق حاصل ہو۔

ایمان کیا ہے۔ ایمان ایک ذہنی انقلاب کا نام ہے جس کو حدیث میں عرفان یا معرفت کہا گیا ہے (من عرف اَن لا الٰہ اِلا اللہ دخل الجنۃ) یہ ذہنی انقلاب ایک ناقابل انتقال چیز ہے۔ وہ باپ سے بیٹے کو منتقل نہیں ہوتی۔ باپ اگر سائنس کا عالم ہو تو اس کا علم اس کی نسل کو منتقل نہیں ہوگا۔ اگلی نسل کو خود ذاتی محنت سے سائنس کا علم حاصل کرنا پڑے گا۔

اسی طرح اسلام کی معرفت ایک فرد کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اندر جو فکری انقلاب آتا ہے وہ اس کا ذاتی اکتساب ہوتا ہے۔ وہ وراثتی طور پر اپنے آپ اگلی نسل کو نہیں مل جاتا۔ اسلام کی معرفت حاصل کرنا ایک ایسا عمل ہے جو ہر نسل میں دوبارہ جاری ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی ذاتی محنت سے اس کو ازسر نو حاصل کرتا ہے۔ ایمان ایک دریافت ہے، اور دریافت مکمل طور پر ایک ذاتی اکتساب ہے، وہ کسی بھی درجہ میں وراثتی اثاثہ نہیں۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ ہر سو سال کے سرے پر ایسا شخص پیدا کرے گا جو لوگوں کے دین کی تجدید کرے گا۔ یعنی اپنی مصلحانہ کوشش سے ازسر نو انھیں ایمانی معرفت عطا کرے گا۔

خدا کا قانون

ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ وشاقوا الرسول من بعد ما تبین لھم الھدیٰ لن یضروا اللہ شیئاً وسیحبط اعمالھم (محمد ۳۲)

بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا اور رسول کی مخالفت کی جب کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے اعمال کو ڈھا دے گا۔

اس آیت میں اور اس نوعیت کی دوسری آیتوں میں اللہ کے ایک نہایت اہم قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ حق کا انکار کریں اور حق کے راستہ میں رکاوٹ ڈالیں اور حق کے داعیوں کے مخالف بن کر کھڑے ہوں، وہ حق کا اور حق کے علم برداروں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ ان کی تمام مخالفانہ کارروائیاں عین قانون خداوندی کے تحت ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گی۔

مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخالفین وہ ہوں جن پر ہدایت کی تبیین کی گئی ہو۔ جن کے اوپر امر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہو۔

اس شرط کا تعلق مخالفین سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خود حق کے داعیوں سے ہے۔ حق کے داعیوں کی طرف سے اگر یہ شرط پوری کر دی گئی ہو تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمنان حق کی کوئی بھی سازش یا کوئی بھی مخالفانہ کارروائی اہل حق کے اوپر کارگر نہ ہو سکے گی۔ وہ اپنی تمام تدبیروں کے باوجود یقینی طور پر اس میں ناکام رہیں گے کہ حق کے داعیوں کو کوئی واقعی نقصان پہنچا سکیں۔

جب کچھ لوگ خالص حق کی دعوت لے کر اٹھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ اس کو تکمیل تک پہنچائیں تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ فریق ثانی کے اندر جتنی سعید روحیں ہوتی ہیں، وہ سب اللہ کی توفیق سے حق کو قبول کر کے حق پرستوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ تبیین کے باوجود حق کے منکر بنے رہیں، وہ اپنی دانستہ سرکشی کی بنا پر اس کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ انھیں پکڑے اور ان کو مغلوب کر کے اہل حق کو ان کے اوپر غلبہ عطا کر دے۔

انتظامی حکمت

الرجال قوّامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعضٍ وبما انفقوا من اموالھم فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللہ (النساء ۳۴)

مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کئے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔

خاندان، وسیع تر انسانی نظام کا، ایک ابتدائی جزء (یونٹ) ہے۔ اس ابتدائی وحدت کو دو فرد، مرد اور عورت، مل کر چلاتے ہیں۔ زیادہ بڑے نظاموں کی طرح، گھر کا چھوٹا نظام بھی صحیح طور پر صرف اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ دونوں میں سے ایک حاکم ہو، اور دوسرا اس کے مقابلہ میں ماتحت حیثیت قبول کرے۔ دونوں یکساں درجہ میں صاحب حکم ہوں تو اس نظام کا چلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ مذکورہ آیت میں اسی حکمت کو بتایا گیا ہے۔

آیت میں فضل کا لفظ ہے۔ فضل کے معنی عربی زبان میں زائد کے ہیں (لسان العرب ۵۲۶/۱۱) اللہ تعالیٰ نے مذکورہ مصلحت کی بنا پر عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو ایک زائد خصوصیت پیدائشی طور پر عطا فرمائی ہے جو نظام فطرت میں کامیاب کارکردگی کے لئے انھیں درکار تھی۔

مرد کی خصوصیت زائدہ یہ ہے کہ وہ کمانے اور خرچ اٹھانے کی اضافی صلاحیت رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں عورت کی اضافی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر قنوت (اطاعت) کا مزاج نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ گویا عورت اور مرد کو گھر کا نظام چلانے کے لئے الگ الگ جو صفات درکار ہیں وہ پیشگی طور پر دونوں کے اندر پیدا کر دی گئی ہیں۔

عورت اور مرد دونوں کے لئے پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ اس پورے معاملہ کو آزمائش کی نظر سے دیکھیں۔ ہر ایک کی توجہ اس پر ہو کہ اس کو جس کار خاص کے لئے بنایا گیا ہے اس کارِ خاص کو اسے بحسن وخوبی انجام دینا ہے۔ اسی حسن کارکردگی پر آخرت میں ان کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ایمان میں نقصان

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون (الانعام ۸۲)

جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی نقصان نہیں ملایا انھیں کے لیے امن ہے اور وہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ظلم سے مراد نقصان ہے۔ لغت عرب میں ظلم کا یہ مفہوم آتا ہے (لسان العرب) اور خود قرآن میں اس کا استعمال موجود ہے۔ سورہ الکہف میں دو باغ کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ دونوں باغ خوب سرسبز و شاداب تھے۔ دونوں اپنا پھل لائے اور اس میں کچھ نہیں گھٹایا (الکہف ۳۳)

اس دنیا میں ہر فائدہ والی چیز کے ساتھ نقصان کا پہلو لگا ہوا ہے۔ مثلاً تجارت ایک مفید چیز ہے۔ لیکن ایک تاجر اگر ایسا کرے کہ وہ تجارت کرنے کے ساتھ بری عادتوں میں بھی اپنے کو پھنسا لے۔ وہ اپنی پوری بکری کو اپنا نفع سمجھ لے۔ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ داداگیری کرنے لگے۔ وہ اپنے اصحاب معاملہ سے وعدہ خلافی اور بددیانتی کا سلوک کرے۔ جو تاجر ایسا کرے وہ بہت جلد دیوالیہ ہو جائے گا، ایسا تاجر کبھی کامیاب تاجر نہیں بن سکتا۔

یہی معاملہ ایمان کا ہے۔ ایمان بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر ایمان کو اس کے نقصانات سے بچانا ہے۔ جو آدمی اپنے ایمان کو اس کے نقصانات سے نہ بچائے اس کا ایمان اس کو نفع پہنچانے والا نہیں۔

ایمان کا نقصان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق آئے مگر وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ اس سے گناہ سرزد ہو مگر وہ توبہ نہ کرے۔ وہ اپنی توحید میں شرک کی ملاوٹ کر دے۔ اس کو امانت سونپی جائے تو وہ اس میں خیانت کرنے لگے۔ ایک عمل خیر اس کی استطاعت میں ہو مگر وہ اس کو انجام نہ دے۔ خدا کے دین کو وہ اپنے لیے سامان تجارت بنالے۔ وہ ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرے جس کو اس نے انجام نہیں دیا۔ اس قسم کی تمام چیزیں ایمان میں نقص پیدا کرنے والی ہیں، اور جس ایمان میں نقص شامل ہو جائے وہ ایمان خدا کے یہاں قابلِ قبول نہیں۔

صدعن سبیل اللہ

قرآن میں جن مجرمانہ افعال کا ذکر ہے ان میں سے ایک نہایت سنگین جرم وہ ہے جس کے لئے صدعن سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اللہ کے راستہ سے روکنا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ بہت برا کام ہے (التوبہ ۹) اس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ (محمد ۳۲) ایسے لوگوں کی مغفرت نہیں ہوگی (محمد ۳۴) بلکہ انھیں عام گنہ گاروں سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا (النحل ۸۸) صدعن سبیل اللہ کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے:

ومن اظلم ممن افترىٰ على الله كذبا اولئك يعرضون على ربهم ويقول الاشهاد هٰؤلاء الذين كذبوا على ربهم۔ الا لعنة الله على الظٰلمين الذين يصدون عن سبيل الله ويبغونها عوجا وهم بالآخرة هم كافرون۔

ھود ۱۸- ۱۹

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہونگے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر، ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدعن سبیل اللہ یہ ہے کہ دعوت حق میں ٹیڑھے مطلب نکالے جائیں اور اس طرح داعی اور دعوت کی سچائی کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ہمیشہ وقت کے خواص کرتے ہیں۔ وہ داعی کی شخصیت اور داعی کے پیغام میں اپنی ذہانت سے ایسے الٹے پہلو نکالتے ہیں جن کا تجزیہ عوام نہ کر سکیں اور داعی اور اس کی دعوت کی طرف سے شبہ میں پڑ جائیں۔

جو لوگ ایسا کریں وہ گویا خدا کے اوپر جسارت کر رہے ہیں۔ وہ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں حاضر کئے جائیں گے۔ اس وقت وہی داعی جن کو انھوں نے دنیا میں حقیر کیا اور ان کے پیغام کو قابل نفرت انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، وہی ان کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہوں گے اور بتائیں گے کہ کس طرح انھوں نے اپنی جھوٹی باتوں سے خلق خدا کو حق سے پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

جدالِ احسن

گفتگو کے اسلامی آداب میں سے ایک وہ اصول ہے جس کو قرآن میں دفع احسن (المومنون ۹۶) یا جدال احسن (النحل ۱۲۵) کہا گیا ہے۔ یعنی مخالفانہ باتوں کے جواب میں ردعمل یا مناظرہ بازی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ احسن طریقہ سے اس کو ٹال لینے یا اس سے گزر جانے کی کوشش کی جائے۔ اس طریقہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ لوگوں کو مسخر کر لے۔ اس میں نہ صرف وقتی طور پر دفع شر کا فائدہ ہے، بلکہ قرآن کی شہادت کے مطابق، وہ شر کو خیر میں اور دشمن کو دوست میں تبدیل کرنے کا نہایت موثر ذریعہ ہے (حم السجدہ ۳۴)

جدالِ احسن کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کا ذکر ہے اور اس مکالمہ کا تذکرہ ہے جو آنجناب کا وقت کے بادشاہ نمرود سے پیش آیا۔ اس مکالمہ کا ایک حصہ یہ ہے:

کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارہ میں حجت کی۔ کیوں کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ شخص بولا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے، تم اس کو پچھم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا (البقرہ ۲۵۸)

نمرود نے حضرت ابراہیم کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں اس لئے خود تمہارے معیار کے مطابق میں رب ہوں۔ یہ واضح طور پر سرکشی کا ایک جملہ تھا۔ مگر حضرت ابراہیم اس پر بادشاہ سے نہیں الجھے۔ انھوں نے بات کو بدل کر یہ فرمایا کہ اچھا، اگر تم رب ہو تو یہاں صبح وشام، بالفاظ دیگر، گردش زمین کا جو آفاقی نظام قائم ہے اس کو تم بدل کر دکھا دو۔ اس انداز کلام نے بادشاہ کو لاجواب کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے عام طور پر اس اسلامی اصول کو بھلا دیا ہے۔ اس لئے وہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو مشکلات میں پھنسا ہوا محسوس کرتے

ہیں۔ اگر وہ اسلام کے اس انداز کلام کو اختیار کرلیں تو اچانک وہ اپنے آپ کو اقدامی پوزیشن میں محسوس کرنے لگیں گے، جب کہ آج وہ خلاف واقعہ طور پر اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں گھرا ہوا پا رہے ہیں۔

ہندستان میں کچھ انتہاپسند لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندستانی کا شخص ہندو ہے۔ یعنی فرانس کے شہری کو جس طرح فرنچ یا امریکہ کے شہری کو جس طرح امریکن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندستان کے ہر شہری کو ہندو کہا جانا چاہئے۔ اس پر مسلمان غصہ ہوتے ہیں۔ مسلم دانشور اس کا حوالہ دے کر تیز و تند مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع کرتے ہیں۔

مگر یہ جدال غیر احسن ہے۔ اس معاملہ میں جدال احسن کا طریقہ یہ ہے کہ نزاع کے بجائے اعراض کا انداز اختیار کیا جائے۔ منفی جواب کے بجائے مثبت جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ اگر سوچ کو قرآن کے بتائے ہوئے رخ پر چلایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا نہایت عمدہ اور موثر جواب یہاں موجود ہے۔

راقم الحروف کی گفتگو ایسے ہی ایک انتہاپسند ہندو سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس دیش میں سب کی پہچان صرف ایک ہے، اور وہ ہندو ہے۔ ہندو، کوئی دھارمک شبد نہیں، وہ جغرافی شبد ہے۔ جو لوگ بھی بھارتی جغرافیہ میں بستے ہیں وہ سب کے سب ہندو ہیں۔

میں نے نرمی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ شہریت کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کا فیصلہ کانسٹی ٹیوشن کرتا ہے۔ مثلاً اس دیش کا نام کیا ہو، اس کو کوئی پارٹی طے نہیں کرسکتی۔ کانسٹی ٹیوشن نے دیش کا جو نام مقرر کیا ہے وہی دیش کا نام ہوگا۔ اسی طرح دیش کے شہری کو کیا کہا جائے، یہ بھی ساری دنیا کے مانے ہوئے اصول کے مطابق، کانسٹی ٹیوشن کے دائرہ کی چیز ہے۔ اور کانسٹی ٹیوشن ہی اس کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہمارا موجودہ کانسٹی ٹیوشن اس دیش کے باشندوں کو "انڈین" کہتا ہے۔ آدمی کے پاسپورٹ میں، اس کے قانونی کاغذات میں ہر جگہ اس کی شہریت انڈین ہی بتائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی چاہے یا نہ چاہے، اس ملک کے ہر آدمی کو انڈین ہی کہا جائے گا اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب کہ خود کانسٹی ٹیوشن ہی تبدیل کر دیا جائے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر کچھ لوگ ہندستان کے کانسٹی ٹیوشن میں اس قسم کی تبدیلی لانا چاہیں تو

یقینی طور پر خود ہندوؤں کی اکثریت اس کی مخالفت کرے گی۔ کیوں کہ یہ بات انٹرنیشنل معیار کے مطابق نہیں۔ کانسٹی ٹیوشن ہمیشہ پڑھے لکھے لوگ بناتے ہیں، اور پڑھے لکھے لوگ اس طرح کے معاملات میں انٹرنیشنل معیار سے باہر جانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیوں کہ ایسا کرنا اپنے آپ کو عالمی اچھوت بنانے کے ہم معنی ہے۔

یہی معاملہ کامن سول کوڈ کا ہے۔ مسلم دانشور اکثر اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں بھی جدال احسن کے اصول پر ہمارے پاس نہایت مؤثر جواب موجود ہے۔

ایک پریس کانفرنس میں مجھ سے اس کی بابت پوچھا گیا۔ میں نے کہا کہ کامن سول کوڈ ہمارے ملک میں صرف اخباری اشو ہے، وہ کوئی حقیقی اشو نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا سماج مکمل طور پر ایک روایت پسند (tradition-based) سماج ہے۔ جب تک سماجی روایتیں نہ بدلیں، محض قانون بنا دینے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس قسم کی چیزیں کبھی قانون کے ذریعہ نافذ نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں اینٹی ڈاوری قانون موجود ہے۔ مگر اس قانون کے باوجود ڈاوری بڑھ رہی ہے اور قانون اس کو روکنے سے مکمل طور پر عاجز ہے۔

اگر کامن سول کوڈ کے نام پر کوئی سخت قانون بنا دیا جائے اور اس کے مطابق اس کو لازمی قرار دے دیا جائے کہ تمام فرقوں کے نکاح سرکاری شادی خانہ میں انجام دیے جائیں تو عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ تمام لوگ پھر بھی اپنے آبائی رواج کے مطابق ہی نکاح کریں گے۔ بالفرض اگر انھیں سرکاری شادی خانوں میں جانے پر مجبور کر دیا جائے تب بھی وہاں سے لوٹنے کے بعد ہندو فوراً پنڈت کو بلا کر پھیرا کروائے گا اور مسلمان قاضی کو بلا کر اس سے نکاح پڑھوائے گا۔ ایسی حالت میں قانون بنانے سے کیا فائدہ۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ ملک کے کانسٹی ٹیوشن میں ایک دفعہ کامن سول کوڈ کی موجود ہے۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ کانسٹی ٹیوشن میں اور بھی کئی غیر حقیقی دفعات تھیں (مثلاً پریوی پرس)، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ترمیم کرکے ان دفعات کو نکال دیا گیا یا بدل دیا گیا۔ اس طرح اب تک کانسٹی ٹیوشن میں ۷۰ سے زیادہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔

جدال احسن نزاع کو گھٹاتا ہے اور جدال غیر احسن صرف نزاع کو بڑھانے میں مددگار ہے۔

یہ بے خبر لوگ

ایک دیہاتی کسان ایک عالم کے پاس آیا۔ اس نے خوش ہو ہو کر عالم سے بیان کیا کہ میں نے سارا قرآن خود سے پڑھ لیا ہے۔ سب صحیح ہے، کہیں کوئی غلطی نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ کھٹک ہے۔ اسی کو آپ کے پاس پوچھنے آیا ہوں۔ عالم نے پوچھا کہ کہاں تم کو کھٹک ہے۔ کسان نے کہا کہ ایک سورہ کے ایک لفظ میں۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ لفظ وَالْفَتْحُ ہے یا وَالْقَبْحُ۔ عالم نے کہا کہ دکھاؤ تو انھوں نے تیسواں پارہ کھولا اور سورہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ کو پڑھنا شروع کیا:

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْقَبْحُ

عالم یہ سن کر ہنس پڑے اور کئی روز تک اس کو سوچ سوچ کر ہنستے رہے۔

یہ صرف ایک دیہاتی کا قصہ نہیں ہے۔ یہی بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کا قصہ بھی ہے۔ خود میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آتا ہے کہ ایک شخص خط کے ذریعہ یا زبانی یہ کہے گا کہ میں نے اسلام پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ بس ایک معاملہ میں میرا ذہن اٹکا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ عجیب وغریب قسم کے مسائل بیان کرے گا جن کا تعلق نہ دنیا کی فلاح سے ہوگا نہ دین کی فلاح سے۔

مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، تو خدا ہر جگہ اپنے علم کے ذریعہ حاضر ہے یا اپنی ذات کے ذریعہ۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ موجود ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں تو آپ روزہ اور حج بھی ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ میں نے پورے قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن آسمانِ دنیا پر بیک وقت نازل کر دیا گیا۔ پھر جزء جزء کر کے ۲۳ سال میں اترا تو قرآن آسمان دنیا پر کتاب کی صورت میں تھا یا آواز کی صورت میں۔ وغیرہ

قرآن کو پڑھنے والا وہ ہے جس کو قرآن پڑھ کر عاقبت کی فکر لگ جائے۔ جو ہمہ تن اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جو اپنی ذات کا احتساب کرنے لگے۔ جو لوگ مذکورہ قسم کے مسائل میں الجھے ہوئے ہوں انھوں نے ابھی قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔

قرآن حقائق کی کتاب ہے نہ کہ کسی قسم کے طلسمات کی کتاب۔

فسادفی الارض

فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض إلّا قلیلا ممّن انجینا منھم و اتبع الذین ظلموا ما أُترفوا فیہ وکانوا مجرمین وما کان ربّک لیھلک القریٰ بظلم واھلھا مصلحون (ہود ۱۷-۱۱۶)

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہل بقیہ ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے ہی لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچالیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی آسودگی میں پڑے رہے جو انہیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالاں کہ اس کے باشندے مصلح ہوں۔

یہاں پچھلی قوموں سے مراد پچھلی مسلم امتیں ہیں۔ پچھلی مسلم امتوں کا حال بتا کر موجودہ مسلم امت کو متنبہ کیا گیا کہ تم کو ان کی جیسی غلط روش سے بچنا ہے۔ ورنہ تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو ان کا انجام ہوا۔ خدا کی دنیا میں سب کے لئے ایک ہی قانون ہے، یہاں ایک کو دوسرے پر کوئی امتیازی خصوصیت حاصل نہیں۔

بقیہ کا لفظ عربی زبان میں بہتر بقیہ کے لئے آتا ہے۔ فلان ذو بقیۃ یا فلان بقیۃ قومہ کا مطلب ہے، وہ اپنی قوم کے اخیار میں سے ہے۔ لسان العرب کے مطابق، اولوا بقیہ کے معنی ہیں، اصحاب تمیز یا اصحاب فہم (جلد ۱۴، صفحہ ۸۱) ابن جریر الطبری اپنی تفسیر میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(اولوابقیۃ) یقول: ذو وبقیۃ من الفھم والعقل یعتبرون مواعظ اللہ ویتدبرون حججہ فیعرفون مالھم فی الایمان باللہ وعلیھم فی الکفر بہ (۱۲/۱۳۸)

اولو بقیہ یعنی فہم اور عقل رکھنے والے جو اللہ کے مواعظ سے نصیحت لیں اور اس کے دلائل پر غور کریں۔ تاکہ وہ جانیں کہ ایمان باللہ کی انہیں کیا جزا ملے گی اور اللہ کے انکار پر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

قرآن کے مترجمین نے اولو بقیہ کا جو ترجمہ کیا ہے، اس میں سے چند یہ ہے ــــــ شاہ ولی اللہ دہلوی: اہل خرد۔ شاہ عبد القادر دہلوی: صاحب شعور۔ مولانا اشرف علی تھانوی: سمجھدار۔ اس آیت میں اولو بقیہ کا صحیح ترجمہ یہی ہے۔

فسادفی الارض سے روکنا اور انسانی معاشرہ میں اصلاح کا ماحول پیدا کرنا انتہائی اہم ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت زیادہ مطلوب کام ہے۔ مگر یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ نہایت دانشمندی کا کام ہے۔ اس کو صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو فہم وبصیرت کے مالک ہوں۔ جن کی نظر صرف ظاہری حالات پر نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا وہ ادراک کر لیں۔ جو صرف حال کو جاننے والے نہ ہوں بلکہ اپنی فراست سے مستقبل تک کا اندازہ کر سکتے ہوں۔

زندگی ایک نہایت پیچیدہ نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو امتحان کی بنا پر آزادی عطا کی ہے۔ اس لئے زندگی میں اصلاح کا معاملہ بہت زیادہ نازک کام بن جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برائی کو آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس سے براہ راست تعرض نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بالواسطہ انداز میں اس کو سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی خارجی برائی کو دور کرنے کا آغاز نفسیات کی اصلاح سے کرنا پڑتا ہے۔ کبھی برائی کرنے والوں سے ٹکراؤ کرنے کے بجائے مصلح خود اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیتا ہے۔ کبھی ایک کھلی ہوئی برائی کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے الجھنے میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شدید تر برائی پیدا ہو جائے گی۔ کبھی ایک فساد کو ختم کرنے کے لئے خاموش تدبیر کرنی پڑتی ہے کیوں کہ حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اگر احتجاج اور مظاہرہ کا انداز اختیار کیا گیا تو ایک مقامی برائی عمومی برائی بن کر سارے معاشرہ کو تباہ کر دے گی۔ کبھی ایک ناقابل برداشت صورتحال کو برداشت کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر دور رس منصوبہ بندی ممکن نہیں ہوتی۔

زندگی اهون البليتين اور اخف الضررين میں انتخاب کا نام ہے۔ نادان آدمی اکثر مفروضہ معیار کے پیچھے دوڑتا ہے جب کہ امکانات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ معیار سے کم پر راضی ہو جائے۔ نادان آدمی ایک چھلانگ لگا کر تمام روایات کو توڑ ڈالتا ہے جب کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ روایات کو توڑنے کے بعد اصلاح کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ اس طرح کی سیکڑوں باتیں ہیں جن کو جاننا اور اپنی اصلاحی اسکیم میں ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ صرف دانشمند آدمی ہی ان کو جانتا ہے، اس لئے دانشمند آدمی ہی فساد کا خاتمہ کر کے اصلاح کا دور لا سکتا ہے۔

تکرار کی حکمت

قرآن میں ہے کہ اے مومنو، اللہ کا ذکر کثیر کرو (الاحزاب ۴۱) حدیث میں ان لوگوں کی فضیلت آئی ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں (مشکاۃ المصابیح ۲/۶۹۸) بہت سے الفاظ یا کلمات کے بارہ میں عدد کی صراحت کے ساتھ اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قال سبحان الله وبحمده في يوم مائة مرة حطت خطاياه وان كانت مثل زبد البحر (متفق عليه)

جو شخص دن میں سو بار کہے کہ سبحان اللہ وبحمدہ تو اس کی سب خطائیں مٹ جائیں گی خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

الفاظ یا کلمات کی اس تکرار میں اصل اہمیت تکرار کی نہیں بلکہ نتیجۂ تکرار کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سات یا دس یا سو کی گنتی میں کوئی پر اسرار خاصیت چھپی ہوئی ہے۔ اور اگر اس مقرر عدد کے ساتھ اس کو دہرا دیجئے تو محض عدد پورا ہونے کی بنا پر وہ عظیم ثواب کا باعث بن جائے گا۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ کسی خاص کلمہ کو بار بار کہنے سے اس کے موافق کیفیت ابھرے گی۔ یہ کیفیت آدمی کے اندر روحانیت اور ربانیت پیدا کرے گی۔ پھر اس حالت میں وہ جو دعا یا عبادت کرے گا وہ اتنی خالص ہوگی کہ فرشتے اس کو لینے کے لئے دوڑیں گے۔ ایسا عمل اپنی کیفی خصوصیات کی بنا پر سیدھے خدا تک پہنچ جائے گا اور مقبول بارگاہ ہوگا۔

جب آدمی دیر تک قرآن کی تلاوت کرے۔ وہ کثرت سے حمد و تسبیح کے کلمات کو اپنی زبان سے دہرائے۔ وہ فرض نمازوں کے علاوہ مزید سنت و نوافل میں مشغول ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے گرد ایک روحانی ماحول بنتا ہے۔ اس کا ذہن دینی رخ پر یکسو ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ربانی کیفیات ابھر آتی ہیں۔ یہی کیفیت یا روحانیت دین کا اصل مطلوب ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ جو زندگی گزرے وہی سچے مومن کی زندگی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ابدی جنتوں میں داخل کیا جائے۔

یہ فائدہ تکرار کے کیفی نتیجہ کا ہے نہ کہ مجرد تکرار الفاظ کا۔

زکوٰۃ وصدقات

جب ایک آدمی زکوٰۃ اور صدقہ کے تحت کسی کو کچھ دیتا ہے تو بظاہر وہ کسی غیر کو دے رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا رخ خود دینے والے کی طرف ہوتا ہے۔ دوسرے کو دے کر آدمی خود اپنی پاکی کا اہتمام کرتا ہے۔

ایسا کر کے آدمی اپنے دل سے مال کی محبت کو نکالتا ہے۔ وہ اس یقین کو تازہ کرتا ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ خدا کی امانت ہے نہ کہ اس کی ذاتی ملکیت۔ اس طرح وہ اپنے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ اس کے اوپر دوسروں کا حق ہے۔

زکوٰۃ یا صدقہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی انسان کو دے مگر وہ اس کا بدلہ خدا سے پانے کی امید رکھے۔ وہ یک طرفہ طور پر دوسرے انسانوں کا خیر خواہ اور مددگار بنے۔ وہ اپنی زندگی میں ایسے لوگوں تک کا حق سمجھے جن سے اسے کچھ پانے کی امید نہ ہو۔

زکوٰۃ دینا گویا کہ دوسروں کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ آدمی کے لیے اس یاددہانی کا ذریعہ ہے کہ تم کو اس دنیا میں مانگنے والا نہیں بننا ہے بلکہ دینے والا بننا ہے۔ تم کو اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ تمہارا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہے، وہ کبھی نیچے نہ ہونے پائے۔

زکوٰۃ گویا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ زکوٰۃ دینے والا اس لیے دیتا ہے تاکہ وہ خدا سے پائے۔ وہ اس لیے دوسروں کے کام آتا ہے تاکہ خدا اس کے کام بنا دے۔ وہ اس لیے یک طرفہ طور پر مدد پہنچاتا ہے تاکہ خدا بھی اس کو یک طرفہ طور پر اپنی رحمت اور بخشش کے سایہ میں لے لے۔

اس دنیا میں بظاہر ایک آدمی بے مال ہے اور دوسرا آدمی صاحب مال۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی محتاج ہے۔ کیوں کہ کسی کا مال بھی ذاتی مال نہیں۔ ہر آدمی کا مال خدا کا عطیہ ہے۔ مال والا ایک آدمی جب کسی بے مال والے کو کچھ دیتا ہے تو اس عمل کے ذریعہ وہ خود اپنی ہی حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے۔ وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ میں بھی وہی ہوں جو تم ہو۔ اگر خدا چاہے تو کل کے دن وہ میرا حال تمہارے جیسا کر دے اور تمہارا حال میرے جیسا۔

ایک تنبیہ

قرآن میں ہے کہ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرہ ۸۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں جب ایک ہی نوعیت کا دو حکم ہو تو خدا پرستوں کو چاہیے کہ وہ دونوں کو لیں۔ ایک ہی نوعیت کے دو حکم میں سے ایک کو لینا اور دوسرے کو نہ لینا تعمیل نہیں ہے بلکہ نافرمانی ہے۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے۔ اب اگر کچھ لوگ کعبہ کا تو خوب احترام کریں مگر جب مومن سے معاملہ پڑے تو اس کے ساتھ وہ بے احترامی سے پیش آئیں، ایسے لوگ خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے ایک ہی نوعیت کے دو حکموں میں سے ایک حکم کو لیا اور اسی نوعیت کے دوسرے حکم کا انکار کر دیا۔

اسی طرح جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ مسجد پر غاصبانہ قبضہ کی برائی کو جانیں مگر ایک مسلمان کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کی برائی کو نہ جانیں۔ وہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی کو جرم سمجھیں مگر ایک مسلمان کے ساتھ گستاخی کو اپنے لیے جائز ٹھہرالیں۔ ایک غیر مسلم کوئی قومی بے عزتی کی بات کہہ دے تو اس پر بھڑک اٹھیں، لیکن ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بے عزت کرے تو اس کا غلط ہونا انھیں معلوم نہ ہو۔ ایسے تمام لوگ بلاشبہ مجرم ہیں۔ اللہ کے یہاں کوئی بھی چیز انھیں پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

دائرۂ اختیار کے اعتبار سے احکام میں ضرور فرق رکھا گیا ہے۔ یعنی جو حکم دائرہ اختیار سے تعلق رکھتا ہے اس پر پکڑ ہے اور جو حکم دائرۂ اختیار سے باہر ہے اس کی پکڑ نہیں۔ مگر خود دائرۂ اختیار کے دو حکم میں سے ایک کو لینا اور دوسرے کو نہ لینا صرف گمراہی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ہدایت کا راستہ نہیں۔ اس قسم کی دوعملی دنیا میں بھی رسوائی کا سبب ہے اور آخرت میں بھی رسوائی کا سبب۔

ایک آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : اور اسی طرح ہم نے شریر آدمیوں کو اور شریر جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو پرفریب باتیں سکھاتے ہیں دھوکا دینے کے لئے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے۔ پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ جھوٹ باندھتے رہیں۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں، اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کرلیں (الانعام ۱۱۲-۱۱۳)

یہ معاملہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ حق کی دعوت اپنی بے آمیز صورت میں سامنے آجائے۔ جو لوگ خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت ان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب چوں کہ دعوت حق کو دلیل سے رد کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اس لئے وہ عیب جوئی اور کردار کشی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ مخالفین اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بے بنیاد شوشے نکالتے ہیں۔ وہ داعی کے خلاف الزام بازی کی مہم چلاتے ہیں۔ وہ اس کی ذات کو بدنام کرنے کے لئے پرفریب باتیں پھیلاتے ہیں۔ یہ صورت حال ہر آدمی کو برہنہ کر دیتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ کے خوف نے آخری حد تک سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ان کی بڑھی ہوئی سنجیدگی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ دلیل اور عیب جوئی میں فرق کرسکیں۔ مگر جن لوگوں کے دل خدا کی پکڑ کے احساس سے خالی ہو جاتے ہیں، وہ سنجیدہ غور وفکر سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے لوگ آسانی سے اس پرفریب پروپگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت حال امتحان کی غرض سے ہے۔ اس لئے وہ لازماً باقی رہے گی۔ اس دنیا میں ہر حال آدمی کو اس آزمائش میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچی دلیل اور بے بنیاد بات میں فرق کرے۔ وہ بے بنیاد بات کو رد کرکے سچی دلیل کو قبول کرلے۔ الفاظ کی آزمائش سب سے بڑی آزمائش ہے کامیاب وہ ہے جو اس نازک آزمائش میں کامیاب رہے۔

سوال وجواب

سوال: قرآن میں ہے کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ یہ آیت مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر اس میں ہلاکت اور خطرہ والے راستہ سے بچ کر چلنے کی تعلیم ہے۔ مگر اسی کا نام تو ہلاکت ہے کہ آدمی خطرات کے راستہ پر چلنے سے ڈرے اور رسک نہ لینا چاہے۔ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا، تمام بڑی بڑی ترقیاں انھیں کو ملتی ہیں جو اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

جس قوم کا نظریہ یہ ہو کہ "خطرات سے بچ کر چلو" وہ قوم کبھی اونچی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی۔

جواب: زندگی کی حقیقت جو آپ نے بیان کی، وہ صد فی صد صحیح ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ رسک کے بغیر کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ مگر آیت کا جو مطلب آپ نے لیا، اصل مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ پوری آیت یہ ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا بقرہ ۱۹۵

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (کہ خرچ کرنے سے رک جاؤ) اور کام کو اچھی طرح کرو

دین کی ضرورتوں میں اپنے جان و مال کو خرچ کرنا، اپنی ذاتی ضرورتوں میں کمی کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اہر کہا گیا کہ خواہ اپنی ذات کے لئے کمی کرنا پڑے، مگر دین کے لئے جد وجہد کو ہر حال جاری رکھو۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی برباد ہو جائے تو فرد بھی اپنے آپ کو بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ اسی لئے ان راہوں میں خرچ کرتے رہو جن سے اجتماعی زندگی طاقت ور ہوتی ہے

اس آیت کے سلسلہ میں حضرت حذیفہ اور حضرت ابو ایوب انصاری کی روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے جو اس کے مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب ہے اپنے مال اور اپنے گھر میں بیٹھ رہنا اور جہاد کو چھوڑ دینا (التھلکۃ الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجھاد

بخاری نے حضرت حذیفہ سے اس آیت کی مختصر شان نزول نقل کی ہے۔ اس کی صراحت حضرت ابو ایوب انصاری کی حدیث میں ہے جس کو ابو داؤد، ترمذی، حاکم، نسائی، ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے شرط شیخین پر اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری فرماتے ہیں کہ ہم انصار لوگ جب کچھ لڑائیاں آنحضرت کی ہمراہی میں لڑ چکے تو ایک دن ہم میں سے کچھ لوگوں نے آپس میں خفیہ مشورہ کیا کہ اب تو رسول اللہ کے ساتھ بہت اہل اسلام جمع ہو گئے ہیں، اگر ہم چند لوگ لڑائیوں میں آپ کے ساتھ نہ جائیں تو اپنی اقتصادیات کو درست کر سکتے ہیں اور مدتوں باہر رہنے سے جو گھر بار اجڑ گئے ہیں ان کی تلافی کی جا سکتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ اور آگاہ کیا کہ اس طرح کے اخراجات سے ہاتھ روکنا ہلاکت کا باعث ہے، اپنے آپ کو اس ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور دین کے لئے جان و مال خرچ کرنے میں لگے رہو۔

یہ آیت خطرات اور اندیشوں کے علی الرغم حق کی راہ میں اقدام کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ نہ یہ کہ آدمی خطرات اور اندیشوں سے گھبرا کر ایسا اقدام کرنے سے رک جائے۔

مستقبل کا مسئلہ

قل لا املك لنفسی نفعا وضرا الا ما شاء الله ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء (الاعراف ۱۸۸)

اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنے لیے نہ نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

اس آیت کا ایک ابتدائی مفہوم ہے جو اس کے سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت میں ایک کلی اصول بھی بتا دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں فائدہ اور نقصان کا تعلق تمام تر مستقبل بینی سے ہے۔ جو آدمی حال میں مستقبل کو دیکھے، جو آج میں کل کو پالے وہی آدمی یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ اس کے برعکس جو شخص مستقبل بینی کے اس امتحان میں پورا نہ اترے وہ یہاں کوئی بڑی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

غور کیجئے تو یہ کلیہ تمام امور کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تجارت کا معاملہ ہو یا سیاست کا، علمی ترقی کا میدان ہو یا کسی اور میدان میں آگے بڑھنے کا، ہر جگہ مستقبل کی رعایت کرنے والا فائدہ اٹھاتا ہے، اور جو شخص مستقبل کی رعایت نہ کر سکے وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ موجودہ دنیا میں تمام نقصانات آدمی کی اسی کوتاہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کوئی آدمی مستقبل (یا غیب) کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی بار بار نقصان اٹھاتا ہے۔ آدمی کو یہ تجربہ اس لیے کرایا جاتا ہے کہ آدمی آخرت کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔ آدمی جب ایک نقصان سے دوچار ہو تو وہ مستقبل کی اہمیت کو سمجھے۔ وہ سوچے کہ زندگی کی کامیابی کا راز "مستقبل" کی رعایت میں چھپا ہوا ہے، اس دنیا میں بھی اور بعد کو آنے والی دنیا میں بھی۔

اللہ تعالٰی نے دنیا کا یہ نظام اس لیے بنایا ہے تاکہ آخرت کے بارہ میں آدمی کے احساس کو جگایا جائے۔ تاکہ آدمی مستقبل کی رعایت کے بارہ میں نہایت حساس ہو جائے۔ یہ عقیدہ آدمی کو حقیقت پسندانہ زندگی گزارنے کا سبق دیتا ہے۔

ذہنی بُعد

وإذا قرأت القرآن جعلنا بينك وبين الذين لا يؤمنون بالآخرة حجابا مستورا۔ وجعلنا على قلوبهم أكنة أن يفقهوه وفي آذانهم وقرا وإذا ذكرت ربك في القرآن وحده ولوا على أدبارهم نفورا

(الاسراء ۴۵-۴۶)

اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت کو نہیں مانتے۔ اور ہم ان کے دلوں پر پردہ رکھ دیتے ہیں کہ وہ اس کو نہ سمجھیں۔ اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

اس آیت میں حجاب مستور سے مراد دراصل وہی چیز ہے جس کو ذہنی بُعد (intellectual gap) کہا جاتا ہے۔ یعنی متکلم اور سامع کے درمیان سوچنے کے انداز میں فرق ہونا۔ جب بھی دونوں کے درمیان اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں یہی ہوگا کہ ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

مذکورہ آیت میں دو ذہنی فرق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک آخرت اور دوسرے توحید۔ جن لوگوں کی سوچ آخرت والی سوچ نہ ہو۔ جو دنیا کے مسائل کو اہمیت دیتے ہوں۔ جو دنیا کے عزت و وقار کی اصطلاحوں میں سوچتے ہوں۔ جن کا ذہن صبح و شام دنیا کے مفاد میں گھومتا ہو۔ جو صرف دنیوی خبروں کو جانتے ہوں اور آخرت کی خبروں سے بے خبر ہوں۔ ایسے لوگ دنیوی اہمیت کی باتوں کو فوراً سمجھ لیں گے۔ لیکن جب ان سے وہ باتیں کہی جائیں جو آخرت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہوں تو وہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

اسی طرح جو لوگ شخصیتوں میں اٹکے ہوئے ہوں۔ جو انسانی اکابر کی عظمتوں میں گم ہوں اور جنھیں خدائے ذوالجلال کی عظمتوں سے واقفیت نہ ہو، ان کے سامنے جب ایسی بات لائی جائے جو خدا کی عظمت کے اعتراف پر مبنی ہو، جو خدا کی بڑائی میں جینے کی دعوت دیتی ہو، تو اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر ایسی بات انھیں اٹ پٹا پن محسوس ہوگا۔ وہ اس کی اہمیت کا ادراک کرنے میں عاجز ثابت ہوں گے۔

قلب سلیم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں آدمی کو جو چیز نفع دے گی، وہ صرف قلب سلیم (الشعراء ۸۹) ہے۔ وہی لوگ جنت میں داخل کیے جائیں گے جو قلب سلیم لے کر وہاں پہنچیں۔ "قلب سلیم" کی تشریح مختلف الفاظ میں کی گئی ہے مگر سب کا مدعا ایک ہے۔ یہاں ہم تفسیر ابن کثیر کا متعلقہ حصہ نقل کرتے ہیں :

(الا من اتی اللہ بقلب سلیم) أی سالم من الدنس والشرك۔ قال ابن سیرین القلب السلیم ان یعلم ان اللہ حق وان الساعة آتیة لا ریب فیها وان اللہ یبعث من فی القبور۔ وقال ابن عباس (الا من اتی اللہ بقلب سلیم) القلب السلیم ان یشهد ان لا الٰہ الا اللہ۔ وقال مجاهد والحسن وغیرهما (بقلب سلیم) یعنی من الشرك۔ وقال سعید بن المسیب القلب السلیم هو القلب الصحیح وهو قلب المومن لأن قلب الکافر والمنافق مریض۔ قال ابو عثمان النیسابوری هو القلب السالم من البدعة المطمئن الی السنة (۳۲۹/۳)

مگر وہ جو قلب سلیم لے کر آیا، یعنی گندگی اور شرک سے پاک دل۔ ابن سیرین نے کہا کہ قلب کا سلیم ہونا یہ ہے کہ وہ جانے کہ اللہ حق ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اور اللہ ضرور ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ ابن عباس نے کہا کہ قلب سلیم یہ ہے کہ وہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ مجاہد حسن اور دوسروں نے کہا کہ قلب سلیم کا مطلب شرک سے پاک دل ہے۔ سعید بن مسیب نے کہا کہ قلب سلیم سے مراد قلب صحیح ہے اور وہ مومن کا دل ہے، کیونکہ کافر اور منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ ابو عثمان نیساپوری نے کہا کہ اس سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے پاک اور سنت پر مطمئن ہو۔

جنت میں داخلہ کا معیار ظاہری اعمال کی مقدار نہیں ہے بلکہ آدمی کی اندرونی کیفیت ہے۔ قیامت میں اصل چیز جو دیکھی جائے گی وہ یہ کہ آدمی کس قسم کی شخصیت لے کر وہاں پہنچا ہے۔ جو لوگ ربانی شخصیت لے کر وہاں پہنچیں گے، وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے اندر معرفت کی روشنی لیے ہوئے ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے خالی ہوں۔ جو منفی رجحانات سے پاک ہوں۔ جنھوں نے دنیا میں فطرتِ خداوندی کی سطح پر جینے کا ثبوت دیا ہو۔

ایک آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— اور مومن کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے (النساء ۹۲) پھر قاتل کا حکم بتانے کے بعد کہا گیا کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے، اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے (النساء ۹۲)

ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں :

یقول تعالیٰ لیس لمؤمن ان یقتل اخاہ المؤمن بوجہ من الوجوہ کما ثبت فی الصحیحین عن ابن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : لا یحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلاث۔ النفس بالنفس والثیب الزانی والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ۔ ثم اذا وقع شیئ من ھذہ الثلاث فلیس لاحد من آحاد الرعیۃ ان یقتلہ وانما ذلک الی الامام او نائبہ (۵۳۴)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مومن کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے بھائی مومن کو قتل کرے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک مسلم جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون جائز نہیں۔ اِلّا تین میں سے ایک کا۔ کسی کی جان مارنا۔ شادی شدہ زانی اور وہ شخص جو دین کو چھوڑ کر جماعت سے الگ ہو جائے (حدیث) پھر جب ان تین میں سے کوئی واقعہ ہو تب بھی عام لوگوں میں سے کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ وہ مجرم کو قتل کر دے۔ اس حکم کا نفاذ صرف امام یا اس کے نائب پر ہے۔

واضح ہو کہ یہاں "امام" سے مراد امام خمینی جیسا کوئی مذہبی پیشوا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد حاکم سلطنت ہے۔ یہ حاکم سلطنت یا اس کے مقرر کردہ با اختیار شخص کا حق ہے۔ نہ کہ کسی مفتی یا امام یا کسی خود ساختہ مجاہد کا حق۔

قرآن میں تفکر

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ——— بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (آل عمران ۹۱-۱۹۰)

تمام بہترین باتیں آدمی کو غور وفکر کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایک عرب شاعر نے نہایت صحیح کہا کہ جب آدمی کے اندر فکر اور سوچ کی کیفیت ہوتی ہے تو ہر چیز سے اس کو نصیحت حاصل ہوتی ہے:

إذا المرء كانت له فكرة ففي كل شيء له عبرة

اس آیت کے سلسلہ میں مختلف حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ ان آیتوں کو پڑھیں ان کو چاہیے کہ وہ اس پر غور کریں (فليتفكروا فيها) آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی خرابی ہے جس نے ان آیتوں کو پڑھا مگر اس پر غور نہیں کیا (ويل لمن قرأ هٰذه الآيات ثم لم يتفكر فيها) ۴۴۱

امام الاوزاعی سے پوچھا گیا کہ ان آیات میں تفکر سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ آدمی ان کو پڑھے اور وہ ان کو سمجھے (قيل للاوزاعي ما غاية التفكر فيهن. قال: يقرؤهن وهو يعقلهن) ۱/۴۴۱

عامر بن عبد قیس کہتے ہیں کہ میں نے ایک سے زیادہ اصحاب رسول کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایمان کی روشنی غور وفکر ہے (ان ضياء الايمان التفكر) حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرنا سب سے اعلیٰ عبادت ہے (الفكرة في نعم الله افضل العبادة) بشر بن الحارث الحافی نے کہا کہ اگر لوگ اللہ کی عظمت میں غور کریں تو وہ کبھی گناہ نہ کریں (لو تفكر الناس في عظمة الله تعالى لما عصوه)

معرفتِ قرآن

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ نے ایک روز حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ امت کیسے اختلاف میں پڑ جائے گی، حالاں کہ اس کی کتاب ایک ہے، اس کا نبی ایک ہے، اس کا قبلہ ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین، قرآن ہمارے اوپر اتارا گیا۔ ہم نے اس کو پڑھا اور یہ جانا کہ وہ کس چیز کے بارہ میں اترا ہے۔ مگر ہمارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن کو پڑھیں گے لیکن یہ نہ جانیں گے کہ وہ کس چیز کے بارہ میں اترا ہے۔ پس ہر گروہ کی قرآن کے بارہ میں ایک رائے ہو جائے گی۔ اور جب ہر گروہ کی الگ رائے ہو جائے گی تو وہ اختلاف کریں گے۔ اور جب اختلاف کریں گے تو آپس میں قتال کریں گے۔ (حیاۃ الصحابہ، الجزء الثالث، صفحہ ۲۱۸)

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہندستان کی نویں لوک سبھا کا الکشن ہوا۔ اس موقع پر الکشنی مہم کے تحت جو کچھ کیا گیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہر طرف اس مضمون کے پوسٹر لگائے گئے کہ "ہاتھ سے ہاتھ ملائیے"۔ اس وقت پورے ماحول میں جو فضا بنی ہوئی تھی، اس میں ہر شخص نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس کو ووٹ دو، جس کا چناؤ نشان ہاتھ ہے۔

لیکن یہی پوسٹر ایک ہزار برس بعد کچھ لوگوں کو اچانک مل جائے تو اس کا سمجھنا ان کے لیے انتہائی دشوار ہوگا۔ کوئی شخص کہے گا کہ اس کا مطلب مصافحہ کرنا ہے۔ کوئی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دست بدست جنگ کرو۔ کوئی اس کا مطلب یہ بتائے گا کہ سفر میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہو۔ تاکہ کوئی بچھڑنے نہ پائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے نزولِ قرآن کے پس منظر کو جاننا انتہائی ضروری ہے۔ یہ پس منظر سیرتِ رسول کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو اور اللہ کی رضا کا طالب ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے ذہن کو خالی کر کے قرآن، حدیث، سیرت اور صحابہ کے حالات کو پڑھے اور اسی کے ساتھ ہدایت کی دعا بھی کرتا رہے۔ انشاء اللہ وہ سچائی کے راستہ کو پالے گا۔

حامل کتاب

قرآن میں بنی اسرائیل (یہود) کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا، پھر وہ اس کے حامل نہ بن سکے، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (الجمعہ ۵) اس آیت کے مطابق، کسی گروہ کے لیے حامل کتاب ہونے کے دو درجے ہیں، ایک یہ کہ وہ "انسان" کے طور پر اس کا حامل بنے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ "حیوان" کے طور پر اس کا حامل بنا ہوا ہو۔

ایک حقیقی انسان جب کتابِ خداوندی کا حامل ہو تو اس کا پورا وجود اس کتاب کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا ہر جزء اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے حرکت میں آجاتا ہے۔ ایک طرف اس کا جسمانی ہاتھ اس کتاب کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، دوسری طرف اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی سوچ اسی کے رخ پر چلتی ہے۔ اس کے تمام ذہنی نقشے اسی کی تعلیمات کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔ اس کا شعور پوری طرح اس کے فکری سانچہ میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی محبتوں کا مرجع وہی ہوتا ہے جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے، اس کے خوف اور اندیشوں کی بنیاد اسی کتاب کی تعلیمات ہوتی ہیں۔ وہ وہی چاہتا ہے جو اس کتاب کے مطابق چاہنا چاہیے اور ان چیزوں کو چاہنے سے رک جاتا ہے جن کی بابت اس کتاب میں منع کر دیا گیا ہے۔

دوسرا درجہ حیوان کی سطح پر حامل کتاب بننے کا ہے۔ ایسے لوگوں کا "جسم" تو کتاب الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے مگر ان کی "روح" "کتاب الٰہی کی حامل نہیں ہوتی۔ ظاہری طور پر وہ اپنے ہاتھ میں خدا کی کتاب کو تھامے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کا دل اور دماغ اس روشنی اور حرارت سے خالی ہوتا ہے جو اس کتاب کو اپنانے کے نتیجہ میں کسی کے اندر پائی جانی چاہیے۔

وحی الٰہی کا حامل صرف وہ ہے جو روح کی سطح پر وحی کا حامل ہو۔ جو لوگ جسم کی سطح پر اس کے حامل ہوں ان کی مثال اس حیوان کی سی ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو مگر اس کا باطن اس کی نورانیت سے خالی ہو۔

کتابِ خداوندی کے حامل صرف وہ لوگ ہیں جو انسان کی حیثیت سے اس کتاب کے حامل بنیں۔

ہدایت وضلالت

قرآن کتاب ہدایت (البقرہ ۱۸۵) ہے۔ بظاہر یہ ہونا چاہیے کہ آدمی کو قرآن سے صرف رہنمائی ملے۔ مگر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اس قرآن کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گم راہ کرتا ہے اور وہ بہت سے لوگوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے (یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا) البقرہ ۲۶

یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو قرآن سے ہدایت ملتی ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو قرآن کو پڑھنے کے باوجود گم راہ ہو جاتے ہیں، اس کا جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ اگرچہ حق وصداقت کی کتاب ہے۔ مگر اس سے ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو متقی ہو (البقرہ ۲) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ فاسق ہوں، ان کو قرآن سے ضلالت اور گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا (البقرہ ۲۶)

اب دیکھیے کہ متقی ہونا کیا ہے اور فاسق ہونا کیا ہے۔ متقی کا لفظ تقوی (وقی یقی) سے بنا ہے۔ عربی میں اس کے اصل معنی بچنے کے ہیں۔ یعنی معاملات میں محتاط ہونا (to be cautious of) قرآن میں ہے کہ : فمن اتقی واصلح (الاعراف ۳۵) یعنی جس شخص نے احتیاط کا انداز اختیار کیا اور بچ بچ کر زندگی گزاری، وہ آخرت میں خوشیوں کی زندگی حاصل کرے گا۔

فاسق کا لفظ فسق سے نکلا ہے۔ عربی میں فسق کے معنی ہیں نکلنا، درست طریقہ سے ہٹ جانا (to go astray) قرآن میں ابلیس کے لیے آیا ہے : ففسق عن امر ربہ (الکہف ۵۰) یعنی ابلیس نے خدا کے حکم کو سیدھی طرح نہیں اپنایا، وہ خدا کے حکم سے ہٹ گیا۔

تقوی اور فسق، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں سنجیدگی (sincerity) اور غیر سنجیدگی (insincerity) کہا جاتا ہے۔ قرآن سے سچی رہنمائی صرف اس شخص کو ملتی ہے جس کے اندر سنجیدگی کا مزاج ہو۔ جو آدمی اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر سنجیدہ ہو، اس کو قرآن سے کبھی رہنمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن سے ہدایت پانے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھے۔ جو شخص خالی الذہن نہ ہو وہ قرآن میں اپنے آپ کو پائے گا نہ کہ قرآن کو۔

طیباتِ دنیا، طیباتِ آخرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— ہر شخص کے لیے اس کے عمل کے اعتبار سے آخرت میں درجے ہوں گے۔ اور تاکہ اللہ سب کو ان کے اعمال پورے کر دے اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اور جس دن انکار کرنے والے لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی طیبات (اچھی چیزیں) دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم دنیا میں نافرمان بنے رہے (الاحقاف ۲۰-۱۹)

اس آیت میں طیبات سے مراد مطلق طیبات نہیں ہیں بلکہ ترجیحی طیبات ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص دنیا کی اچھی چیزوں کو برتے گا وہ آخرت کی اچھی چیزوں سے محروم رہے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف آخرت کی طیبات ہوں اور دوسری طرف دنیا کی طیبات، اس وقت جو شخص آخرت کی طیبات کو نظر انداز کر دے، اور اس کو چھوڑ کر دنیا کی طیبات کی طرف دوڑ پڑے، وہ جب آخرت میں پہونچے گا تو وہاں اس کے لیے آخرت کی طیبات میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

مزید یہ کہ یہاں اصلاً ماکولات ومشروبات یا دنیوی عیش مراد نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق اس آیت سے صرف ضمنی ہے۔ اس آیت کا تعلق براہ راست طور پر ان چیزوں سے ہے جو آدمی کو کبر (گھمنڈ) اور فسق (نافرمانی) تک پہونچاتی ہیں۔

اس آیت کا خطاب اصلاً ان لیڈروں سے ہے جنھوں نے اپنی لیڈری کی خاطر حق کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے تقاضوں کے مقابلہ میں عوامی خواہشات کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ ان کی عوامی مقبولیت میں کمی نہ آنے پائے۔ جو اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے حق کے آگے نہیں جھکتے۔ جو اپنی قوم کے سرکشوں کی مذمت نہیں کرتے، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے اندر اپنا مقام کھو دیں گے۔ جو یہ سوچ کر بولتے ہیں کہ اپنے ہم قوموں کے درمیان اپنی مقبولیت کو باقی رکھیں اور ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو انھیں آخرت میں مقبولیت کا درجہ دینے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا آخرت کی اچھی چیزوں میں کوئی حصہ نہ ہوگا، کیوں کہ وہ اپنی اچھی چیزیں اسی دنیا میں لے چکے۔

جنّت کی قیمت

دنیا میں آدمی سطحیت کی قیمت پاتا ہے، آخرت میں آدمی معنویت کی قیمت پائے گا ——— یہی ایک لفظ میں دنیا اور آخرت کے معاملہ کا خلاصہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور ان چیزوں کی طرف بالکل نہ دیکھو جن کو ہم نے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے (ولا تمدن عينيك الى ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى) طٰہٰ ۱۳۱

ایک شخص جس کو دنیا کی رونقیں ملی ہوئی ہوں، بظاہر وہ لوگوں کو قابلِ رشک دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ قابلِ رحم ہے۔ کیوں کہ اس کے گرد رونقوں کی فراہمی یہ بتاتی ہے کہ وہ خدا کی آزمائش میں ناکام ہوگیا۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہر آن دو چیزوں کے درمیان ہے۔ اس کے ایک طرف معنوی حقیقتیں ہیں۔ اور دوسری طرف ظاہری رونقوں والی چیزیں۔ جو آدمی معنوی حقیقتوں پر دھیان دے، وہ ظاہری رونقوں کی رعایت نہیں کر پاتا، اس لیے وہ ان کو حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ظاہری رونقوں والی چیزوں میں دل چسپی لے، وہ ان کی خوب رعایت کرتا ہے۔ اس لیے وہ ان کو پانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر یہ پانا ایک محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے "زہرۂ دنیا" کو پایا، مگر وہ "رزق رب" کی زیادہ قیمتی چیز کو نہ پاسکا۔

جنّت کو پانا آسان ہے۔ مگر جنّت کسی آدمی کو ایک مہنگی قیمت پر ملتی ہے۔ اور وہ ہے ——— ظواہر کے کھونے کو برداشت کرنا، اور معانی کو پاکر اس پر راضی رہنا۔ ظواہر میں محنت کا فائدہ نقد ملتا ہے، اور معانی میں محنت کا فائدہ ادھار رہتا ہے۔ ظواہر میں محنت کرنے والوں کو دولت، بھیڑ، عہدہ، عزت، ہر چیز فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس معانی میں محنت کرنے والے کو جو کچھ ملے گا آخرت میں ملے گا۔

ظواہر سے محرومی پر راضی ہونا گویا ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ یہی جنّت کی قیمت ہے۔ جو لوگ اس ناقابل برداشت کو برداشت نہ کریں وہ جنّت میں داخلہ کی خوشی بھی نہیں پائیں گے۔

اس کا سبب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : او یلبسکم شیعاً فیذیق بعضکم بأس بعض (یا تم کو گروہوں میں بانٹ دے اور پھر ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے)

اس آیت میں جس صورت حال کا ذکر ہے اس کی نسبت بظاہر خدا کی طرف کی گئی ہے۔ مگر دراصل اس کی نسبت انسان کی طرف ہے۔ یعنی بدلے ہوئے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مختلف گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑوگے۔ مذکورہ اسلوب صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا سے بے تعلق ہو جاؤگے تو تمہارا حال یہ ہو جائے گا کہ تم آپس میں لڑنے لگوگے۔

ساری تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ انسان لڑتا رہا ہے۔ ایک شخص اپنی طاقت کا مزہ دوسرے شخص کو چکھاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہر ایک یکساں حالت میں نہیں رہتا۔ کوئی کمزور ہوتا ہے اور کوئی طاقت ور۔ اب جو طاقت ور ہوتا ہے اس کے اندر اپنی طاقت کا گھمنڈ آجاتا ہے۔ اس کو اگر کسی سے شکایت پیدا ہو جائے تو فوراً وہ اپنی طاقت اس کے اوپر آزمانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کو اپنی برتری قائم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس صورت حال سے بچانے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ اس کو یقین ہو کہ میرے اوپر ایک اور ہستی ہے جو مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر میں نے اپنی طاقت کا غلط استعمال کیا تو وہ مجھ کو ضرور اس کی سزا دے گا۔

مسلمانوں میں جب اللہ کا خوف ہو تو ہر آدمی تواضع کی نفسیات میں جی رہا ہوتا ہے۔ تواضع کی نفسیات اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ دوسرے سے لڑے، وہ دوسرے کو اپنی طاقت کا مزہ چکھائے۔

اس کے برعکس جب مسلمانوں میں اللہ کا خوف باقی نہ رہے تو وہ سرکشی کی نفسیات میں جینے لگتے لگتے ہیں۔ سرکشی کی نفسیات ہر آدمی کو بے لگام بنا دیتی ہے۔ جس شخص کے پاس بھی کوئی طاقت ہو وہ اپنی اس طاقت کو دوسروں کے اوپر استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔

خدا کے خوف سے امن کا سماج بنتا ہے، اور خدا سے بے خوفی سے بے امنی کا سماج۔

دنیا کا جوڑا

والارض فرشناها فنعم الماهدون۔ ومن کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔ ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین
(الذاریات ۴۸-۵۰)

اور ہم نے زمین کو بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں اس کی طرف سے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اس دنیا کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کی تکمیل کرتی ہے ـــــ ایٹم میں منفی اور مثبت ذرہ، نباتات اور حیوانات میں نر اور مادہ، انسان میں عورت اور مرد۔ وغیرہ۔ حتی کہ فلکیاتی مشاہدہ کے مطابق ستارے بھی جوڑے جوڑے کی صورت میں ہیں۔

دنیا کا یہ نظام آدمی کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس کائنات میں جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو زمین کا جوڑا کہاں ہے۔ ہماری زمین خلا کے اندر ایک تنہا قسم کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ یہ آباد اور شاداب کرہ اکیلا نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اس کا بھی ایک جوڑا موجود ہو۔

قرآن اسی عقلی تقاضے کی تصدیق ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے دنیا کو بھی، دوسری تمام چیزوں کی طرح، جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ چنانچہ یہاں ایک ارض الدنیا ہے، اور دوسری ارض الجنۃ (الزمر ۷۴) موجودہ عالم (ارض الدنیا) میں انسان کا قیام برائے آزمائش ہے، دوسرے عالم (ارض الجنۃ) میں انسان کا قیام برائے انعام ہوگا۔ موجودہ دنیا اپنے اخروی جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو عالم پیدا کیے۔ ایک کامل اور دوسرا غیر کامل۔ ایک باقی اور دوسرا فانی۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ ایک لامحدود اور دوسرا محدود۔ ایک عالم کو اس نے فرشتوں کے انتظام میں رکھا اور دوسرے کو انسانوں کے انتظام میں دیدیا۔

یہاں آدمی کا قیام برائے امتحان ہے، اگلی دنیا میں اس کا قیام بطور انعام ہوگا۔ جو لوگ موجودہ عالم امتحان میں اپنے کو اہل ثابت کریں گے وہ اگلی کامل اور معیاری دنیا میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ اس عالم امتحان میں ناکام رہیں گے وہ ہمیشہ کے لیے کائناتی کوڑا خانہ میں پھینک دیئے جائیں گے۔

سب وشتم

قرآن میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو۔ ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالی دیں گے (ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم) الانعام ۱۰۹

ایک طرف اس قرآنی حکم کو سامنے رکھیے۔ دوسری طرف یہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب اسلام کی دعوت پیش کی تو وہاں کے سرداروں نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہمارے آبار کو گالی دیتے ہیں اور ہمارے معبودوں کو گالی دیتے ہیں (۔۔۔۔ شتم اٰباءنا وسب اٰلھتنا) سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۳۱۰

کیا قرآن کے اس حکم کے باوجود، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے اکابر کو اور ان کے بتوں کو گالی دیتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ حدیث اور سیرت کے پورے ذخیرہ میں ایسا کوئی کلام آپ کی زبان سے منقول نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آپ گالی نہیں دیتے تھے۔ البتہ آپ کی بات کو وہ گالی بتاتے تھے تاکہ آپ کو سب وشتم اور دشنام طرازی کا ذمہ دار ٹھہرا کر آپ کو مطعون کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وہ ابطالِ باطل تھا نہ کہ سب وشتم۔ آپ ان کے جاہلانہ مذہب یا ان کے اکابر کے خلاف دشنام طرازی نہیں کرتے تھے، بلکہ واضح دلائل سے ان کی تردید کرتے تھے۔ آپ اثباتِ حق اور ابطالِ باطل والا کام انجام دیتے تھے۔ قریش چونکہ آپ کی دلیلوں کے مقابلہ میں کوئی دلیل اپنے پاس نہیں پاتے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کے بارہ میں کہہ دیا کہ آپ سب وشتم کرتے ہیں۔

جب آدمی کے غلط نظریہ کو طاقتور دلائل سے رد کر دیا جائے، اس کے باوجود وہ اپنے غلط نظریہ کو چھوڑنا نہ چاہے تو وہ داعی اور مصلح کے اوپر سب وشتم کا الزام لگا دیتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے جو دلیل دی ہے وہ کوئی دلیل نہیں، وہ تو صرف دشنام طرازی ہے اور میں دشنام طرازی کی بنا پر کیسے اپنا موقف بدل دوں ـــــ جو لوگ مدلل تنقید کو کیچڑ اچھالنا کہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کس کے ساتھ بریکٹ کر رہے ہیں۔

دو قسم کے انسان

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ، فبشر عباد۔ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ، اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب۔

(الزمر ۱۷-۱۸)

اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، ان کے لیے خوش خبری ہے۔ تو میرے بندوں کو خوشخبری دیدو، جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر چیز پر شبہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ موجودہ دنیا میں جب کلام کیا جاتا ہے تو انسانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ کسی بات کا غلط مفہوم نکالا جا سکے۔

جو سمجھ والے لوگ ہیں اور جن کو اللہ کے خوف نے سنجیدہ بنا رکھا ہے، وہ جب کسی بات کو سنتے ہیں تو ہمیشہ اس کو اس کے صحیح مفہوم میں لیتے ہیں۔ وہ الفاظ کو نہیں پکڑتے بلکہ کلام کے معانی کو دیکھتے ہیں۔ ان کی یہ صفت ان کو کلام کے صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں، جو ربانی حکمت سے محروم ہو گئے ہوں۔ وہ جب کسی کلام کو سنتے ہیں تو وہ اس کی خود ساختہ تاویل کرتے ہیں۔ وہ سیدھی بات کو الٹے معنی پہناتے ہیں۔ وہ کسی بات کو اس کے اصل مفہوم کے اعتبار سے نہیں لیتے بلکہ محض ظاہری الفاظ کے اعتبار سے لے کر اس پر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

یہ شیطان کی پیروی ہے کہ آدمی کسی کلام کو اس کے اصل مفہوم کے اعتبار سے نہ لے۔ جو اللہ کے سچے بندے ہیں وہ ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کلام سے متکلم کا اصل منشا کیا ہے۔ وہ کلام کو اس کے احسن مفہوم کے اعتبار سے لیتے ہیں نہ کہ غیر احسن مفہوم کے اعتبار سے۔

غلط توجیہہ

وقال الذین کفروا لولا نزّل علیه القرآن جملة واحدة ۔ کذٰلک ، لنثبّت به فؤادک ورتّلناه ترتیلا (الفرقان ۳۲)

اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن کیوں نہیں اتارا گیا ۔ ایسا اس لئے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے ۔

قرآن بیک وقت کتابی مجموعہ کی صورت میں نہیں اتارا گیا ۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال کے دوران اتارا گیا ۔ اس واقعہ کو لے کر مکہ کے منکرین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب نہیں ۔ خدا کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں پوری کتاب بھیج دے ۔ محمد ایک امّی انسان ہیں ، ان کے لیے البتہ بیک وقت پوری کتاب پیش کرنا مشکل ہے ۔ چنانچہ وہ عرب کے کچھ لوگوں کی مدد سے اس کا تھوڑا تھوڑا حصّہ تیار کرتے ہیں اور جتنا حصّہ تیار ہوتا ہے اتنا لوگوں کو سنا دیتے ہیں (الفرقان ۴)

یہ تاخیر نزول کی غلط توجیہہ تھی ۔ فرمایا کہ پورا قرآن بیک وقت سامنے نہ لانے کا سبب تیاری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ترتیل یا تدریج کا مسئلہ ہے (قال الرازی: الترتیل فی الکلام ان یأتی بعضه علیٰ اثر بعض)

نزول میں تاخیر بجائے خود ایک واقعہ تھی ۔ مگر اس کی یہ توجیہہ بے بنیاد تھی کہ اس کا سبب تیاری کا مسئلہ ہے ۔ مگر یہ بے بنیاد توجیہہ اتنی پر فریب ثابت ہوئی کہ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو گیے ۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی تردید کرنی پڑی ۔ قرآن میں یہ بتایا گیا کہ تدریج کی مصلحت کی بنا پر نزول میں یہ تاخیر کی جاتی ہے نہ کہ تیاری کی مشکل کی بنا پر ۔

یہ دنیا آزمائش گاہ ہے ۔ یہاں حقائق پر التباس واشتباہ کا پردہ ہے ۔ اس لیے یہاں ایک فتنہ پرور شخص کے لیے ہمیشہ یہ موقع رہے گا کہ وہ ایک صحیح بات کی گمراہ کن توجیہہ کر سکے ۔ وہ ایک سیدھی بات کو ٹیڑھی بات بنا کر پیش کرے ۔

یہ موقع قیامت تک کھلا رہے گا ۔ قیامت سے پہلے یہ موقع کسی سے چھینا جانے والا نہیں ۔

ہر چیز امتحان

کل نفس ذائقۃ الموت ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون۔ (الانبیاء ۳۵)

ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم تم کو بری حالت سے اور اچھی حالت سے آزماتے ہیں پرکھنے کے لیے۔ اور تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قرآن کی یہ آیت انسانی زندگی کے بارہ میں خدا کے منصوبہ کو بتاتی ہے۔ اس دنیا میں کسی کو راحت ملتی ہے اور کسی کو مصیبت۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پسندیدہ صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی ناپسندیدہ صورت حال سے۔ مگر ان سب کا مقصد صرف ایک ہے، اور وہ آزمائش ہے۔ خدا کسی کو ایک طرح کے حالات میں رکھ کر آزماتا ہے اور کسی کو دوسری طرح کے حالات میں رکھ کر۔ یہاں اصل چیز حالات نہیں ہیں، یہاں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کو جو حالات ملے ان میں اس نے کس قسم کا رد عمل پیش کیا۔

اس دنیا میں کسی کو عزت اور کامیابی دی جاتی ہے تو وہ اس کے لیے انعام نہیں ہوتا وہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ خدا یہ دیکھے کہ آدمی عزت اور کامیابی پا کر گھمنڈ میں مبتلا ہوا یا اس نے شکر اور تواضع کا رویہ اختیار کیا۔ اسی طرح جب کسی شخص کو بظاہر پستی اور ناکامی میں ڈالا جاتا ہے تو یہ اس کے لیے سزا نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے ہوتی ہے کہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ پستی اور ناکامی میں مبتلا ہو کر اس نے صبر کا رویہ اختیار کیا یا بے صبری اور شکایت کا۔ اسی رد عمل پر آخرت میں آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو جب اپنے حق میں بعض غیر معمولی نعمتوں کا تجربہ ہوا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری (ءأشکر ام اکفر، النمل ۴۰)

ایک طالب علم کو امتحان میں ۱۰ پرچے کے بجائے ۵ پرچہ دیا جائے تو وہ خوش ہوگا کہ مجھ کو حل کرنے کے لیے کم پرچہ ملا۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جس آدمی کو کم ساز و سامان ملے یا کم عہدہ دیا جائے تو اس کو شکر کرنا چاہیے کہ اس کے رب نے اس کے ساتھ آسان آزمائش کا معاملہ کیا۔ نہ یہ کہ وہ اس کمی کی بنا پر شکایت اور حسد اور مایوسی جیسے جذبات میں مبتلا ہو جائے۔

دونوں ڈوب گیے

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو، ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو تم اس کو غور سے سنو۔ تم لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ وہ سب کے سب اس کے لیے جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور۔ انھوں نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے۔ بے شک اللہ طاقت ور ہے، غالب ہے (الحج ۷۳ - ۷۴)

اس معاملہ کی ایک دلچسپ مثال انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۰) میں نظر سے گزری۔ حیدر آباد میں بدھا کی مورتی (اسٹیچو) لگانے کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ اس پورے منصوبہ کی لاگت ۵۸ کروڑ ۵۸ لاکھ روپیہ تھی۔ صرف مورتی کی لاگت ۸۰ لاکھ روپیہ تھی۔ یہ مورتی نہایت اہتمام سے بنوائی گئی۔ اس کا انشورنس ۳ کروڑ ۷ لاکھ روپیہ تھا اور تیاری کے دوران مہاراشٹر کے چیف منسٹر ڈاکٹر چنا ریڈی روزانہ اس کے معائنہ کے لیے جاتے تھے۔ اس مورتی کا وزن تقریباً ۳۰۰ ٹن تھا، اور وہ ۵۷ فٹ اونچی تھی۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۰ کو بدھا کی یہ مورتی حسین ساگر جھیل کے کنارے ایک مخصوص کشتی پر رکھی گئی۔ اس کو جھیل میں آدھے کیلو میٹر کا سفر طے کرکے مقررہ مقام پر پہونچنا تھا جہاں اس کو نصب کرنے کے لیے ایک مخصوص پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر پر ۲ کروڑ ۳۲ لاکھ روپیہ کی لاگت آئی تھی۔ مگر کشتی جب جھیل کے درمیان پہونچی تو وہ اندر پانی آجانے کی بنا پر (یا اور کسی وجہ سے) ڈوب گئی۔ مورتی سمیت آٹھ آدمی بھی سات میٹر نیچے پانی کی تہہ میں چلے گیے۔

انسان ایک اللہ کے سوا دوسری چیزوں کا بت بناتا ہے، وہ ان کو مقدس سمجھتا ہے اور ان کو پوجتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بت (اور اسی طرح صاحبانِ مزار) اپنے اندر کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، وہ دوسرے کی حفاظت کیا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اسی کی پرستش کرے اور اسی سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کرے۔ اللہ کے سوا جو چیزیں ہیں وہ خود محتاج ہیں، وہ دوسروں کی کیا مدد کر سکتی ہیں۔

دین کے نام پر دنیا

اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اندر جو دینی خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کا قرآن میں تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ ان میں سے ایک خرابی وہ ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے بدلے دنیا خریدتے ہیں (اشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلاً، التوبہ ۹) یہ بات قرآن میں بار بار بتائی گئی ہے۔ مثلاً البقرہ ۷۹، آل عمران ۱۸۷، المائدہ ۴۴، وغیرہ۔

اس قسم کی خرابی ہمیشہ بعد کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ دورِ اول میں کوئی پیغمبر یا پیغمبر کا لایا ہوا دین اس حالت میں ہوتا ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو اپنے لیے دینی تجارت کا ذریعہ بنائے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فلسطین میں نبوت کی۔ اس وقت فلسطین کے کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ "دین مسیح" کے نام پر دنیوی فائدہ حاصل کرے۔ جب کہ آج مسیحی چرچ حضرت مسیح کے نام پر ساری دنیا میں بہت بڑا مذہبی کاروبار قائم کئے ہوئے ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ابتدائی دور میں جب مکہ میں تھے تو اس وقت یہ ناقابل تصور تھا کہ کوئی شخص "دینِ محمد" یا آپ کی لائی ہوئی کتاب کے نام پر کوئی مادی فائدہ حاصل کرے۔ مگر آج ساری دنیا میں "دین محمد" یا قرآن اور اسلام کے نام پر بہت بڑے پیمانہ پر مادی فائدے حاصل کئے جا رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ یہ دراصل زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ پیغمبر کا دین اپنے ابتدائی دور میں حدیث کی زبان میں، "غریب" ہوتا ہے۔ اس وقت انسانی سماج کے اندر اس کی جڑیں نہیں ہوتیں۔ اس کی بنیاد پر بڑے بڑے ادارے قائم نہیں ہوتے۔ اس کے ماننے والوں کا کوئی طاقت ور طبقہ موجود نہیں ہوتا۔ اس وقت پیغمبر کا دین صرف ایک تصور ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی پشت پر صرف لفظی دلیل کا زور ہوتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مگر بعد کو صورتِ حال بدل جاتی ہے۔ اب پیغمبر کو ماننے والے کروروں کی تعداد میں ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ادارے اس کی عظمت کی تصدیق کرنے کے لیے ہر طرف موجود ہوتے ہیں۔ کسی مذہب کا یہی دوسرا دور ہے جب کہ اس کے ماننے والوں میں وہ خرابی پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں دین کے بدلے دنیا خریدنا بتایا گیا ہے۔

تزکیہ کیا ہے

تزکیہ کا مقصد کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے تو الفاظ کے فرق کے ساتھ تقریباً سب کا جواب ایک ہوگا۔ یعنی روح کو پاک کر کے اس کو اس قابل بنانا کہ وہ خدا کی قربت حاصل کر سکے۔ اس کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ تزکیہ کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ تو بیشتر لوگ یہ جواب دیں گے کہ اس کی تدبیر ہے کسی شیخ (ولی) کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا۔ مگر پہلا جواب جتنا صحیح ہے، دوسرا جواب اتنا ہی غلط ہے۔

تزکیہ بلاشبہ ایک قرآنی مطلوب ہے۔ بلکہ تزکیہ ہی پر آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے (ذٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكّٰى) مگر تزکیہ کے عمل کا شیخ یا ولی سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شیخ یا ولی کسی آدمی کا تزکیہ نہیں کر سکتا۔ تزکیہ صرف اپنی ذاتی محنت اور اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں، اور نہ کوئی شخص تصرف کے ذریعہ کسی کو تزکیہ کے مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

تزکیہ کا ذریعہ حقیقۃً یہ ہے کہ روح کو خوراک پہنچائی جائے۔ جسم کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جسم کو پہنچائی جائے تو جسم صحت مند ہو جائے گا۔ اسی طرح روح کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جب روح کو پہنچائی جاتی ہے تو روح صحت مندی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے جس کو مصفّی اور مزکّی کہا جاتا ہے۔

روح کی یہ خوراک تفکیر (آل عمران ۱۹۱) ہے۔ آدمی کے گرد و پیش ہر وقت کچھ واقعات پیش آرہے ہیں۔ سماجی، تاریخی، کائناتی، ہر سطح پر ہر آن ان کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ان واقعات سے عبرت اور نصیحت لینا ہی روح کی خوراک ہے۔ جو شخص اپنے شعور کو اتنا ترقی دے کہ اس کو گرد و پیش کے واقعات میں خدائی کرشمے دکھائی دیں، جو اس کے لیے خدا کو یاد دلانے کا ذریعہ بن جائیں، تو ایسے شخص نے اپنی روح کے لیے رزق ربانی کا ایک دستر خوان حاصل کر لیا۔ اس کی روح اس دستر خوان سے اپنی صحت مندی کی خوراک لیتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

تزکیہ کا اہم ترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے اندر عبرت پذیری کے مزاج کو جگایا جائے۔ عبرت پذیری گویا تزکیہ کی زمین ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس پر تزکیہ کی فصل اگتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کو اگانا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر ایک ہرا بھرا درخت اگانے کی کوشش کی جائے۔

تزکیہ کا ذریعہ رزق رب ہے نہ کہ رزق شیخ۔

عقل کا امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ فرعون کے دربار میں ایک صاحب (رجل مومن) تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ آخر ایک موقع پر جب فرعون نے کہا کہ اس کا ارادہ ہے کہ وہ موسیٰ کو قتل کر دے، اس وقت وہ خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے فرعون اور تمام اہل دربار کے سامنے حضرت موسیٰ کی حمایت میں تقریر کی۔ یہ تقریر قرآن کی سورہ نمبر ۴۰ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قرآن میں اس رجل مومن کی تقریر کو نقل کرتے ہوئے ایک مقام پر یہ الفاظ ہیں:
وقال الذی آمن یاقوم اتبعونِ اھدکم سبیل الرشاد (اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا کہ اے میری قوم، تم لوگ میری پیروی کرو، میں تمہاری رہنمائی سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۳۸

دوسری طرف قرآن میں فرعون کی تقریر کے ذیل میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: قال فرعون ما اُریکم اِلا ما اریٰ وما اھدیکم الا سبیل الرشاد (فرعون نے کہا کہ میں تم کو اپنی سوچی سمجھی رائے بتا رہا ہوں اور میں تمہاری رہنمائی ٹھیک سیدھے راستہ کی طرف کر رہا ہوں) المومن ۲۹

فرعون کی حیثیت رجل کافر کی تھی مگر اس نے بھی وہی بات کہی جو رجل مومن نے کہی۔ دونوں نے کہا کہ میں تم کو سبیل الرشاد (راہ راست) کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں حق کا مبلغ جو الفاظ بولتا ہے وہی الفاظ باطل کے مبلغ بھی بولتے ہیں۔ دونوں صداقت کے حوالے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ حق کا مبلغ اگر دلائل حق کے حوالے سے اپنی بات کہتا ہے تو باطل کے مبلغ بھی بظاہر دلائل حق ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔

مگر ایک کی دلیل حقیقی دلیل ہے اور دوسرے کی دلیل بناوٹی دلیل۔ یہاں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان تمیز کرے۔ وہ شوشہ اور حقیقت کے فرق کو سمجھے۔ وہ مغالطہ اور دلیل کو الگ کر کے دیکھے۔ وہ الفاظ سے گزر کر معانی کو پہچانے۔ جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرے وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو شخص خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال نہ کر سکے وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

ہدایت کا قانون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی ہے۔ پس جو شخص شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مددگار شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں (البقرہ ۲۵۷)

ہدایت کا راستہ مکمل طور پر واضح ہوجانے کے بعد کیوں شیطان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ کسی شخص کو روشنی سے تاریکی کی طرف اور ہدایت سے گمراہی کی طرف لے جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت خواہ کتنی ہی زیادہ واضح ہوجائے۔ اس عالم امتحان میں بہرحال یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ کلام ہدایت کی غلط تاویل کرکے اس کا الٹا مفہوم نکالا جاسکے۔

ایک تعلیم یافتہ غیرمسلم سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام کا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں اتنے زیادہ تضادات ہیں کہ میرے جیسا آدمی تو کبھی اس کو سچا مذہب نہیں مان سکتا۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے قرآن میں ایک طرف لکھا ہوا کہ لا اکراہ فی الدین (دین میں کوئی زبردستی نہیں) دوسری طرف بخاری میں یہ حدیث ہے کہ آپ کے پیغمبر نے کہا کہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں۔ یہاں تک کہ وہ کہہ دیں کہ لا الٰہ الا اللہ) آیت میں عمومی قانون کا ذکر ہے اور حدیث میں استثنا کا۔ مگر دونوں حکموں کو یکساں قرار دینے کی وجہ سے ان میں تضاد نظر آنے لگا۔

جو شخص کلام الٰہی کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھے، جو واقعی طور پر کلام کے منشا کو جاننا چاہے، اس کو اللہ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ کلام کے اصلی مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص غیرسنجیدہ ہو، جو بگڑے ہوئے ذہن کے ساتھ کلام کو پڑھے، اس کا ساتھی شیطان بن جائے گا۔ وہ کلام کا الٹا مفہوم اس کے ذہن میں ڈالے گا۔ وہ غلط تاویل کی راہ میں اس کو بھٹکاتا چلا جائے گا۔

آزمائش کا قانون

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا (العنکبوت ۱-۳)

مومن خدا کا مطلوب بندہ ہے۔ مومن کے لیے خدا کے یہاں ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔ مگر مومن کسی نسلی گروہ کا نام نہیں اور نہ زبانی اقرار سے کوئی شخص مومن بن جاتا۔ مومن اس سچے خدا پرست کا نام ہے جس کی سچائی حالات کے امتحان میں ثابت شدہ بن گئی ہو۔ ایک شخص جب یہ کہے کہ میں مومن ہوں تو وہ ایمان کے دروازہ میں داخل ہو گیا۔ مگر یہ کہنا آغاز ہے نہ کہ اختتام۔ اس کے بعد حالات کا عملی امتحان شروع ہوتا ہے۔ اس امتحان کے دوران یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا تھا، یا وہ سچا نہیں تھا۔ اس امتحانی مرحلہ سے گزرنے کے بعد ہی خدا کے یہاں اس کا مرتبہ متعین ہوتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔

سچائی کا اعلان اگر ایک معروف اور مسلّم شخصیت کرے تو یہ امتحان کی بات نہیں ہوگی۔ کون ہوگا جو ایسی شخصیت کا انکار کرے۔ اس لیے سچائی کا اعلان ہمیشہ غیر مشہور اور غیر مسلّم شخص کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔ اب جو لوگ سچائی کو سچائی کے اعتبار سے پہچاننے کا مادہ رکھتے ہوں وہ فوراً اس کا اقرار کر کے امتحان میں پورے اتریں گے۔ اور جو لوگ سچائی کو شخصیت کے واسطے سے پہچاننے کا مزاج رکھیں، وہ اس کا انکار کر دیں گے۔ اس طرح وہ امتحان میں ناکام رہیں گے۔

حق کے ساتھ مادی نفع کو حذف کر دیا جاتا ہے تاکہ جو شخص صرف حق کا طالب ہو وہ اس کو لے لے، اور جو شخص مادی نفع کا طالب ہے وہ اس کو چھوڑ کر ثابت کرے کہ وہ حق کا سچا طالب نہیں۔ دین کے ساتھ مقبولیت ملتی ہو تو ہر آدمی ایسے دین کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس لیے دین کے ساتھ اجنبیت کو جوڑ دیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ کون فی الواقع حق کا طالب ہے اور کون حق کا طالب نہیں۔

زمانہ کی قسم

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے خسارہ میں ہے، سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

عصر کا مطلب ہے گزرا ہوا زمانہ۔ "گزرتے ہوئے" زمانہ میں انسان ایک "ٹھہری ہوئی" مخلوق ہے۔ وہ بقیہ کائنات کے سرگرم قافلہ کے ساتھ لازمی طور پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی یہ آزاد نوعیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کو بالارادہ کوشش کرنا ہے، جب کہ ناکامی اس کی طرف اپنے آپ چلی آرہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورۂ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے، لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس کی پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی)

انسان اپنی عمر رواں کے ساتھ آخرت کے ابدی انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ ایسے فیصلہ کن مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے عمل سے اس کا استحقاق پیدا کیا ہو۔ جو شخص عملی استحقاق کے بغیر وہاں پہونچے اس کے لیے آخرت کے دن ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا ایک انتہائی مکمل دنیا ہے۔ یہاں انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک پابند نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ وسیع کائنات اپنے بے شمار اجزار کے ساتھ ایک زبردست خدائی قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہر چیز ٹھیک وہی کرنے پر مجبور ہے جس کے لیے اس کو بنایا گیا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ انسان، دوسری تمام چیزوں کے برعکس، بالکل آزاد ہے۔ اگر چہ انسان کی فلاح بھی تمام تر اسی میں ہے کہ وہ بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ تاہم کائناتی طریقہ کو اختیار

کرے یا نہ کرے کا معاملہ تمام تر اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، وہ چاہے تو اس کو اپنا لے اور چاہے تو نہ اپنائے۔

کائنات کے مقابلہ میں انسان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کے مقابلہ میں اسٹیشن پر کھڑے ہوئے مسافر کی۔ ٹرین اپنے تمام اجزا سمیت انجن کے ساتھ بھاگی چلی جا رہی ہے۔ ٹرین کا ہر ڈبہ انجن سے بندھا ہوا ریل کی پٹری پر دوڑ رہا ہے۔ مگر مسافر اور ڈبہ میں یہ فرق ہے کہ ڈبہ تو انجن سے بندھا ہوا اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ مگر انسان اس وقت ٹرین کا مسافر بنتا ہے جب کہ وہ بالقصد اپنے کو اس کے اندر داخل کر کے اس کا شریک سفر بننے پر راضی ہو جائے۔ گویا ہم کو ٹرین کا ہم سفر بننے کے لیے تو ارادی عمل کی ضرورت ہے مگر ٹرین سے بچھڑنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ بچھڑنے کا واقعہ اپنے آپ ہو رہا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے برف پگھل کر ختم ہونے کا واقعہ اپنے آپ ہو رہا ہے۔ مگر اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل کرنے کے لیے بالقصد عمل کی ضرورت ہے۔ یا جیسے کسی طالب علم کے امتحان میں ناکام ہونے کے لیے تو صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ امتحان کے نظام میں اپنے آپ کو شریک کرے اور ان تقاضوں کو پورا کرے جو تعلیم کے ذمہ داروں نے مقرر کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والا ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی اس کے پورے عرصۂ حیات کا محض ایک ابتدائی وقفہ ہے۔ یہی مختصر وقت انسان کا اصل سرمایہ ہے کیوں کہ اسی پر اس کی آئندہ آنے والی طویل تر زندگی کا فیصلہ ہونا ہے۔

اس مختصر وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس میں معمولی غفلت بھی ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت میں انسان کو بھگتنی پڑے گی۔

اس مختصر وقت کو صحیح استعمال کرنے والا کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے سکے۔ ایک وہ جس کو ایمان کہا جاتا ہے۔ یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح۔ یعنی عین وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے۔ تیسرے حق و صبر کی تواصی۔ یعنی حقیقت کا ادراک اتنا گہرا ہو کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

اللہ کی ضمانت

دعوت الی اللہ کا کام جب بھی کسی پیغمبر نے کیا، اس کی قوم نے اس کو ستایا۔ یہی معاملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپ نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ مکہ میں بھی آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ستایا جاتا رہا اور مدینہ میں بھی مزید شدت کے ساتھ آپ کی مخالفت جاری رہی۔ اس سلسلہ میں اللہ کی طرف سے آپ کو واضح ضمانت دی گئی۔ ایک آیت یہ ہے :

یا ایھا الرسول بلغ ما أنزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ ان اللہ لایھدی القوم الکافرین (المائدہ ٦٧)

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً انکار کرنے والوں کو راہ نہیں دیتا۔

دعوت کا کام خالص خدائی کام ہے۔ یہ اللہ کے منصوبہ کی تکمیل کے طور پر انجام دیا جاتا ہے (النساء ١٦٥) اس لیے یہ بالکل فطری ہے کہ اس معاملہ میں داعی کو اللہ کی مدد حاصل ہو۔ اس مشکل کام میں اللہ کی مدد کا نہ آنا تعجب خیز ہے نہ کہ اللہ کی مدد کا آنا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس دعوتی کام کی ذمہ داری اہل اسلام پر ہے۔ آپ کے بعد آپ کی امت کو وہ کام انجام دینا ہے جو آپ نے اپنی زندگی میں انجام دیا تھا۔ (الحج ٧٨) ذمہ داری کی اس توسیع کا قدرتی تقاضا تھا کہ حق میں بھی توسیع کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اعلان فرمایا کہ وہ تمام لوگ جو اس معاملہ میں پیغمبر اسلام کی پیروی کریں گے وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کی حفاظت میں رہیں گے :

یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین (الانفال ٦٤)

اے نبی، اللہ تمہارے لیے کافی ہے اور مومنین کے لیے جنھوں نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔

اس آیت کے دو مطلب بتائے گئے ہیں۔ دوسرا مطلب یہی ہے کہ اللہ تمہارے لیے کافی ہے اور ان کے لیے جنھوں نے تمہارا اتباع کیا (والمعنی حسبک وحسب من اتبعک اللہ) التفسیر المظہری ۱۱۰/۴
مومنین کے لیے اس نصرت کا ذکر قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔

کتمانِ شہادت

قدیم عرب میں یہود بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ماضی کی روایات کی بنا پر ان کو اپنے ماحول میں سرداری حاصل تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن اور اسلام کی دعوت پیش کی تو یہود آپ کے مخالف ہوگیے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ ہم دین پر ہیں اور محمد دین سے دور ہوگیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے نزدیک دین نام تھا دینِ اکابر کا۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دینِ خدا کو دین کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ اس فرق کی بنا پر وہ لوگ آپ کے دشمن ہوگیے۔

تاہم یہ دشمنی ظاہری تھی۔ یہود اپنے علم کے مطابق اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اکابر اس دنیا کے خدا نہیں ہیں بلکہ خدا اس دنیا کا خدا ہے۔ سچا دین وہی ہے جو آدمی کو خدا سے جوڑے نہ کہ وہ جو آدمی کو انسانی اکابر سے وابستہ کرے۔ یہود کا دل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت پر گواہی دیتا تھا مگر دنیا کے فائدے اور قیادت کی مصلحتیں انھیں روکتی تھیں کہ وہ اپنے دل کی بات کو زبان پر لائیں۔ وہ سچائی کو سچائی جانتے ہوئے اس کے اعلان و اظہار سے باز رہے۔ یہود کی اس مجرمانہ خاموشی پر تنبیہہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے :

ومن اظلم ممن کتم شہادۃ عندہ من اللہ (البقرہ ۱۴۰)	اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔

جب آدمی کا دل ایک بات کی سچائی کا اقرار کرے تو گویا اس کے پاس خدا کی گواہی آگئی۔ یہ گواہی خدا کی ایک مقدس امانت ہے۔ آدمی کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس گواہی کا اعلان کرے۔ جو شخص اس خدائی گواہی کے لیے نہ اٹھے وہ ظالم ہے، ایسے ظالموں سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ وہ خدا کے معاملہ میں غیر جانبدار ہوگیے، اس لیے خدا بھی ان کے معاملہ میں غیر جانبدار ہوجائے گا، اور جس کے معاملہ میں خدا غیر جانبدار ہوجائے اس کا زمین و آسمان میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔

سچائی موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جو لوگ سچائی کا ساتھ نہ دیں، انھوں نے خدا کا ساتھ نہیں دیا، انھوں نے خدا کو نظر انداز کردیا۔

شعور اور عمل

قرآن میں بنی اسرائیل کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو جنگ کا حکم دیجئے۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ان کی اکثریت جنگ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی (البقرہ ۲۴۶)

اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جب ان کو جنگ کا سامنا ہوا اور ان سے لڑنے کے لیے کہا گیا تو وہ فوراً مقابلہ کے لیے تیار ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدا اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا (الاحزاب ۲۲)

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ پیدائشی مومن تھے۔ جب کہ پیغمبر اسلام کا ساتھ دینے والے وہ لوگ تھے جو شعوری انقلاب کے بعد مومن بنے تھے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے کردار میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ عمل کا معاملہ لازمی طور پر شعور کے ساتھ وابستہ ہے۔ آدمی کا شعور جتنا گہرا ہوگا اس کا عمل بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔ اور اس کا شعور جتنا سطحی ہوگا اس کے عمل میں بھی اتنی ہی سطحیت آتی چلی جائے گی۔

اس فرق کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ عمل کے لیے صرف حکم کافی نہیں۔ کسی حکم کو قبول کرنے کے لیے اسی درجہ کا شعور بھی لازمی طور پر درکار ہے۔ جس شخص کو حکم دیا جارہا ہے، اس کا شعوری ارتقاء اگر حکم سے کم تر درجہ کا ہو تو وہ حکم کی معنویت کو پوری طرح سمجھ نہ سکے گا۔ وہ اس کو اپنے دماغ میں وہ اہمیت دینے سے قاصر رہے گا جو باعتبار حقیقت اسے دینا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نفسیاتی طور پر اس کی تعمیل کے لیے بھی تیار نہ ہو سکے گا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں جو لوگ ایمان قبول کرتے ہیں وہ شعور اور ارادہ کے تحت ایمان قبول کرتے ہیں ان کی بعد کی نسلوں میں یہ شعور مدھم پڑ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ دوبارہ ان کے شعور کو جگایا جائے، ان کے تقلیدی ایمان کو ارادی فیصلہ کے تحت اختیار کرنے والا ایمان بنا دیا جائے ـــــــ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصلاح کا پہلا قدم یہی ہے کہ ان کے اندر شعوری ایمان کو جگانے کی کوشش کی جائے۔

اجتماعی مہم

قرآن میں اہل ایمان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ جب رسول (بالفاظ دیگر امور مسلین کے ذمہ دار) کے ساتھ کسی امر جامع پر ہوں تو بلا اجازت وہاں سے اٹھ کر نہیں جاتے، یہاں امر جامع سے مراد اجتماعی معاملہ ہے۔ یعنی دین کا ایسا کام جس کے لیے مشترک عمل ضروری ہو۔ اور "اجازت" کا ذکر بطور "معی واقعہ" کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دین کے اجتماعی کام سے آدمی کو اسی طرح گہری وابستگی ہونی چاہیے جو اس کو اپنے ذاتی کام سے ہوتی ہے۔

جس کام سے آدمی کے ذاتی فائدے وابستہ ہوں، جس کا تعلق براہ راست اس کی شخصی مصلحتوں سے ہو۔ وہاں ذاتی فائدہ خود ہی وہ طاقت ور محرک بن جاتا ہے جو آدمی کو اس کام سے جوڑے اور اس کو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہونے دے جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ جو کام مطلوب تھا وہ انجام پا چکا ہے۔ ذاتی کام کو آدمی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اس لیے آدمی اس کو کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر جس کام کا تعلق مشترک اجتماعی معاملات سے ہو اس کو آدمی دوسروں کی ذمہ داری سمجھ لیتا ہے۔ ایسے کام کے لیے آدمی کے اندر طاقتور شخصی محرک نہیں ابھرتا۔ اس لیے عام آدمی اس کو اپنے لیے بوجھ سمجھتا ہے۔ ایسے کام میں بھرپور دلچسپی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر گہرا اجتماعی شعور موجود ہو۔ وہ اجتماعی مفاد کو اسی طرح اہمیت دینے لگے جس طرح وہ ذاتی مفاد کو اہمیت دیتا ہے۔

مومن سے یہ مزاج مطلوب ہے کہ جب بھی اسلام کا کوئی اجتماعی تقاضا ہو تو وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کے لیے دوڑ پڑے۔ وہ آخر وقت تک بھرپور طور پر اس میں شریک رہے۔ ایسا آدمی جب امیر اجتماع سے اجازت مانگتا ہے تو وہ فرار کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقی سبب کے تحت ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو اس کو اجازت دے دو۔ تاہم اجازت دینا اور اجازت مانگنا دونوں اس روح کے ساتھ ہونا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کے حق میں دعا کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ دونوں کی زبان سے وہ دعائیہ کلمہ نکلے جو حقیقی خیر خواہی کا تقاضا ہے۔

اصلاح کا طریقہ

ایک ہے برائی کو برا سمجھنا اور ایک ہے برے آدمی کو برا سمجھنا۔ دونوں میں ظاہری الفاظ کے اعتبار سے معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا فرق ہے کہ ایک اسلام بن جاتا ہے اور دوسرا غیر اسلام۔ ایک خدا سے ڈرنے والا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ ان لوگوں کا ہے جو خدا سے بے خوف ہو چکے ہوں۔

قرآن میں ہے کہ شیطان انسان کا دشمن ہے (ان الشیطان للانسان عدو مبین، یوسف ۱۲) دوسری طرف فرمایا کہ آخرت کے عذاب سے وہ لوگ محفوظ رہیں گے جو لوگوں کو برائی سے روکتے تھے (انجینا الذین ینھون عن السوء، الاعراف۔ ۱۶۵)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف مہم چلانا شیطانی فعل ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر برائی کو نشانہ بنائے اور برائی کو (نہ کہ برے آدمی کو) مٹانے کی کوشش کرے تو یہ فعل خدا کو اتنا پسند ہے کہ اس کی وجہ سے وہ آدمی کو آخرت میں بخش دے گا اور اس کو جنت کے باغوں میں داخل کرے گا۔

آج اگر مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو ہر جگہ آپ کو یہ منظر دکھائی دے گا کہ لوگ برائی کو مٹانے کے نام پر ایک یا زیادہ آدمیوں کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کوئی خاندان ہو یا کوئی محلہ، کوئی قوم ہو یا کوئی ملک ہر جگہ کچھ افراد لوگوں کی مخالفانہ کارروائیوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ لوگ برائی کے نام پر کسی شخص خاص کو مٹانے کے لئے اپنی ساری توجہ لگائے ہوئے ہیں۔

اگر برائی کو مٹانے کا ذہن ہو تو آدمی کو برائی سے دشمنی ہوتی ہے نہ کہ کسی شخص خاص سے جس کو برا مشہور کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی آدمی میں برائی پائی جائے تو ایسا آدمی صرف معلوم برائی کی حد تک اس کو برا سمجھتا ہے۔ جب کہ دوسرے ذہن کے لوگ ایک برائی کی بنا پر اس کی پوری شخصیت ہی کو قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں۔ برائی کو برا سمجھنے والوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اگر برا آدمی اپنی اصلاح کرے تو اس کے بعد وہ ان کا دوست بن جاتا ہے۔ جبکہ دوسری قسم کے لوگوں کو اس کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اس کی ذات کے دشمن بن جاتے ہیں اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک اس کو ہلاک نہ کر لیں، اسی طرح برائی کو برا سمجھنے والا اپنے اور غیر میں فرق نہیں کرتا۔ مگر جو شخص برے فرد کو نشانہ بنانے کا مزاج رکھتا ہو وہ اپنے حلقہ کے آدمی کو ایک نظر سے دیکھے گا اور دوسرے حلقہ کے آدمی کو دوسری نظر سے۔ برائی کے خلاف اٹھنے والا آدمی عین اس وقت بھی برے آدمی کے لئے دعائیں کر رہا ہوتا ہے جب کہ وہ اس کی برائی کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔

کتاب مہجور

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے:

وقال الرّسول یٰرب ان قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجورا (فرقان ـ ۳۰)

اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھیرا دیا اس قرآن کو چھوڑا ہوا۔

اس آیت سے اولاً وہ لوگ مراد ہیں جن کے سامنے قرآن آتا ہے مگر وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جیسا کہ مکی دور میں قریش نے کیا۔ تاہم اس نفسیات کا عملی مظاہرہ کبھی ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو بظاہر قرآن کو ماننے والوں کی فہرست میں داخل ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر قرآن میں آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا، اس کی تصحیح قرأت کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کرکے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت داخل ہو سکتی ہیں۔"

قرآن کے ماننے والوں کے لئے قرآن کو "کتاب مہجور" بنانے کی یہ شکل کبھی نہیں ہوتی کہ اس کا احترام و تقدس لوگوں کے دلوں میں باقی نہ رہے۔ برکت اور تقدس کا نشان ہونے کی حیثیت سے وہ ہمیشہ اس کو اپنے طاق کی زینت بنائے رہتے ہیں۔ البتہ وہ اس سے فکری رہنمائی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی کتاب میں ان کے لئے ذہنی غذا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی حقیقی زندگی کا سرمایہ نہیں بنتی۔ وہ ان کی دنیا پرستانہ زندگی کے لئے "برکت کا تعویذ" تو ضرور ہوتی ہے مگر آخرت کی رہنما کتاب کی حیثیت سے ان کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا —— یہ مطلب ہے خدا کی کتاب کو "کتاب مہجور" بنا دینے کا۔

جو لوگ قرآن کو نہ مانیں ان کے لئے قرآن کا چھوڑنا یہ ہے کہ وہ اس کو خدا کی اتاری ہوئی کتاب ماننے سے انکار کر دیں۔ اور جو لوگ قرآن کو مانتے ہوں ان کے لئے قرآن کا چھوڑنا یہ ہے کہ وہ زبان سے قرآن کو خدا کی کتاب کہیں اور اپنی زندگی کو اس کے خلاف چلائیں۔ وہ قرآن کو عقیدۃً مانتے ہوئے عملاً اسے چھوڑ دیں۔

جب مسلمانوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ قرآن میں غور و فکر نہ کریں۔ وہ اپنے مسائل کا حل قرآن میں تلاش کرنا چھوڑ دیں۔ وہ قرآن کے انداز پر سوچنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ان کی سرگرمیوں کی بنیاد قرآن نہ رہے تو گویا انھوں نے قرآن کو مانتے ہوئے قرآن کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے قرآن کو کتاب مہجور بنا دیا۔

کیسے اچھے ساتھی

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبین والصدیقین والشہداء والصٰلحین وحسن اولئک رفیقا۔ ذٰلک الفضل من اللہ وکفیٰ باللہ علیما نساء ۷۰

اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام کیا۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کیسے اچھے ساتھی ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کا علم کافی ہے۔

اللہ کے انعام یافتہ بندے کون ہیں۔ یہ وہ نیک روحیں ہیں جن کو دنیا میں اطاعت خداوندی کے تحت زندگی گزارنے کی توفیق ملی۔ وہ اس دین پر قائم رہے جس پر تمام زمین و آسمان قائم ہیں۔ جنھوں نے اپنے کو خدا کے اس تخلیقی منصوبہ میں شامل کر دیا جس میں کائنات کی تمام چیزیں اپنے کو شامل کئے ہوئے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے "کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کی فرماں بردار ہیں زمین و آسمان کی تمام چیزیں (آل عمران) گویا انسان سے جس دین کو اختیار کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ کوئی نیا یا کائنات سے علیحدہ دین نہیں ہے، بلکہ وہی دین ہے جس پر ساری کائنات قائم ہے۔

کائنات کا دین کیا ہے۔ کائنات کا دین اطاعت الٰہی ہے۔ یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کے اندر اپنی سرگرمیاں جاری کرنا۔ درخت زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے مگر وہ اپنا سایہ زمین پر بچھا دیتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں مگر وہ کسی سے ٹکراؤ نہیں کرتیں۔ سورج اپنی روشنی بکھیرتا ہے مگر وہ چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ بادل بارش برساتے ہیں مگر وہ اپنے اور غیر میں تمیز نہیں کرتے۔ چڑیاں اور چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہوتی ہیں مگر وہ ایک دوسرے کا حصہ نہیں چھینتیں۔

یہ کائنات کا دین ہے اور اسی دین پر انسان کو بھی رہنا ہے۔ اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جو دنیا میں درخت کے سایہ کی طرح متواضع بن کر رہے۔ جو دوسروں کے درمیان اس طرح گزرے جیسے ہوا کے لطیف جھونکے لوگوں کے درمیان سے گزر جاتے ہیں۔ جن کا فیض اور جن کی مہربانیاں بارش کی طرح ہر ایک کے لئے عام ہوں۔ جو دریا کے پانی کی طرح دوسروں کے لئے سیرابی بن جائیں۔ جنھوں نے سورج کی روشنی کی طرح ہر ایک کو اپنے کا تحفہ دیا۔ جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران اس بات کی احتیاط رکھی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

انبیاء اس دین کی تعمیل میں کمال کے درجہ پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد صدیقین کا درجہ ہے، پھر شہداء اور پھر صالحین کا۔ جنت انھیں پاک روحوں کا معاشرہ ہے۔ جنت وہ نفیس اور لذیذ مقام ہے جہاں آدمی کو اپنے پڑوسی سے پھولوں کی مانند خوشبو ملے گی اور چڑیوں کے چہچہے جیسے بول سننے کو ملیں گے۔ جہاں ایک کا دوسرے سے ملنا لطیف ہواؤں سے ملنے کی طرح ہوگا۔ کیسی عجیب ہوگی جنت اور کیسا عجیب ہوگا اس کا پڑوس۔

ایمان کی آزمائش

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مومن بننے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ آدمی اپنی زبان سے کہہ دے کہ "میں مومن ہوں"۔ اقرار ایمان کے بعد حالات میں ڈال کر آدمی کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اور جب آدمی آزمائش کے بعد اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے تب اس کا ایمان اللہ کے نزدیک قابل اعتبار قرار پاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں وہ مومن بنتا ہے جس کے لیے خدا نے جنت کے محل تیار کر رکھے ہیں۔

ایمان لانا دوسرے لفظوں میں اللہ کو اپنا بڑا بنانا ہے۔ آزمائش اسی لیے ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آدمی نے فی الواقع اللہ کو اپنا بڑا بنایا ہے۔ یا حقیقی طور پر اس کے نزدیک بڑا کوئی اور ہے اور وہ صرف زبان سے خدا کی بڑائی کے الفاظ بول رہا ہے۔ آدمی جب حالات کی آزمائش میں پڑتا ہے اس وقت فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک بڑا (سپریم) کون ہے۔ کس کو وہ سب سے زیادہ لحاظ کے قابل سمجھتا ہے اور کس کو لحاظ کے قابل نہیں سمجھتا۔

حالات بار بار آدمی کو ایسے موڑ پر لاتے ہیں جہاں ایک طرف خدا کے تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف دوسری چیزوں کے تقاضے۔ ایک طرف خدا اور اس کا دین ہوتا ہے اور دوسری طرف آدمی کا مادی مفاد، اس کی دنیوی مصلحتیں، اس کے بیوی اور بچے، اس کا نفس اور اس کی انا، ایسے مواقع ہی پر معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

اب ایک انسان وہ ہے جو تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے خدا کو پکڑ لے۔ اس کے مفادات مجروح ہوں، اس کے بچوں کی آرزوئیں ذبح ہو رہی ہوں، اس کی انا کا بت ٹوٹ رہا ہو مگر وہ ان سب کو نظر انداز کر دے اور خدا پر ایمان کا جو تقاضا ہے اس کو پوری طرح اختیار کرلے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو نازک مواقع پر خدا کی پکار کو بھول جائے۔ وہ ایمان کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنے مفادات کی طرف اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جائے۔ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں کو بچانے کی خاطر خدائی مصلحتوں کو فراموش کر دے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ خدا کے یہاں غیر مومن قرار دیئے جائیں گے، خواہ زبان سے انھوں نے کتنا ہی زیادہ اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔

رسول کی خلاف ورزی

قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ کے آخر میں رسول کی اطاعت کی اہمیت بیان ہوئی ہے اور اس کو دنیا اور آخرت کی سعادت کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

لا تجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء بعضكم بعضاً۔ قد يعلم الله الذين يتسللون منكم لواذا۔ فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب اليم (النور ۶۳)

تم لوگ اپنے اندر رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ پس جو لوگ رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، ان کو ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو دردناک عذاب پکڑ لے۔

اس آیت میں "دعاء" کا مطلب وہی ہے جو سورہ الانفال (آیت ۲۴) میں دعاء کا مطلب ہے۔ یعنی پیغام۔ شاہ عبدالقادر دہلوی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: حضرت کے بلانے سے فرض ہوتا تھا حاضر ہونا جس کام کو بلائیں۔

اس آیت میں ایک ابدی حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے کامیابی کا طریقہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے، اپنے ہر معاملہ میں رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کو اختیار کرنا۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ وہ دنیا میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جائیں اور آخرت میں بھی باز پرس سے دوچار ہوں۔

رسول نے جہاں اقدام کی تلقین کی ہو وہاں کسی مصلحت کی بنا پر اقدام نہ کرنا، جہاں آپ نے صبر اور اعراض کا حکم دیا ہو وہاں بے صبری اور ٹکراؤ کا مظاہرہ کرنا، جہاں آپ نے داخلی اصلاح کی تاکید کی ہو وہاں خارجی اصلاح کے ہنگامے کھڑے کرنا، جہاں آپ نے سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیا ہو وہاں غیر ذمہ داری اور جذباتیت کا انداز اختیار کرنا، یہ سب اس میں شامل ہیں۔ اس قسم کی ہر روش سے مسلمانوں کے لیے اسی خرابی کا اندیشہ ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہوا۔

تنقید، نزاع

قرآن میں داعی کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مدعو (مخاطب) سے نزاع کرے۔ داعی پر لازم ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں اور اس کی اشتعال انگیز باتوں پر یک طرفہ طور پر صبر کرے۔ وہ ہرگز ردعمل کا انداز اختیار نہ کرے۔ یہ ہدایت اس لیے دی گئی ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا برہم نہ ہونے پائے جو دعوت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

وہ کون سی نزاع ہے جس سے داعی کو پرہیز کرنا ہے۔ قرآن کے مطابق وہ دو قسم کی ہے۔ ایک یہ کہ مادی چیزوں کے معاملہ میں مدعو سے جھگڑا کیا جائے۔ مثلاً مدعو سے معاشی حقوق کی جنگ چھیڑنا۔ مدعو سے مطالبہ کرنا کہ تم ہمارے خلاف نعرہ نہ لگاؤ، اور اگر وہ مخالفانہ نعرہ لگائے تو اس سے لڑ پڑنا۔ مدعو کو نقصان پہنچا کر اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرنا، وغیرہ۔ داعی کو چاہیے کہ اس طرح کے معاملات میں وہ خود صبر کر لے، وہ مدعو کے خلاف احتجاجی مہم یا حقوق طلبی کی سیاست نہ چلائے۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ مدعو کو خطاب کرنے میں سب وشتم یا مناظرہ ومجادلہ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ واقعات وحقائق کی زبان میں کلام کیا جائے، داعی کا جدال ہمیشہ جدال احسن ہوتا ہے۔ داعی اپنی بات کو دلائل پر مبنی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔

داعی کو جس نزاع سے منع کیا گیا ہے، اس کا کوئی تعلق تنقید سے نہیں ہے۔ کلمہ اسلام (لاالٰہ الا اللہ) میں شرک کی تردید پہلے ہے اور توحید کا اثبات اس کے بعد۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید، دعوت کا لازمی جزء ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تنقید بھی مدعو کو بری معلوم ہو۔ وہ تنقید کو سن کر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود دعوت میں تنقید کا اسلوب اختیار کیا جائے گا۔ کیوں کہ دعوت کا اصل مقصد احقاق حق اور ابطال باطل ہے، ایسی حالت میں اگر تنقید کا انداز نہ اختیار کیا جائے تو اس کے بعد دعوت کی وضاحت ہی ناممکن ہو جائے گی۔

سچی تنقید اپنی حقیقت کے اعتبار سے تبیین ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی استدلالی وضاحت ہے۔ ایسی تبیین اور وضاحت لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر مخاطب کے اوپر حق کی پیغام رسانی کا اتمام نہیں ہو سکتا۔

حسرت کا دن

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ قیامت کا دن بہت سے لوگوں کے لیے حسرت کا دن ہوگا۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے: یقیناً وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر اچانک آئے گی تو وہ سخت حسرت اور افسوس میں پڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ اس باب میں ہم نے کیسی کوتاہی کی۔ اس وقت وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو، کیسا برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھائیں گے۔ اور دنیا کی زندگی تو بس کھیل اور تماشا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے (الانعام ۳۱-۳۲)

حسرت دراصل کھوئی ہوئی چیز پر غم اور ندامت کا نام ہے (اَلْحَسْرَةُ اَلْغَمُّ عَلٰی مَا فَاتَهُ وَالنَّدَمُ عَلَيْهِ، المفردات فی غریب القرآن) قیامت میں جب پردہ ہٹے گا اور تمام حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گی اس وقت آدمی پر کھلے گا کہ دنیا میں کتنا بڑا موقع اس کو ملا تھا مگر وہ اس کو استعمال (avail) نہ کر سکا۔ اس نے ملے ہوئے موقع کو کھو دیا۔

اس وقت آدمی جانے گا کہ میرے لیے موقع تھا کہ میں دنیا میں عمل کر کے آخرت میں اس کا قیمتی انعام حاصل کروں۔ مگر اس واحد موقع کو میں اپنے لیے کارآمد نہ بنا سکا۔ اب دوبارہ عمل کا موقع نہیں۔ اب ابد تک میرے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ میں اپنی کوتاہی کا انجام بھگتتا رہوں۔

میرے لیے موقع تھا کہ میں حق کے اعتراف کا کریڈٹ لوں مگر میں نے صرف حق کے انکار کا ثبوت دیا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں خدا کے آگے جھک جاؤں مگر میں خدا کے آگے سرکشی کرتا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں انصاف والا معاملہ کروں مگر میں برابر بے انصافی کرتا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں سچے انسانوں کا ساتھ دوں مگر میرا گھمنڈ میرے لیے ان کا ساتھ دینے میں رکاوٹ بنا رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں حق دار کو اس کا حق ادا کروں مگر میں حق دار کو اس کا حق ادا کرنے میں ناکام رہا۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں بے لاگ سچائی کا اعلان کروں مگر میں ہمیشہ مصلحت والی باتیں لکھتا اور بولتا رہا۔ میں نے کھو دیا حالانکہ میرے لیے پانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ یہ حسرت بلاشبہہ سب سے بڑا عذاب ہے، اور یہ عذاب ہر اس انسان کے لیے مقدر ہے جس پر موت اس حال میں آئے کہ وہ اپنے دنیا کے مواقع کو اپنی آخرت کے لیے استعمال نہ کر سکا۔

روایت کو توڑنا

قرآن میں قتل کی برائی کو بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس شخص نے کسی آدمی کو بلا سبب قتل کیا تو اس نے گویا سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور جس شخص نے ایک آدمی کی زندگی کو بچایا تو اس نے گویا تمام آدمیوں کو بچالیا (المائدہ ۳۲)
اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص جب اس قسم کا جرم کرتا ہے تو وہ احترام جان کی روایت کو توڑتا ہے۔ احترام جان کی روایت ایک قسم کی نفسیاتی رکاوٹ ہے جو لوگوں کو اس سے روکے رہتی ہے کہ وہ کسی کی زندگی پر حملہ کریں۔ مگر جب کسی سماج میں یہ روایت ایک بار توڑ دی جائے تو پھر نفسیاتی رکاوٹ کی دیوار گر جاتی ہے۔ ایک شخص کے بعد دوسرے لوگ اس مجرمانہ عمل پر جری ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک آدمی کا قتل سارے آدمیوں کے قتل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے مسلم اسپین کی مثال لیجئے۔ اسپین کے مسلم عہد کے آخر میں مسلمان اپنی نااتفاقی کی بنا پر کمزور ہو گیے۔ اولاً وہ متفرق ریاستوں میں بٹ گیے۔ اور پھر ایک ایک کرکے یہ ریاستیں ختم ہو گئیں۔ آخر میں انھوں نے سلطنتِ غرناطہ قائم کی جس کا پہلا سلطان نصر بن یوسف تھا جو ابن الاحمر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بادشاہ نے غرناطہ میں مشہور محل الحمرا تعمیر کرایا۔

سلطنت غرناطہ کا تیسرا بادشاہ محمد مخلوع تھا۔ اس کو اس کے بھائی نصر بن محمد نے ۷۱۰ھ میں قتل کرادیا تاکہ اس کا کوئی سیاسی رقیب باقی نہ رہے۔ اس قتل نے شاہی محل کے اندر احترام جان کی روایت کو توڑ دیا اور پھر بادشاہوں کے قتل کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد سلطان ابوالولید کو اس کے بھتیجے نے ۷۲۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد سلطان محمد تخت پر بیٹھا۔ اس کو اس کے رشتہ داروں نے ۷۳۳ھ میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان یوسف سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں ہوا۔ مگر وہ بھی ۷۵۵ھ میں نیزہ مار کر ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان اسماعیل تخت نشین ہوا۔ مگر ۷۶۱ھ میں خود اس کے بھائی نے اس کو قتل کر دیا۔

غرض اس طرح ایک کے بعد ایک بادشاہوں کا قتل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۸۹۷ھ (۱۴۹۲) میں خود سلطنت غرناطہ کا خاتمہ ہو گیا۔ روایت کا تحفظ انسانیت کا تحفظ ہے۔ اور روایت کو توڑنا انسانیت کو توڑنا۔

ایک آیت

قرآن کی سورہ نمبر ۴۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اور زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی نشانیاں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ مگر جن لوگوں کے اندر گھمنڈ کا مزاج ہو، وہ اس سے نصیحت لینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے:

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (الجاثیہ ۹)

اور جب اس کو ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلت کا عذاب ہے۔

قرآن کی آیتوں میں "چیز" کو پانا اور اس کو لے کر قرآن کا مذاق اڑانا کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا کہ جہنم کے اوپر ۱۹ فرشتے ہوں گے (المدثر ۳۰) یہاں منکرین نے یہ کیا کہ ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف "۱۹" کے عدد کو لے لیا اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک پہلوان نے کہا کہ اگر وہ صرف انیس ہیں تو میں اکیلا ہی ان کو گرا دوں گا (اِن کانوا تسعة عشر فانا الـقاهم وحدی) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۱۹/ ۱۵۹

بے حس اور متکبر لوگ عام طور پر سچائی کو نہ ماننے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ آیات کو چھوڑ کر شئ کو لے لیتے ہیں۔ وہ حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور شوشہ کو لے کر صاحب حق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔

حق کو ماننا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ حق کو ماننے کے لیے آدمی کو اپنی رائے بدلنا پڑتا ہے اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی خواہش کو کچلے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑائی کے مقام سے اتارے اور اپنے آپ کو چھوٹا بنانے پر راضی ہو جائے۔ اس جہاد عظیم کے لیے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کو منکرِ حق کہا جائے۔ اس لیے وہ حق کے پیغام میں شوشہ نکال کر اس کا استہزاء کرتا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ جس چیز کو وہ نہیں مان رہا ہے وہ اسی قابل ہے کہ اس کو نہ مانا جائے۔

جو لوگ خدائی صداقت کو رد کریں وہ خود آخرت میں رد کر دیئے جائیں گے۔ اور جن لوگوں کو خدا رد کر دے ان کے لیے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

لہو حدیث

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (لقمان ۶)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہے جو غافل کرنے والی ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کرے بغیر کسی علم کے، اور اس کی ہنسی اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

جب حق کی دعوت اٹھتی ہے تو ایک طبقہ بڑھ کر اس کو قبول کر لیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر سنجیدگی ہوتی ہے۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ جو دنیا کی مصلحتوں میں اٹکے ہوئے نہیں ہوتے۔ حق کا پیغام ان کے لیے ان کے دل کی آواز ثابت ہوتا ہے۔ وہ فوراً اس کو اپنا لیتے ہیں۔ اور اللہ کی توفیق سے اللہ کے مقبول بندوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو کبر کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کا احساس برتری اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ وہ حق کے پیغام کو قبول کرے۔ وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کو یہ بات اپنے مقام سے فروتر نظر آتی ہے کہ وہ ایک ایسے پیغام کو قبول کرے جس کے ساتھ عظمتوں کی روایات شامل نہیں، جس میں اس کو بیٹھنے کے لیے اونچی گدیاں دکھائی نہیں دیتیں۔

یہ لوگ صرف اس پر بس نہیں کرتے کہ حق کے پیغام کو اختیار نہ کریں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی روش کو جائز اور معقول ثابت کریں۔ اس مقصد کے لیے، مذکورہ آیت کے مطابق وہ لہو حدیث کا طریقہ اپناتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ گمراہ کن باتیں پھیلا کر لوگوں کو حق سے متوحش کر دیں۔

لہو حدیث سے مراد وہ گمراہ کرنے والی باتیں ہیں جن کو وہ حق سے ہٹانے کے لیے لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں — داعیٔ حق کی اصل بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی ذات پر طعنہ زنی کرنا۔ دلائل کے مقابلہ میں عیب جوئی کا طریقہ اختیار کرنا۔ داعی کے پیغام میں شوشے نکال کر اس کو غیر معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ داعی کی بات کو غلط شکل میں پیش کر کے اس کو نشانۂ ملامت بنانا۔ حقائق اور بینات کے جواب میں طنز و تضحیک کی مہم چلانا، وغیرہ

یہ تدبیریں اسی طرح بے فائدہ ہیں جس طرح پانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ریت کی دیوار۔

مطالعہ قرآن

قرآن میں یہود کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ ایک "نجات دہندہ" کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب وہ آئے گا تو ہم اس کا ساتھ دے کر مشرکوں سے لڑیں گے اور پھر دوبارہ اپنا غلبہ قائم کریں گے۔ مگر جب محمد بن عبداللہؐ کی صورت میں وہ آنے والا آیا تو یہود نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حتی کہ وہ آپ کے سخت ترین دشمن بن گیے (البقرہ رکوع ۱۱)

اس کی کیا وجہ ہے کہ جو لوگ ایک "آنے والے" کے منتظر رہتے ہیں، جب وہ آنے والا آتا ہے تو یہی لوگ اس کے سب سے بڑے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن کے مذکورہ حصہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اس انکار اور دشمنی کا سبب ہوائے نفس (البقرہ ۸۷) ہے۔ یہ انتظار کرنے والے سمجھتے ہیں کہ آنے والا ان کی ہوائے نفس کے مطابق ہوگا۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی ہوائے نفس کی تائید نہیں کر رہا ہے تو پہچان لینے کے باوجود وہ اس کے منکر اور مخالف بن جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

آنے والا بے آمیز حق کو لے کر آتا ہے، جب کہ وہ ملاوٹ والے حق کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا خدا کی بڑائی کو بیان کرتا ہے، جب کہ وہ اپنے اکابر کی بڑائی کو محبوب بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اصولی دین کا اعلان کرتا ہے، جب کہ وہ قومی دین کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا آخرت کے مسائل کو سب کچھ بتاتا ہے، جب کہ وہ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا زندہ دین کی طرف پکارتا ہے، جب کہ وہ جامد دین کی بنیاد پر گدیاں سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اتباعِ حق کا داعی ہوتا ہے، جب کہ وہ اتباعِ ھویٰ پر اپنی زندگی کا نقشہ بنائے ہوتے ہیں۔

یہ فرق آنے والے کو ان کی نظر میں سخت مبغوض بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے، کیوں کہ اس میں انھیں اپنی پوری زندگی کا ڈھانچہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ آنے والے کو غلط ثابت کرنے کی جھوٹی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خود اپنے مطلوب کو نامطلوب بنا دیتے ہیں۔

ایک آیت

قرآن میں مختلف قسم کے گناہوں کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ جو شخص ان گناہوں میں مبتلا ہوگا اس کے لیے خدا کے یہاں سخت عذاب اور رسوائی ہے۔ اس ذیل میں ارشاد ہوا ہے :

الا من تاب وآمن وعمل عملا صالحاً فاولئك يبدل الله سيئاتهم حسنات وكان الله غفورا رحيما۔ ومن تاب وعمل صالحاً فانه يتوب الى الله متابا (الفرقان ٧٠-٧١)

مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ درحقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔

دین میں کسی عمل کو جانچنے کا معیار اس کا ظاہری پہلو نہیں ہے بلکہ اس کا نفسیاتی نتیجہ ہے۔ ہر دینی عمل کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے۔ مگر کسی عمل سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اس عمل کے دوران آدمی کے اندر کس قسم کا احساس جاگا۔ وہی عبادت عبادت ہے جس میں مشغول ہو کر آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہو۔ اگر عبادت کر کے بڑائی کی نفسیات پیدا ہو جائے تو ایسی عبادت انعام کے بجائے مواخذہ کا سبب بن جائے گی۔

انسان فرشتہ نہیں ہے، انسان کے اندر نفس کی کمزوریاں موجود ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان بار بار اس دنیا میں پھسل جاتا ہے۔ اس سے بار بار غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر انسان قصداً کوئی گناہ کرے اور گناہ کر کے اس پر قائم رہے تو وہ اللہ کی نظر میں سخت مجرم ہے۔ وہ قیامت کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ دوسرا انسان وہ ہے جس سے طبعی کمزوری کی بنا پر غلطی ہو جائے۔ مگر غلطی کے بعد وہ فوراً متنبہ ہو۔ اس کے اندر شرمندگی اور توبہ کا احساس جاگے۔ وہ خدا سے معافی مانگے اور آئندہ کے لیے غلطی نہ کرنے کا عزم کرے تو ایسا آدمی اللہ کی نظر میں قابلِ انعام بن جاتا ہے۔

اس کی غلطی اگرچہ ابتداءً غلطی تھی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ توبہ اور انابت میں ڈھل گئی۔ اس نے آدمی کے اندر ایمان اور عمل صالح کا نیا احساس جگا دیا۔ یہی وہ برائی ہے جو بظاہر برائی ہونے کے باوجود خدا کے یہاں نیکی کے خانہ میں لکھ دی جاتی ہے کیونکہ وہ آدمی کو ایک نیکی تک پہنچانے کا سبب بنی۔

جب بگاڑ آتا ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا ملنا نہ مسلمانوں کی تمناؤں پر ہے اور نہ یہود کی تمناؤں پر۔ جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا (لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ، نساء ۱۲۳) یعنی خدا نے جو دنیا بنائی ہے وہ عدل کے اصول پر بنائی ہے۔ یہ عدل کا اصول ہے ـــــــ عمل اور انجام میں مطابقت۔ یہاں کسی کے ساتھ نہ ظلم ہے اور نہ جانب داری۔ یہاں ہر ایک کو ٹھیک وہی ملنے والا ہے جو اس نے کیا ہے۔ نہ کئے پر کسی کے لئے سزا نہیں اور کئے پر کوئی چھوڑا جانے والا نہیں۔ ایسی ایک دنیا میں اگر کوئی گروہ یہ سمجھے کہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جائے گا' اس کو اس ترازو پر نہیں تولا جائے گا جس ترازو پر دوسرے لوگ تولے جانے والے ہیں تو یہ صرف اس کی جھوٹی تمنائیں ہیں اور محکم قوانین پر مبنی اس خدائی دنیا میں کسی کی جھوٹی تمناؤں کے لئے یقینی طور پر کوئی جگہ نہیں۔

کسی گروہ کو آسمانی کتاب کا حامل بنانا اس کو دیگر قوموں کے مقابلہ میں خصوصی مقام دینا ہے۔ اس معنی میں پہلے یہود کو افضل الامم (بقرہ ۴۷) کہا گیا تھا۔ اور اسی معنی میں امت محمدی کو خیر الامم (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ جو گروہ اس مقام افضلیت پر کھڑا کیا جائے اس پر دنیا میں خدا کے خصوصی انعامات ہوتے ہیں اور آخرت میں اس کے لئے جنت کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ انعامات کسی نسل یا قوم سے تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ تمام تر کارکردگی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں اس گروہ کے افراد اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ یہیں سے امانی (جھوٹی تمناؤں) کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خواہ عمل کریں یا نہ کریں خدا کے وعدے ان کے حق میں ضرور پورے کئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی کتاب کی حامل کسی قوم کی صحت کیا ہے اور اس کا مرض کیا۔ اس کو اگر آج کل کی زبان میں بیان کرنا ہو تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ایسی قوم جب صحیح ایمانی حالت پر ہو تو اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج ہوتا ہے اور حالت مرض میں ہو تو خوش خیالی کا۔

آخرت کی سرفرازیاں جن لوگوں کو جھوٹی تمناؤں اور خوش خیالیوں کی بنیاد پر مل رہی ہوں وہ عین اپنی نفسیات کی بنا پر دنیا کے معاملات میں بھی خوش خیال ہو جاتے ہیں۔ ان کی سیاست خوش خیالی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی فرضی کارروائیوں سے حیرت انگیز طور پر بڑے بڑے نتائج کی امید کرنے لگتے ہیں۔ وہ حقیقتوں کی اس دنیا میں ایک خوش خیال گروہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

تقویٰ نہ کہ شور وغل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مکہ کے مشرکین مسجد حرام کے والی بننے کے لائق نہیں۔ اس کے والی تو صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہیں۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور ان مشرکین کی نماز کعبہ کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔ پس عذاب چکھو اپنے انکار کے سبب سے (انفال ۳۵-۳۴)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکہ کے مشرکین خانہ کعبہ میں جمع ہو کر صرف سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، اس کے سوا کچھ اور نہیں کرتے تھے۔ وہ دراصل اپنے دعوے کے مطابق ابراہیم اور اسماعیل کی عبادت کرتے تھے۔ البتہ انھوں نے اس عبادت پر تالیوں اور سیٹیوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہ چیزیں ان کی کل عبادت نہ تھیں بلکہ ان کی اصل عبادت کا جز تھیں۔ جیسا کہ آج بھی گمراہ فرقوں اور قوموں میں عبادت کے ساتھ ساتھ تالی پیٹنے اور گھنٹی اور ناقوس بجانے کا رواج ہے اور ان چیزوں کو وہ اصل عبادت کا ضروری حصہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے عبادتی مراسم کو تالی اور سیٹی کے تابع کر دیا اور تہدیدی انداز میں کہا کہ انھوں نے سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کو عبادت سمجھ لیا ہے۔ حالاں کہ عبادت تقویٰ کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کا شور وغل کرنے کا۔

مشرکین مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کعبہ کا طواف کرتے تو نیم برہنہ ہو جاتے۔ وہ کعبہ کے گرد اسی طرح گھومتے تھے جس طرح آج کوئی حاجی گھومتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ کرتے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں باندھ کر اس میں پھونکتے جس سے سیٹی کی سی آواز نکلتی (انھم کانوا یطوفون بالبیت عراۃ دھم مشبکون بین اصابعھم یصفرون فیھا ویصفقون، تفسیر نسفی) اسی طرح جب وہ نماز پڑھتے تو وہ بھی عام نمازیوں کی طرح سجدہ میں جاتے مگر اس وقت وہ اپنے رخسار زمین پر رکھ دیتے اور اسی کے ساتھ تالیاں بجاتے اور کلمات عبادت کی ادائگی کے ساتھ دوسری آوازیں نکالتے (انھم کانوا یضعون خدودھم علی الارض ویصفقون ویصفرون، تفسیر ابن کثیر)

موجودہ زمانہ میں عبادتی مواقع پر جس طرح لاؤڈ اسپیکروں کا شور بلند ہوتا ہے اور جس طرح دھوم دھام کے ساتھ دینی تقریبات منائی جاتی ہیں ان پر بھی قرآن کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔ ان مواقع پر اگرچہ حسب قاعدہ کچھ عبادتی افعال بھی کئے جاتے ہیں مگر ان کی عبادت پر ان کے ہنگامے اس طرح غالب رہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ایک دردمند شخص کہہ اٹھے گا:

"انھوں نے شور وغل کو اسلام سمجھ لیا ہے"

گراوٹ کا آخری درجہ

قرآن میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے ان کی بدعملی کی سزا میں ان کو مسخ کر دیا —— "کہو کیا میں ان لوگوں کے بارے میں بتاؤں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں کے انجام سے بھی زیادہ برا ہے۔ وہ جن پر خدا نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔ اور جن میں سے بندر اور سور بنادئے گئے (مائدہ ۶۰)

بندر اور سور بنانے سے مراد بندر اور سور کی شکل کا بنانا نہیں ہے بلکہ بندر صفت اور سور صفت بنانا ہے (قال مجاھد: مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ، تفسیر ابن کثیر، جلد اول صفحہ ۷۳) جب آدمی خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتا اور خدا کی تعلیمات سے نصیحت نہیں پکڑتا تو دھیرے دھیرے وہ انسان کے درجہ سے گر کر حیوان کے درجہ پر آجاتا ہے۔ اب اس کی سوچ حق اور ناحق کے اعتبار سے کام نہیں کرتی بلکہ طبعی تقاضوں اور حیوانی خواہشات پر چلنے لگتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کو حیوان بن جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سور کی صفت کیا ہے۔ ستھری چیزوں کو چھوڑ کر گندی چیزوں کو اپنی خوراک بنانا۔ سور صفت انسان وہ ہے جس کو صالح فکر اپیل نہ کرے۔ البتہ فاسد فکر سامنے آئے تو اس کی طرف تیزی سے دوڑ پڑے۔ جائز عمل میں اس کو لذت نہ ملے۔ البتہ ناجائز اعمال میں وہ خوب ذوق شوق کے ساتھ حصہ لیتا ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے —— "ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کی راہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اس کو اپنالیں (اعراف ۱۴۶)

جو لوگ بگاڑ کے اس درجہ کو پہنچ جائیں ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ان کے سامنے قرآن و سنت کا طریقہ پیش کیا جائے تو وہ ان کے ذہن کا جز نہیں بنتا البتہ دنیادار لیڈروں کے طریقے انھیں تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دینی سیاست اختیار کرنا ان کو مشکل معلوم ہوتا ہے البتہ لادینی سیاست کے لئے وہ خوب جوش و خروش دکھاتے ہیں۔ خاموش تعمیری پروگرام میں انھیں دلچسپی نہیں ہوتی البتہ اکھیڑ پچھاڑ کے پروگرام میں حصہ لینے کے لئے وہ فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی اصلاح کا پیغام انھیں متاثر نہیں کرتا البتہ دوسروں کے خلاف شور وغل کرنا ہو تو ان کی بھیڑ کی بھیڑ اس کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ صبر کا طریق کار انھیں بزدلی معلوم ہوتا ہے اور مشتعل ہو کر لڑ جانے کو وہ بہادری سمجھتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا ان کے نزدیک بے عزتی کے ہم معنی ہوتا ہے اور یک طرفہ طور پر دوسرے کو الزام دینا انھیں کمال دکھائی دیتا ہے۔ محبت کا انداز اختیار کرنا ان کو بے فائدہ نظر آتا ہے اور نفرت کے طریقے پر چلنا ہو تو اس کی طرف وہ اتنی تیزی سے لپکتے ہیں گویا اسی میں سارے مسائل کا حل چھپا ہوا ہے۔ اصولی نقطۂ نظر ان کے سامنے لایا جائے تو وہ ان کو بے کار دکھائی دے گا البتہ قومی طرز کی باتیں کی جائیں تو وہ ان کو اس طرح لیں گے جیسے ان کو لذیذ ذہنی غذا ہاتھ آگئی ہے۔ ان کو ایسے واقعات سے دلچسپی نہیں ہوتی جس میں تعمیری سبق ہو۔ البتہ ایسی کہانیوں کو سننے کے وہ بہت مشتاق رہتے ہیں جو ان کی تخریب پسندی کی غذا بن سکتی ہو۔

یہ ایک کی بے غرضی کا امتحان ہے اور دوسرے کی فیاضی کا

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیماہم لا یسئلون الناس الحافا وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم ۔ الذین ینفقون اموالہم باللیل والنہار سرا وعلانیۃ فلہم اجرہم عند ربہم ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون (بقرہ ۲۷۳ - ۲۷۴)

دینا ہے ان حاجت مندوں کو جو گھر گئے ہیں اللہ کی راہ میں ۔ چل پھر نہیں سکتے زمین میں ۔ ناواقف ان کو غنی خیال کرتا ہے ۔ تم ان کے چہرہ سے ان کو پہچان لوگے ۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے ۔ اور جو مال تم خرچ کروگے وہ اللہ کو خوب معلوم ہے ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال رات دن کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ۔ ان کے لئے نہ ڈر ہے نہ غم ۔

انفاق کے حکم کے ذیل میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے وسعت دی ہے ان کے لئے خرچ کی سب سے بڑی مد وہ لوگ ہیں جو دین کی خدمت میں لگنے کی وجہ سے ایسا گھر گئے ہیں کہ معاشی جدوجہد کے لئے وقت نہیں نکال سکتے ۔

ایسے لوگوں کو خدا کا دین ایک طرف اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح معاش کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ کرسکیں ۔ دوسری طرف یہی دین ان کے اندر توکل علی اللہ کا جو مزاج پیدا کرتا ہے، وہ اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی یا دینی ضرورتوں کے لئے ہر ایک سے کہتے پھریں ۔ ان کی متوکلانہ باتیں اکثر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہیں ۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ مستغنی ہیں، ان کو پیسہ کی ضرورت نہیں ۔

تاہم وہ لوگ جن کو اللہ نے ایمان کی روشنی عطا کی ہے، وہ ظاہری پردوں کو پھاڑ کر خدا کے ان بندوں کو دیکھ لیتے ہیں ۔ وہ جان لیتے ہیں کہ یہ دنیا امتحان کا مقام ہے ۔ یہاں "لینے والوں" کی بے غرضی کا امتحان ہو رہا ہے اور "دینے والوں" کی فیاضی کا امتحان ۔ ایک سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے آپ کو دین کی خدمت میں اس طرح جھونک دے کہ اس کے پاس پیسہ کمانے کا وقت نہ رہے اور دوسرے سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے خرچ کی سب سے بڑی مد اپنی ذات کو نہیں بلکہ خدا کے دین کو سمجھے اور اپنی کمائی کو اس قسم کے خادمان دین پر قربان کردے ۔ ایک کا کمال یہ ہے کہ اپنی ضرورت مندی کو چھپائے اور دوسرے کا کمال یہ ہے کہ بظاہر چھپے ہونے کے باوجود اس کی ضرورتوں کو جان لے ۔ ایک اگر اپنی تمام توانائیوں سمیت خدا کی طرف دوڑ رہا ہو تو دوسرا خدا کی طرف دوڑنے والوں کے پیچھے اپنا سرمایہ لئے پھرتا ہو ——— جن لوگوں کے رات اور دن، جن کی خلوتیں اور جلوتیں اس طرح اللہ کے لئے وقف ہو جائیں، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آکر خدا کو دیکھ رہے ہیں ۔ وہ اپنی ضرورتوں سے اوپر اٹھ کر دین کی ضرورتوں کو جانتے ہیں ۔ ایسے لوگوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی مالی قربانیوں کا بے حساب گنا بدلہ دے گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہر قسم کے اندیشوں سے بے خوف ہو کر خوشیوں کی لازوال دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے ۔

ہم ان کو اچھا ٹھکانا دیں گے

والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الاخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون۔ الذین صبروا وعلیٰ ربھم یتوکلون (نحل ۴۲)

اور جنھوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کے واسطے ہجرت کی ان کو ہم دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش ان کو معلوم ہوتا۔ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

حق کی بے آمیز دعوت جب بھی اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ اس کے سخت مخالف ہو جاتے ہیں جو ناحق کو حق بتا کر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہوں۔ ایسی دعوت ان لوگوں کے لئے اپنی حیثیت کی نفی کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ وہ حق کی دعوت کو دبانے اور کچلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف شوشے نکال کر اس کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ اس کی جڑ اکھاڑنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ وہ عوام کو اس سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اس کے خلاف جارحانہ اقدام سے بھی باز نہیں آتے۔ ان مظالم کے مقابلہ میں حق کے داعیوں کے پاس جو سہارا ہوتا ہے وہ صرف صبر اور توکل ہے۔ یعنی اللہ کی خاطر ہر تکلیف کو برداشت کرنا اور اس امید پر اپنا سفر جاری رکھنا کہ اللہ ضرور ان کی مدد فرمائے گا۔ مخالفین کے پاس مادی اسباب ہوتے ہیں اور ان کے پاس خدا کے وہ وعدے ہوتے ہیں جو اس نے حق کے داعیوں سے اپنی کتاب میں کئے ہیں۔ مخالفین کے پاس دنیوی طاقتیں ہوتی ہیں اور ان کے پاس یہ یقین کہ اللہ کا ایک غیبی نظام ہے اور یہ نظام ضرور ان کی مدد کرے گا۔

حق کے داعیوں کو جب اپنے ابتدائی مقام پر کام کرنا ناممکن بنا دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے ایک مُبَوَّءٌ (ٹھکانا) فراہم کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسی متبادل جگہ جو ان کے لئے دعوتی مرکز کا کام دے۔ جہاں اپنے قدم جما کر وہ زیادہ موثر انداز میں اپنی دعوتی مہم کو جاری رکھ سکیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مکہ میں یہ مبوء دیا گیا (حج ۲۶) یہود کے لئے شام و فلسطین کی زمین کی مبوء بنا دیا گیا (یونس ۹۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مدینہ کی صورت میں مبوء فراہم کیا گیا (حشر ۹)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مہربان باپ اپنی جیب سے پیسہ نکالتا ہے اور اپنے چھوٹے بچہ کے ہاتھ میں پکڑا کر کہتا ہے کہ یہ فلاں آدمی کو دے دو۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوتِ حق کے لئے مبوء کی فراہمی کا ہے۔ یہ اگرچہ ایک خدائی عطیہ ہے مگر ظاہری طور پر کچھ انسانوں کے ذریعہ اس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس عظیم خوش قسمتی کے لئے چنتا ہے کہ اس کو دعوت حق کے ساتھ تعاون کرنے والوں میں لکھے تو وہ اس کے دل میں اس کام کی اہمیت ڈال دیتا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے قبائل نے جس طرح باہر کے مسلمانوں کو ٹھکانا دیا اور اپنی جائدادیں اور مکانات ان کے لئے پیش کر دئے وہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہ عظیم قربانی اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر ان کے دلوں کو اس طرف مائل کر دے۔

ایک آیت

قرآن میں اہل نفاق کی ایک خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کا معاملہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے: اور لوگوں میں کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالاں کہ وہ بالکل ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو۔ اور وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے۔ لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ (ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا ومایخدعون إلاّ انفسھم ومایشعرون، بقرہ ۸-۹) اس آیت کی تفسیر ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتخادع اللہ فانہ من یخادع اللہ یخدعہ اللہ، ونفسہ یخدع لو یشعر قالوا یارسول اللہ وکیف یخادع اللہ قال تعمل بما امرک اللہ بہ وتطلب بہ غیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ کو دھوکا نہ دو کیوں کہ جو اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو دھوکا دیتا ہے۔ اور وہ شخص خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اگر وہ جانے۔ لوگوں نے کہا اے خدا کے رسول، کوئی شخص خدا کو کیسے دھوکا دیتا ہے۔ فرمایا: تم وہ عمل کرو جس کو کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کے ذریعہ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طلب رکھو۔

ایک آدمی بظاہر اسلامی کام اور دینی عمل میں مشغول نظر آتا ہے۔ مگر اس اسلامی کام اور اس دینی عمل میں وہ اس لیے مشغول ہے کہ اس کے ذریعہ اس کو شہرت وعزت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا شخص گویا خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا اصل مقصود تو دنیوی منافع ہیں مگر بظاہر وہ اپنے آپ کو دین کے خادم اور اسلام کے مجاہد کے روپ میں پیش کر رہا ہے۔

ایک آیت

رزین نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک روز پانی مانگا۔ ان کے پاس ایک پیالہ میں پانی لایا گیا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ اچھا ہے۔ مگر مجھے قرآن کی آیت (الاحقاف ۲۰) یاد آتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم اپنی اچھی چیزیں دنیا میں لے چکے۔ اب آخرت کی اچھی چیزوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ وہی نہ ہو۔ حضرت عمر نے یہ کہا اور پیالہ پیے بغیر واپس کر دیا۔ (التفسیر المظہری)

مذکورہ آیت کے تحت اکثر تفسیروں میں اس طرح کے واقعات درج ہوتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لے لیا گویا دنیا کی طیبات کو استعمال کرنا مطلق طور پر آخرت کی طیبات سے محرومی کے ہم معنی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک خاص موقع پر شہد کا شربت نہ پینا محض شدتِ تاثر کی بنا پر تھا۔ وہ شرعی حکم کے طور پر نہ تھا بلکہ تقویٰ کے احساس کے تحت تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک متقی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ (بعض اوقات) ایسی چیز کو بھی چھوڑ دے جس میں ہرج نہیں ہے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ شاید اس میں ہرج ہو (لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا بأس به حذراً لما به بأس)

حضرت عمر کے مذکورہ فعل کو اسی حدیث کے تحت دیکھنا چاہیے۔ یہ واقعہ ان کی بڑھی ہوئی متقیانہ حساسیت کی بنا پر پیش آیا نہ اس لیے کہ دنیا کی اچھی چیزیں اہلِ ایمان کے لیے قابلِ ترک ہیں۔

اگر دنیا کی اچھی چیزوں کو مطلقاً قابلِ ترک سمجھا جائے تو یہ نظریہ قرآن کی ان آیتوں سے ٹکرا جائے گا جن میں طیب اور پاک چیزوں کو مطلق طور پر اہل ایمان کے لیے جائز بتایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ارشاد ہوا ہے کہ کہو، اللہ کی زینت کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے کی طیب (پاک) چیزیں۔ کہو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انھیں کے لیے ہوں گی (الاعراف ۳۲)

اصلی معیار

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم کے یہاں جب حضرت مسیحؑ کی ولادت ہوئی اور وہ اشارۂ ربانی کے مطابق بچہ کو لے کر یہودیوں کی بستی میں آئیں تو یہودی علمار ان کے گرد جمع ہوگیے۔ انھوں نے کہا کہ اے مریم، تم نے بڑا طوفان کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی (مریم ۲۷ - ۲۸)

یہودی علمار کے اس کلام سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست اور حق پسند لوگ تھے۔ وہ لوگوں کو برائی سے روکنے والے اور انھیں نیکی کا حکم دینے والے تھے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کے یہاں خدا پرست اور حق پسند مانے نہیں گیے، اور نہ انھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والا قرار دیا گیا۔ اس کے بجائے وہ خدا کی نظر میں ملعون ٹھہرے اور عذاب کے مستحق قرار پاتے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "حضرت مریم" کے خلاف تقریر کرنے میں تو حق پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر جب خود اپنے آپ کو حق پسند بنانے کا وقت آیا تو وہ اپنے آپ کو حق پسند بنانے پر راضی نہ ہوسکے۔ دوسرے کے معاملہ میں وہ بظاہر مصلح تھے، مگر اپنی ذات کے معاملہ میں وہ سرکش اور مفسد بن گیے۔

ان کی ذات کا یہ امتحان اس وقت ہوا جب کہ حضرت مسیح، جو کہ ابھی نومولود بچہ کی حیثیت سے ماں کی گود میں تھے، اچانک معجزۂ الٰہی کے تحت بول پڑے اور اپنے بارہ میں سچے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ اس معجزاتی واقعہ نے حضرت مریم کی برأت اور حضرت مسیح کی نبوت دونوں کو آخری حد تک ثابت کر دیا۔ مگر یہودی علمار نے نہ حضرت مریم کی پاک دامنی کا اعتراف کیا اور نہ حضرت مسیح کی نبوت کا۔

دوسروں کے سامنے تقریر کرنے میں مصلح اور حق پسند ہونا کسی کو مصلح اور حق پسند نہیں بناتا۔ مصلح اور حق پسند صرف وہ ہے جو اپنی ذات کے معاملہ میں مصلح اور حق پسند ثابت ہو۔

جب عقل چھین لی جائے

کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی کہ "خدایا! میری قوم سے سب کچھ چھیننا مگر عقل نہ چھیننا"۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "اے موسیٰ! جب ہم کسی سے چھیننے والے ہوتے ہیں تو اس کی عقل ہی تو سب سے پہلے چھینتے ہیں"۔

اللہ کا یہ فیصلہ جب کسی قوم پر نافذ ہوتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام کارروائیوں پر بے عقلی چھا جاتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس طرح بولتا ہے جیسے اس کو یہ ابتدائی اصول بھی معلوم نہ ہو کہ آدمی کو چاہئے کہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے۔ اس کے مقررین ایسی تقریریں کرتے ہیں جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو کہ تقریر کا مطلب ہے بامعنی کلام سنانا نہ کہ کچھ الفاظ فضا میں بکھیرنا۔ اس کے عمل کرنے والے اس طرح عمل کرنے لگتے ہیں جیسے ان کو پتہ ہی نہ ہو کہ عمل کا مطلب ہے کوئی نتیجہ خیز کام کرنا نہ کہ محض لاحاصل اکھیڑ پچھاڑ کرنا۔ اس کے لیڈر ایسی سیاستیں چلاتے ہیں جیسے وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ سیاست ایسی کوشش کا نام ہے جو سماج میں اصلاح لائے نہ کہ فساد اور بگاڑ پیدا کرے۔ اس کے اہل قلم ایسی تحریریں لکھتے اور چھاپتے ہیں جیسے ان کو اس بات کا شعور ہی نہ ہو کہ ایک قابل مطالعہ چیز پیش کرنے کا نام لکھنا ہے نہ کہ کچھ سطریں تیار کرکے چھاپ دینا۔ وہ اپنے حقوق کے لئے ایسی مطالباتی مہمیں چلاتے ہیں جیسے وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہوں کہ عمل سے استحقاق پیدا ہوتا ہے نہ کہ گدھے کی طرح چیخنے چلانے سے ——— ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے مشاہدہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں مگر سنی ہوئی بات کو اس طرح دہراتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں سنا۔ وہ پڑھتے ہیں مگر پڑھی ہوئی چیز پر اپنا ردعمل اس طرح ظاہر کرتے ہیں جیسے انھوں نے نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ ان کا حال جانوروں کا سا ہو جاتا ہے کہ جو بظاہر آنکھ اور کان اور دل رکھتے ہیں۔ مگر ان کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے:

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم الغفلون

(اعراف ۱۷۹)

ان کے دل ہیں جن سے وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ نہیں دیکھتے۔ ان کے کان ہیں جن سے وہ نہیں سنتے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ غافل لوگ ہیں۔

جب کوئی قوم اس سطح پر پہنچ جائے تو کوئی دلیل اس کو دلیل نظر نہیں آتی۔ دلیل کا وزن آدمی اپنی عقل سے سمجھتا ہے اور عقل کو کھو کر وہ پہلے ہی اس سے محروم ہو چکا ہے۔ کھلے کھلے دلائل کے مقابلہ میں وہ ایسے الفاظ کا سہارا پالے گا جو اس کے اپنے ذہن سے باہر اپنی کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں۔ اس کے منصوبوں کا غلط ہونا تجربات سے بالکل ثابت ہو رہا ہوگا مگر بدترین ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ اسی ناقص منصوبہ کو از سر نو دہرانے کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہ آئے گی، کیوں کہ کسی بات کی معقولیت کو سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ البتہ غیر معقول بات کو وہ خوب سمجھے گا کیوں کہ اس کو سمجھنے کے لئے بے عقلی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ ■

یہ یہودیت ہے

مفسرِ قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ مائدہ (آیت ۲۷) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ (اس کے مقابلہ میں) متقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اس کے لئے یہ ملعون ہمیشہ مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف ازراہ بغض و حسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلہ سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل و سزا کی سازشیں کرنا یہ قوم (یہود) کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابناء اللہ و احباءہ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں صفحہ ۱۴۴)

مولانا عثمانی کا مذکورہ اقتباس ایک اہم قرآنی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ قرآن میں یہود کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ یہ ملعونیت نسل اور قوم کی بنا پر نہیں ہے بلکہ کردار کی بنا پر ہے۔ مزید قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق صرف یہود سے نہیں ہے۔ نام نہاد مسلمان اگر اسی قسم کے کردار کا ثبوت دیں تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہود کے لئے مقدر کیا گیا ہے (لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءًا یجز بہ، النساء ۱۲۳)

یہود کا ایک کردار، قرآن کے مطابق یہ ہے کہ آدمی کا یہ حال ہو کہ شریر قسم کے لوگوں سے معاملہ پڑے تو وہ بزدل بن جائے اور سیدھے سادے نیک لوگوں کے لئے وہ بھیڑیا ثابت ہو۔ خدا کا خوف اس کے ہاتھ اور پاؤں کو نہ روکے مگر جب معاملہ طاقت ور قسم کے لوگوں سے ہو تو وہ فوراً درست ہو جائے۔ حق اور انصاف کی بات اس پر اثر انداز نہ ہو مگر ڈنڈے کی منطق سامنے ہو تو وہ فوراً راہ راست پر آجائے۔

اس قسم کا کردار یہودی کردار ہے۔ وہ خواہ غیر یہودیوں سے ظاہر ہو، اس کا انجام خدا کے یہاں وہی ہے جو معروف یہودیوں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

انسان کو رب بنانا

قرآن میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار (علمار) اور رہبان (مشائخ) کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں صرف ایک معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں (التوبہ ۳۱)

امام احمد اور امام ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ انھوں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کی عبادت تو کبھی نہیں کی۔ آپ نے فرمایا:

بلیٰ اِنهم حرموا علیهم الحلال واحلوا لهم الحرام فاتبعوهم فذلك عبادتهم ایاهم (تفسیر ابن کثیر)	ہاں، ان کے علمار و مشائخ نے ان پر حلال کو حرام کیا اور حرام کو ان کے لئے حلال کیا۔ تو انھوں نے ان کی پیروی کی۔ ان کا یہی فعل علمار و مشائخ کی عبادت ہے۔

عبادت کی یہ قسم کوئی انوکھی نہیں۔ اس کو آج بھی آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارا ایک قائد یا ایک بزرگ کسی شخص سے بگڑ جائے اور اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرے تو اس کے تمام معتقدین اس میں اس کا ساتھ دیں گے۔ حالانکہ خدا کی شریعت میں یہ حرام ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف انتقامی کارروائی کرے۔ اس کے بعد اس بزرگ کے تمام معتقدین اس کو جائز سمجھ لیں گے کہ اس شخص کو ہر طریقہ سے ستائیں۔ اس کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی باتیں مشہور کریں۔ اس شخص کے بارے میں خدا کے ان تمام احکام کو بھول جائیں جو انسان کے حقوق یا مسلمان کے احترام کے بارے میں دئے گئے ہیں۔ ایسی صورت پیش آنے کے بعد وہ اپنے بزرگ کو خوش کرنے والے دین پر چلیں گے نہ کہ خدا کو خوش کرنے والے دین پر۔ اس کے لئے وہ حرام کو حلال کریں گے اور حلال کو حرام بنائیں گے اور انھیں کبھی خیال تک نہ آئے گا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب بنانے کی غلطی کر رہے ہیں۔

کسی بزرگ سے آدمی کو اتنا شدید تعلق کیوں ہوتا ہے کہ اس کی خاطر وہ خدا کے احکام تک کو بھول جاتا ہے، اس کا راز اداراتی مذہب (Institutionalised Religion) ہے۔ اداراتی مذہب دراصل مذہب کے گدی بن جانے کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح جائداد کے وراثتی نظام میں ایک شخص محض اس لئے ایک بڑی جائداد کا مالک بن جاتا ہے کہ وہ اس کو وراثت میں مل گئی ہے۔ اسی طرح اداراتی مذہب میں یہ ہوتا ہے کہ ماضی سے بزرگوں کی جو ایک گدی چلی آرہی ہے، بس اسی کی اصل اہمیت ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس گدی پر بیٹھ جائے وہ مذکورہ گدی کا گدی نشین ہونے کی وجہ سے ان تمام کرامات و اوصاف کا حامل سمجھ لیا جاتا ہے جو روایتی طور پر اس گدی کے بارے میں ماضی سے چلی آرہی ہیں۔

ایک آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ــــــ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا گمان ہے کہ وہ قرآن پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر بہت دور کر دینا چاہتا ہے۔ (النساء ۶۰)

کچھ لوگ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ: "یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو۔ اور وہ نظام عدالت جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے۔ خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔" اس تشریح کے بعد فوراً یہ لوگ دوسرا نتیجہ یہ نکال لیتے ہیں کہ مسلمان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مشرکانہ اور کافرانہ نظام حاکمیت کو توڑے اور اسلام کی بنیاد پر حاکمیت کا نظام قائم کرے تاکہ اس کے لئے اپنے معاملات میں خدائی قانون کے مطابق فیصلہ لینا ممکن ہو سکے۔

اس قسم کے "انقلابی" نظریہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قرآن کے ایک سادہ اور عام حکم کو غلط طور پر سیاسی معنی پہنانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے انفرادی دینی تقاضوں کو بیان کر رہی ہے نہ کہ مذکورہ معنی میں اجتماعی انقلاب کا سیاسی سبق دے رہی ہے۔ ہندستان کے پس منظر میں اس آیت کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

آج ہر جگہ یہ صورت حال ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آپسی جھگڑے برپا ہیں۔ کوئی بستی اور کوئی محلہ اس قسم کے باہمی جھگڑوں سے خالی نہیں ہے۔ ان جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے مسلمانوں کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک پہلی فرصت میں اپنے جھگڑے کو ملک کی عدالت میں لے جاتا ہے جس کو وہ اپنے عقیدے کے مطابق کافر اور مشرک عدالت سمجھتا ہے۔ مگر اس سے بے پرواہ ہو کر ہر ایک انھیں عدالت کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اور اس میں اپنے وقت اور اپنے مال کا بہترین حصہ خرچ کر رہا ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت اسی روش کے خلاف مسلمانوں کو تنبیہہ کر رہی ہے۔ اس میں ان لوگوں پر نکیر ہے جو خدا کی کتاب کے آگے نہیں جھکتے البتہ طاقت کے آگے جھک جاتے ہیں خواہ وہ طاغوت ہی کیوں نہ ہو۔

ذاتی عینک

جب آدمی کے ذہن پر کسی چیز کا شدید غلبہ ہو تو اس کو ہر چیز میں وہی چیز نظر آتی ہے۔ ایک شخص بھوکا ہے اور روٹی کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اس سے اگر پوچھا جائے کہ دو اور دو مل کتنے ہوتے ہیں تو وہ کہے گا کہ چار روٹیاں۔ حتیٰ کہ وہ سورج اور چاند کی طرف دیکھے گا تو ان کی گولائی میں بھی اس کو روٹی کی صورت دکھائی دے گی۔ اسی حقیقت کو نظیر اکبر آبادی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے ۔۔۔ بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

یہی صورت دین میں بھی پیش آتی ہے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے:

یا ایّھا الرسول بلّغ ما انزل الیك من ربّك و ان لم تفعل فما بلّغت رسالته و اللّٰه یعصمك من الناس

اے رسول جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کی رسالت نہیں پہنچائی اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

شیعہ حضرات کے ذہن پر حضرت علی کی خلافت کا غلبہ ہے۔ وہ اسی کو سب سے بڑا دینی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب یہ آیت پڑھی تو فوراً ان کے ذہن نے کہا کہ اس آیت میں حضرت علی کی خلافت بلافصل کا بیان ہے۔ شیعہ علماء کا کہنا ہے کہ اس آیت میں جس چیز کی تبلیغ کا حکم ہے وہ حضرت علی کی خلافت ہے۔ آپ کو خدا نے وحی کی کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ میرے بعد علی ابن ابی طالب سلطنت اسلامی کے خلیفہ ہوں گے۔ ان کے نزدیک اس آیت میں عام احکام دین کی تبلیغ مراد نہیں ہے بلکہ علی کی خلافت کی تبلیغ مراد ہے۔

اسی طرح ہر آدمی کوئی نہ کوئی خیال اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اپنا خیال قرآن کے صفحات میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن میں لکھا ہوا ہو کہ "کرو"، تو وہ اپنی طرف سے لفظ بڑھا کر سمجھ لیتا ہے کہ فلاں کام کرو۔

یہی مثال ان لوگوں کی ہے جن کے ذہن میں یہ بسا ہوا ہے کہ اسلام کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ وہ قرآن میں پڑھتے ہیں کہ دین قائم کرو (اقیموا الدین) ان کا ذہن ان الفاظ سے فوراً یہ معنی نکال لیتا ہے کہ دینی حکومت قائم کرو۔ حالانکہ یہاں دین کا لفظ اجتماعی نظام کے معنی میں نہیں ہے بلکہ انفرادی تقاضوں کے بارے میں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــــ ایمان اور اخلاص کی زندگی اختیار کرو۔ اپنی ذاتی زندگی میں خدا کی مرضی پر پوری طرح قائم ہو جاؤ۔

اور وہ غالب ہو گئے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان لانے والو، تم لوگ اللہ کے مددگار بنو جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حوارین سے کہا کہ کون اللہ کے لئے میرا مددگار بنتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ منکر ہوگیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی اور وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴)

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ مومنین مسیح بہت تھوڑے اور کمزور تھے اور مخالفین بہت زیادہ اور طاقت ور تھے۔ چنانچہ اس وقت عملاً جو ہوا وہ یہ کہ حضرت مسیح کی دعوتی جدوجہد کی تکمیل کے بعد یہود کے منکر طبقہ نے آپ کے ساتھیوں کو دبالیا اور بزعم خود پیغمبر کو سولی پر چڑھا دیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ فاصبحوا ظاہرین کا واقعہ کب اور کیوں کر پیش آیا۔

قصہ یہ ہے کہ وقتی طور پر تو منکرین مسیح کا گروہ غالب آگیا۔ انھوں نے حضرت مسیح کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی مگر آپ کو خدا نے عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا۔ مگر خدا کا قانون یہ ہے کہ اتمام حجت کے بعد انکار کو وہ معاف نہیں کرتا۔ چنانچہ جو کام مسیح کے ابتدائی مومنین نہ کر سکے تھے اس کو دوسروں کے ذریعہ لیا گیا۔ ۷۰ء میں رومی شہنشاہ تیتس نے یروشلم پر حملہ کیا اور مخالفین مسیح (یہود) میں کچھ کو ہلاک کیا اور کچھ کو ذلیل کر کے ان کے مرکز سے نکال دیا جس کے بعد وہ تتر بتر ہو گئے۔ دوسری طرف مسیح کے ماننے والوں (نصاریٰ) کو یہ موقع ملا کہ وہ مسیحیت کے مبلغ بن کر اطراف کے ملکوں میں پھیلے۔ وہ رومی شہنشاہیت میں داخل ہوتے۔ انھوں نے اپنی تبلیغ سے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنایا۔ توسیع مسیحیت کا یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۴-۳۳۷ء) نے مسیحیت قبول کرلی۔ یہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا زمانہ تھا۔ رومی شہنشاہ کے قبول مسیحیت کے بعد اس کی پوری مملکت میں مشرق سے مغرب تک مسیحیت پھیلنے لگی۔ حضرت مسیح کے رفع کے تین سو سال بعد یہ حال ہوا کہ رومی شہنشاہیت کے اکثر باشندے مسیحی بن گئے۔ یہاں تک کہ مسیحیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ یہودی مسیحی قوموں کے محکوم ہوگئے، حتیٰ کہ موجودہ اسرائیل بھی۔

مردہ پرستی

قدیم مصر میں جب وہاں کے سرداروں نے حضرت موسیٰ کا انکار کر دیا تو خود ان کے درمیان کا ایک شخص (رجل مومن) اٹھا جس نے اپنی قوم کو دردمندانہ انداز میں نصیحت کی۔ اس رجل مومن کی تقریر قرآن کی چالیسویں سورہ میں درج ہے۔ اس تقریر کا ایک جملہ یہ ہے:

ولقد جاءکم یوسف من قبل بالبینات فما زلتم فی شک مما جاءکم بہ حتی اذا ھلک قلتم لن یبعث اللہ من بعدہ رسولا کذالک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب (المومن ۳۴)

اور اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس روشن نشانیوں کے ساتھ آئے۔ پھر جو کچھ وہ لائے تھے اس کی بابت تم شک ہی میں پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ ختم ہوگئے تو تم نے کہا کہ ان کے بعد اللہ ہرگز (ایسا) رسول نہ بھیجے گا۔ اس طرح اللہ ان کو بھٹکا دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہیں۔

یعنی حضرت یوسف جب تک زندہ تمہارے درمیان موجود تھے تو تم ان کی صداقت پر شک کرتے رہے۔ اور جب وہ دنیا سے چلے گئے تو تم ان کے قائل ہوگئے۔ مگر صرف یہ کہنے کے لئے کہ اب ایسا رسول خدا کہاں بھیجے گا۔

قدیم مکہ کے لوگ حضرت ابراہیم کی عظمت کا اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر وہ ہستی جس کی امامت میں حضرت ابراہیم نے بیت المقدس میں نماز ادا کی، اس کو وہ اس کی زندگی میں ناچیز کئے ہوئے تھے۔ حتی کہ اس کو مذمم کہتے تھے۔

یہ مزاج لوگوں میں ہر زمانہ میں پایا گیا ہے۔ لوگ ہمیشہ اپنے مردہ اشخاص کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ حتی کہ وہ ان کو بڑھانے کے لئے جھوٹے قصے کہانیاں گھڑتے ہیں، مگر اپنے زندہ اشخاص کے لئے وہ سچے واقعات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ گزرے ہوئے لوگوں کو مبالغہ آمیز حد تک بڑا سمجھتے ہیں۔ مگر جو افراد ان کے سامنے ہیں ان کی بڑائی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

قوم جب زندہ ہو تو وہ اپنے زندوں کی قدر کرتی ہے۔ مگر مردہ قوموں کو اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ اپنے مردوں کی خیالی تصویر بنا کر ان کو پوجتے رہیں۔ زندہ قوم زندہ لوگوں کی قدر کرتی ہے اور مردہ قوم مردہ لوگوں کی۔

فطرت کی تصدیق

سیدھا رکھو اپنا رخ دین پر ایک طرف کا ہو کر۔ وہی فطرت اللہ کی جس پر پیدا کیا لوگوں کو۔ بدلنا نہیں ہے اللہ کے بنائے کو۔ یہی ہے دین سیدھا۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ سب رجوع ہو کر اس کی طرف۔ اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور قائم کرو نماز اور نہ ہو جاؤ شرک کرنے والوں میں۔ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا اور ہو گئے فرقے فرقے۔ ہر گروہ اس پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارنے لگتے ہیں اس کی طرف رجوع ہو کر۔ پھر جب اللہ چکھاتا ہے ان کو اپنی طرف سے کچھ مہربانی تو ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ منکر ہو جائیں ہمارے دئے ہوئے سے۔ پس چند روز فائدہ اٹھالو۔ جلد ہی تم جان لوگے (روم ۳۴-۳۰)

آدمی کیا ہے۔ امیدوں اور حوصلوں اور تمناؤں کا ایک مجموعہ۔ آدمی اپنی عین بناوٹ کے لحاظ سے ایک مرکز چاہتا ہے جس کی طرف وہ اپنی توجہات کو مرتکز کر دے، جس کی طرف وہ لپکے، جس کی یاد کو لئے ہوئے وہ سوئے اور جاگے، اپنے وجود کو ہمہ تن جس کے حوالے کر دے۔ جس طرح کسی آدمی کے بس میں نہیں کہ اپنے اندر سے کھانے اور پانی کی طلب کو ختم کر دے، اسی طرح کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان احساسات سے اپنے آپ کو خالی کر سکے ——— آدمی جب ان پہلوؤں سے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائے تو یہ توحید ہے اور جب کوئی دوسری چیز اس کی توجہات کا مرکز بن جائے تو اسی کا نام شرک ہے۔

توحید یا خدا پرستی کے داخل فطرت ہونے کا یہاں ایک نہایت سادہ ثبوت دیا گیا ہے جس کا تجربہ کسی نہ کسی وقت ہر شخص کو ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اپنے مشکل وقتوں میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کا ایسا تقاضا ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ آدمی خواہ مشرک ہو یا منکر، جب ڈر کا لمحہ آتا ہے تو حقیقت کھل جاتی ہے اور اس کی فطرت بے اختیار اسی ایک خدا کو پکارنے لگتی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اسی بنا پر کسی نے کہا ہے کہ خدا اگر موجود نہ ہو تب بھی ضروری ہوگا کہ خدا کو ایجاد کیا جائے:

مطلب یہ کہ انسان خدا جیسی ایک ہستی کا اتنا زیادہ محتاج ہے کہ وہ اس سے کسی حال میں خالی نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ اگر خدا فی الواقع موجود نہ ہو تو وہ خود سے اپنا ایک معبود گھڑلے گا اور اس کو خدا کی طرح پکارے گا۔ تاکہ اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبات کو تسکین دے سکے۔

توحید کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنائے۔ مگر جب بگاڑ آتا ہے تو کچھ اشخاص لوگوں کا مرکز توجہ بن جاتے ہیں۔ ہر گروہ کسی زندہ یا مردہ شخصیت کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ ہر گروہ فضل و کمال کا ایک ایسا معیار بنا لیتا ہے جس میں اس کی اپنی محبوب شخصیت سب سے زیادہ اونچی دکھائی دے۔ اس طرح ہر گروہ کے گرد فرضی خوش خیالیوں کا ایک قلعہ تیار ہو جاتا ہے جس میں پناہ لے کر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی دنیا و آخرت کو محفوظ کر لیا۔ اب خدا پرستی کے نام پر انسان پرستی دین میں داخل ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی دینوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

بگاڑ کا سبب کیا ہے

دنیا میں بگاڑ کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ یہاں کوئی ایسی طاقت نہیں جو لوگوں کو صدفی صد اپنی گرفت میں لے سکے۔ ہر طاقت، خواہ وہ حکومت اور قانون کی ہو یا کوئی اور، اس کی گرفت انسانی زندگی میں ایک حد پر جاکر ختم ہوجاتی ہے اس کے بعد آدمی کا اپنا ارادہ شروع ہوجاتا ہے۔ آدمی کو صدفی صد اپنی گرفت میں لینے والا دو میں سے کوئی ایک ہی ہوسکتا ہے —— اللہ یا آدمی کا اپنا ارادہ۔

آخرت اللہ کی گرفت کے ظہور کا مقام ہے۔ اور دنیا انسانی ارادہ کی گرفت کا امتحان — آخرت میں تمام انسان براہ راست خدا کی مکمل گرفت میں آجائیں گے۔ کسی کو ادنیٰ درجہ میں بھی ذاتی اختیار باقی نہیں رہے گا۔ یہی کیفیت موجودہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ جو واقعہ آخرت میں براہ راست خدا کی طرف سے ہونے والا ہے، اسی کو دنیا میں خود اپنے ارادہ سے اپنے اوپر طاری کرنا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ جنت اسی کے لئے ہے جو دنیا کی زندگی میں اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو صدفی صد اللہ کی گرفت میں دے دے۔ باقی وہ لوگ جو آخرت میں خدا کی گرفت میں آئیں، ان کا گرفت میں آنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔ وہ دن تو مالک کائنات کی طرف سے باغی اور سرکش انسانوں کی گرفتاری کا دن ہوگا۔ یہ گرفتاری صرف اس لئے ہوگی کہ ایسے لوگوں کو جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ وہ کسی بھی درجہ میں ان کے کام آنے والی نہیں۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نام ہے اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے کا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کائنات میں ہر قسم کا اختیار و اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان کو بظاہر جو اختیار حاصل ہے، وہ محض عارضی ہے اور موت آتے ہی مکمل طور پر چھین جاتا ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو موت سے پہلے مان لینا اور اپنے آپ کو ہمہ تن اس پر ڈھال لینے کا نام اسلام ہے۔ جس نے حالت غیب میں اپنے ارادہ سے ایسا کرلیا وہ جنتی ہے اور جو خدا کے ظاہر ہونے کے بعد اس کا اعتراف کرے اس کے لئے ابدی رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں:

یوم نقول لجهنم هل امتلئتِ وتقول هل من مزید ۔ واذلفت الجنة للمتقین غیر بعید ۔ هذا ماتوعدون لکل اواب حفیظ ۔ من خشی الرحمٰن بالغیب وجاء بقلب منیب ادخلوها بسلٰم ذلك یوم الخلود ۔ لهم ما یشاءون فیها ولدینا مزید

(ق ۳۵-۳۰)

جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا تو بھر گئی۔ وہ بولے گی کچھ اور بھی ہے۔ اور جنت ڈرو الوں کے قریب لائی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تھا ہر ایک رجوع کرنے والے یاد رکھنے والے سے۔ جو ڈرا اللہ سے بن دیکھے اور لایا دل جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کو جنت میں سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس زیادہ بھی ہے۔ ■

بگاڑ کیسے آتا ہے

یہود کی گمراہی کیا تھی جس کی وجہ سے وہ خدا کے غضب کے مستحق ہو گئے، وہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے دین کا نام لینا یا دینی مراسم پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ظاہری دینداری ان کے یہاں بڑے پیمانہ پر جاری تھی۔ ان کی گمراہی قرآن کے الفاظ میں یہ تھی کہ انھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی (بقرہ ۸۶) ان کے یہاں خدا کے نبیوں کا چرچا تھا اور خدا کے دین کے نام پر ہنگامے جاری تھے۔ مگر یہ سب کچھ آخرت کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے لئے تھا۔ وہ چیز جس کو دے کر آخرت ملتی ہے، اس کو انھوں نے دنیا حاصل کرنے کا سستا سودا بنا لیا تھا۔ وہ دین کے نمائشی کاموں کا مظاہرہ کرتے تھے مگر اپنی حقیقی عملی زندگی میں دنیا کو ترجیح دئے ہوئے تھے۔

یہود کی قدیم مذہبی کتابوں میں ان کی جو تصویر ملتی ہے وہ اس قرآنی بیان کی پوری تفسیر ہے۔ تورات میں یہود کی قومی ترقی یا ان کی قومی تباہی تفصیل سے ملے گی۔ مگر پوری کتاب پڑھ جائیے اور آپ کو کہیں آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر نہیں ملے گا۔ ان کی مقدس کتابوں کا خلاصہ صرف یہ نظر آتا ہے کہ ـــــــ مذہب کے طریقہ پر چلو تاکہ تم کو دنیا کی کامیابی حاصل ہو، قوم کو اقتدار ملے۔ یہود ایک معزز اور سربلند قوم بن جائیں۔

یہ صرف یہود کی خرابی نہیں۔ کتاب آسمانی کی حامل کسی قوم میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس کی حالت یہی ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد کی ذاتی زندگی اور اس کی جماعتوں کی عمومی سرگرمیاں دنیا کے رخ پر چل پڑتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ خدا اور رسول کا چرچا اس طرح جاری رہتا ہے گویا یہ سب کچھ صرف آخرت کے لئے کیا جارہا ہے۔

ان کے دین کا بے حقیقت ہونا اس وقت بالکل واضح ہو جاتا ہے جب کہ ان کی اپنی ذات کی سطح پر ان کی دینداری کا تجربہ کیا جائے۔ وہ اگرچہ خدائی کتاب کے حوالے سے دوسروں کو نیکی کی نصیحت کر رہے ہوتے ہیں مگر ان کے افراد کی اپنی زندگیاں اس نیکی سے خالی ہوتی ہیں (بقرہ ۴۴)۔ ان کا ایک واعظ لوگوں سے کہے گا کہ خدا سے ڈرو۔ لیکن جب اس کا معاملہ کسی ایسے شخص سے پڑ جائے گا جہاں خود اس کو خدا سے ڈرنا چاہئے تو وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا جیسے کہ اس کا دل بالکل اللہ کے خوف سے خالی ہے۔ اس کا ایک مقرر دوسروں کو اخلاق اور انسانیت کا سبق دے گا۔ لیکن اگر ایک شخص مقرر پر تنقید کر دے تو وہ فوراً بگڑ اٹھے گا اور اپنے ناقد کے خلاف ہر قسم کے غیر انسانی سلوک کو اپنے لئے جائز قرار دے لے گا۔ اس کا ایک مصلح دوسروں سے کہے گا کہ خدا کے دین کے لئے جیو اور خدا کے دین کے لئے مرو۔ لیکن اگر کسی سے اس کو ٹھیس پہنچ جائے تو وہ بپھر کر اس کے خلاف ایسے اقدامات کرے گا گویا کہ وہ شیطان کا ساتھی بنا ہوا ہے اور فرضی طور پر خدا کا درس دے رہا ہے۔ ان کا قائد مظلوم ملت کے مسائل حل کرنے کے لئے پرشور تقریریں کرے گا مگر مظلوم فرد کی دادرسی سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

ہدایت پر صرف وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو ہدایت کی لگام دے رکھی ہے۔ جو دوسروں سے کوئی بات کہنے سے پہلے اپنا بے لاگ محاسبہ کر کے دیکھتا ہے کہ کیا وہ خود اس پر قائم ہے جس کی توجہ آخرت کی طرف ہے نہ کہ دنیا کی طرف۔

کہنے اور کرنے کا فرق

قرآن میں شاعروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کو وہ کرتے نہیں (شعراء ۲۲۶) شاعری کے طور پر بات کہنے کی یہ کمزوری کبھی خود اہل دین میں پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دین وملت کے بارے میں تقریریں کرتے ہیں اور کتابیں چھاپتے ہیں، مگر دین ان کا حقیقی عملی فیصلہ نہیں ہوتا ——— "اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں (صف ۳)

آدمی جب بولتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی حقیقی عملی زندگی کا ایک اظہار ہوں، جس طرح بھاپ ایک گرم پانی کا اظہار ہوتی ہے یا دھواں کسی جلتی ہوئی چیز کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جب بولتا ہے تو وہ اپنے اندرون کو انڈیل رہا ہوتا ہے، اس کے الفاظ عام معنوں میں صرف الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ اس کی اپنی ہستی ہوتی ہے جو لفظوں کی صورت میں ڈھل رہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ میں انتہائی واقعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی تصویر کی خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس کے بیانات میں کیمرہ کے فوٹو کی طرح حقیقی عکاسی کی شان آجاتی ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہ خود بھی وہی ہوتا ہے۔ اس لئے جب کسی انسان کو اس کے ساتھ عملی تجربہ پیش آتا ہے تو وہ اس میں کوئی تضاد نہیں پاتا۔ بولنے والا اگر اسٹیج پر ملی ہمدردی کے الفاظ بول رہا تھا تو عملی تجربہ میں بھی وہ ملت کا ہمدرد ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ احتساب نفس پر وعظ کر رہا تھا تو موقع پڑنے پر وہ خود بھی اپنی ذات کا حساب لینے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ عہد وپیمان کی پختگی کی تلقین کر رہا تھا تو جب امتحان کا وقت آتا ہے تو وہ خود بھی عہد وپیمان کو پورا کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ انصاف اور انسانیت کا پرچار کر رہا تھا تو عملی تجربہ میں وہ ایک ایسا شخص ثابت ہوتا ہے جو خود بھی معاملہ کے وقت انصاف اور انسانیت پر قائم رہنے والا ہو۔

اس کے برعکس دوسرا آدمی وہ ہے جس کا اسلام پر بولنا شاعروں جیسا بولنا ہو۔ اس کی زبان الگ ہوتی ہے اور اس کی عملی زندگی الگ۔ اس کی باتوں میں وہ گہرائی نہیں ہوتی جو صرف ایک مطابق واقعہ کلام میں ہوا کرتی ہے۔ اس کا کلام ایک قسم کی شاعری ہوتا ہے نہ کہ حقیقت بیانی۔ لکھنے یا بولنے کے وقت تو وہ "اسلامی" نظر آتا ہے لیکن اگر کوئی نازک معاملہ پڑ جائے تو فوراً اس کی اصل ہستی ننگی ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ شخص جس نے اسٹیج پر انسانیت کا وعظ کہا تھا، عملی تجربہ میں وہ انسان کی صورت میں بھیڑیا ثابت ہوتا ہے۔ وہ جس ملت کی ہمدردی کی باتیں کر رہا تھا، حقیقی معاملہ میں اسی ملت کے ایک فرد کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ خوف خدا اور فکر آخرت کی باتیں کر رہا تھا مگر عملی تجربہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں ایک بالکل بے خوف دل ہے جس کو آخرت اور حساب کتاب کی مطلق کوئی فکر نہیں۔ شاعری والا اسلام موجودہ دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ دے سکتا ہے۔ یہاں اسلامی مشاعرہ کی مجلسوں میں اس کو داد مل سکتی ہے۔ مگر ایسے اسلام کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہ ہوگی۔ خدا کو الفاظ سے نہیں حقیقت سے دلچسپی ہے۔ اس کو وہ شاعر مطلوب ہے جو آخرت کی پکڑ کے خوف سے اپنی شاعری بھول جائے۔ اس کو وہ ادیب مطلوب ہے جس کی بے نفسی اس کو اپنا قلم توڑنے پر مجبور کر دے۔ اس کو وہ زبان مطلوب ہے جو زبان رکھتے ہوئے خدا کی خاطر بے زبان ہو جائے۔

قرآن کا اہم ترین حصّہ

پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کے سب سے زیادہ پراثر حصے وہ ہیں جو آخرت کے معاملات سے بحث کرتے ہیں۔ (صفحہ ۱۳۰)

The most impressive parts of the Koran deal with eschatology

جن غیر مسلموں نے قرآن کو پڑھا ہے وہ عام طور پر اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو سب سے کم جو چیز قرآن میں ملتی ہے وہ یہی آخرت ہے۔ مسلمان ہر چیز قرآن میں پا لیتے ہیں مگر اسی چیز کو نہیں پاتے جو قرآن میں سب سے زیادہ بلکہ ہر ہر صفحہ پر پھیلی ہوئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم عام طور پر خالی الذہن ہوتا ہے۔ وہ صرف یہ جاننے کے لئے پڑھتا ہے کہ قرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ کیا ہے۔ چنانچہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر پالیتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مسلمان زیادہ تر دو جذبے کے تحت قرآن پڑھتے ہیں۔ یا ثواب کے لئے یا فخر کے لئے۔

کچھ لوگ قرآن کو سب سے زیادہ مقدس کتاب سمجھ کر بس اس کی "تلاوت" کر لیتے ہیں تاکہ اس کا ثواب انھیں مل جائے۔ اس کے بعد کچھ لوگ وہ ہیں جو قرآن کو اپنا ایک قومی فخر سمجھتے ہیں اور فخر کی نفسیات لے کر قرآن کو پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگ قدرتی طور پر قرآن کو زمانہ کی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ زمانہ میں جن چیزوں کو اہمیت حاصل ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پر فخر کتاب ضرور اس کا مجموعہ ہوگی۔ اب جس کے ذہن میں سوشلزم سب سے بڑی چیز ہے وہ قرآن میں سوشلزم کو پڑھنے لگتا ہے۔ جس کے ذہن میں سائنس کی اہمیت ہے وہ قرآن کی عظمت کو سائنس کی صورت میں پالیتا ہے۔ اسی طرح جس کے ذہن میں سیاست اور قانون کی اہمیت ہے۔ وہ قرآن میں جو سب سے اہم بات دریافت کرتا ہے وہ سیاست اور قانون ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن آخرت کی کتاب ہے۔ قرآن اس لئے آیا ہے کہ وہ آنے والے دن سے پہلے آنے والے دن کے بارہ میں لوگوں کو خبردار کردے۔ قرآن مادی صور سے پہلے لفظی صور ہے۔ جو لوگ لفظی صور سے جاگ جائیں وہ کامیاب ہیں۔ جو لوگ مادی صور سے جاگیں گے ان کے لئے ان کا جاگنا کچھ کام نہ آئے گا۔

جھوٹا دین

بائبل میں یہود کے بگاڑ کے بارہ میں یہ الفاظ آتے ہیں :

" یہ باغی لوگ اور جھوٹے فرزند ہیں۔ جو خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرتے ہیں۔ جو غیب بینوں سے کہتے ہیں کہ غیب بینی نہ کرو۔ اور نبیوں سے کہ ہم پر سچی نبوتیں ظاہر نہ کرو۔ ہم کو خوشگوار باتیں سناؤ۔ اور ہم سے جھوٹی نبوت کرو۔ پس اسرائیل کا قدوس یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم اس کلام کو حقیر جانتے ہو اور ظلم اور کج روی پر بھروسا کرتے ہو اور اسی پر قائم ہو، اس لئے یہ بدکرداری تمہارے لئے ایسی ہو گی جیسے پھٹی ہوئی دیوار جو گرا چاہتی ہے۔ وہ اسے کمہار کے برتن کی طرح توڑ ڈالے گا۔ اسے بے دریغ چکنا چور کرے گا۔ اس کے ٹکڑوں میں ایک ٹھیکرا بھی ایسا نہ ملے گا جس میں چولھے پر سے آگ یا حوض سے پانی لیا جائے۔ (یسعیاہ باب ۳۰)

یہود کا بگاڑ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کا بگاڑ یہ تھا کہ وہ خود ساختہ دین پر تھے اور اس کو خدا کا دین بتاتے تھے۔ خدا کے جو بندے انہیں سچے دین کی طرف بلاتے ان کو وہ حقیر جانتے تھے اور ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ جھوٹی کرامتوں اور گھڑی ہوئی بشارتوں کے نام پر انھیں بلاتے ان کے گرد وہ جوق در جوق جمع ہو جاتے

یہود کو ایسا دین پسند نہیں آتا تھا جو ان کی زندگیوں میں تبدیلی کا تقاضا کرتا ہو۔ وہ ایسے دین کو پسند کرتے تھے جس میں اپنی زندگی کا ڈھانچہ توڑنا نہ ہو۔ بس کچھ اوپری اور نمائشی کام کر کے جنت کی ضمانت مل جائے۔ مگر اس قسم کا دین اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

خدا کے کلام کو حقیر جاننا اور ظلم اور کج روی پر بھروسہ کرنا جس میں یہود مبتلا تھے وہی آج پوری طرح مسلمانوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ دوسروں سے مسلمانوں کے جو مادی جھگڑے ہیں ان میں یہ چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان جھگڑوں میں خدا کے بتائے طریقہ پر چلنے کا فائدہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ظالمانہ مقابلہ اور جھوٹی سرگرمیوں میں وہ خوب اپنا وقت اور مال خرچ کرتے ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں خدا کی نظر میں "بدکرداری" ہیں اور ان کا نتیجہ ان کے حق میں بھی وہی نکلے گا جو یہود کے حق میں نکلا۔ یہ کہ ان کا گھر پھٹی ہوئی دیوار کی طرح گر پڑے اور وہ مٹی کے برتن کی طرح توڑ ڈالے جائیں۔

سیاسی احکام کی نوعیت

ایک مسلمان کمیونسٹ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے بڑے اشتراکی تھے ان کے نزدیک پیغمبر اسلام کا مشن یہ تھا کہ دنیا سے معاشی استحصال کا خاتمہ کریں۔ اور زمین پر معاشی انصاف کا نظام قائم کریں۔ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے ان کو قرآن کے بہت سے حوالے مل گئے —— زمین اللہ کی ہے (اعراف ۱۲۸) دولت کا اجتماع ہلاکت کا باعث ہے (الہمزہ ۲) ضرورت سے زیادہ مال رکھنے کا کسی کو حق نہیں (البقرہ ۲۱۹) سرمایہ دارانہ سماج پر خدا اپنا عذاب نازل کرتا ہے (الاسراء ۱۶) دولت صرف سرمایہ دار طبقہ میں نہیں رہنا چاہئے (الحشر ۷) خدا کا مطلوب سماج وہ ہے جس میں ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کو لوٹنے کا موقع نہ ہو (ہود ۸۴) دولت کے زور پر جو لوگ دوسروں کا استحصال کرتے ہیں ان سے جنگ کرو (البقرہ ۲۷۹)

مذکورہ کمیونسٹ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اس طرح کے قرآنی دلائل پیش کرتے رہے۔ آخر میں میں نے کہا کہ پیغمبر کا مشن اگر وہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا تو قرآن میں ایسی کوئی آیت ہونی چاہئے جس کا مفہوم یہ ہو کہ "اے پیغمبر، ہم نے تم کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ تم دنیا سے معاشی لوٹ کو ختم کرو اور زمین پر معاشی انصاف کا نظام قائم کرو"۔ اگر آپ اپنے دعوے میں برحق ہیں تو قرآن سے ایسی کوئی آیت نکال کر دکھائیے۔ موصوف نے مذکورہ بالا قسم کے معاشی حوالے تو بہت دئے مگر وہ ایسی کوئی آیت پیش نہ کر سکے جس کے الفاظ سے براہ راست طور پر یہ نکلتا ہو کہ پیغمبر کا مشن دنیا میں معاشی انقلاب برپا کرنا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں بہت سی معاشی آیتیں ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن میں کوئی ایک بھی ایسی آیت نہیں جس کے عبارت النص سے مذکورہ بالا قسم کا معاشی نصب العین نکلتا ہو۔ یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ معاشی احکام اگرچہ قرآن میں موجود ہیں مگر معاشی احکام کا نفاذ ہی وہ چیز نہیں جو پیغمبر خدا کا اصل نصب العین ہو۔ معاشی احکام کی اہمیت کسی اور پہلو سے ہے نہ کہ نصب العین کے پہلو سے۔

یہی معاملہ سیاسی احکام کا ہے۔ قرآن میں یقیناً سیاسی نوعیت کے احکام بھی ہیں۔ مگر ان احکام کی بنیاد پر ایک نظام قائم کرنا ہی وہ اصل نصب العین نہیں جس کے لئے پیغمبر کی بعثت ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایسی آیتیں تو ملتی ہیں جن میں سیاسی پہلو بھی شامل ہو۔ مگر سارے قرآن میں ایسی کوئی ایک آیت نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ "اے پیغمبر تمہارا نصب العین یہ ہے کہ تم قرآنی احکام کی بنیاد پر ایک مکمل سیاسی نظام قائم کرو"۔ قرآن معاشی نصب العین کی آیت سے بھی خالی ہے اور سیاسی نصب العین کی آیت سے بھی۔

دین کے نام پر بے دینی

قرآن کی تین سورتوں (الاعراف، طٰہٰ، الشعراء) میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے پیغمبر بنایا۔ اس کے بعد وہ خدا کے حکم کے مطابق شاہ مصر فرعون کے دربار میں گئے۔ انھوں نے فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکل کر میرے ساتھ صحرائے سینا میں جانے دے (ارسل معنا بنی اسرائیل) اس کے جواب میں فرعون نے اپنے درباریوں کے سامنے جو تقریر کی اس میں اس نے کہا کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ملک مصر سے نکال دیں (یرید ان یخرجکم من ارضکم)

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو ساتھ لے کر خود ملک مصر سے نکل جانے کی بات کی تھی۔ مگر فرعون نے لازم کے صیغہ کو متعدی کا صیغہ بنا دیا۔ اس نے کہا کہ موسیٰ ہم لوگوں کو مصر سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ فرعون نے اپنی قوم اور اپنے درباریوں کو موسیٰ کے خلاف بھڑکانے کے لئے آنجناب کی طرف وہ بات منسوب کر دی جو آپ نے خود نہیں فرمائی تھی۔

فرعون کا کلمہ واضح طور پر شرارت کا کلمہ تھا۔ یہ ویسا ہی تھا جیسے موجودہ زمانہ کے ظالم حکمراں یہ کرتے ہیں کہ اگر وہ کسی شخص سے ناراض ہوں تو وہ اپنی خفیہ پولیس کے ذریعہ اس انکشاف کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ حکمراں کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اس عمل کے لئے جواز فراہم کرتے ہیں کہ اس شخص کو بغاوت کا مجرم قرار دے کر ہلاک کر دیں۔

فرعون شرک اور کفر کا علم بردار تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اسلام کے ایسے علم بردار پیدا ہوئے ہیں جو قرآن سے فرعون کے الفاظ (یرید ان یخرجکم من ارضکم) لے لیتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی دعوت عام معنوں میں صرف ایک دینی دعوت نہ تھی بلکہ وہ سیاسی انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ تھا۔ حضرت موسیٰ اس لئے اٹھے تھے کہ فرعون کو اقتدار کے تخت سے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کریں اور ملک میں حکومت الٰہیہ کا نظام قائم کریں۔ وہ کلمۂ موسیٰ کے بجائے کلمۂ فرعون سے پیغمبر کا مشن برآمد کر رہے ہیں۔

فرعون کا کلمہ صرف اس قابل ہے کہ اس کو شرارت کے خانہ میں جگہ ملے۔ مگر جو لوگ فرعون کے کلمہ سے پیغمبر کا مشن برآمد کر رہے ہیں ان کے قول کو آخر کس خانہ میں رکھا جائے۔

دلیل میں الحاد

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کے پانچویں رکوع میں خدا کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین و آسمان میں بکھری ہوئی ہیں ـــــ رات، دن، سورج، چاند، پانی، سبزہ، وغیرہ۔ پھر ارشاد ہوا ہے:

إن الذين يُلحدون في آياتنا لا يخفون علينا أفمن يلقى في النار خير أم من يأتي آمنا يوم القيامة اعملوا ما شئتم إنه بما تعملون بصير (حم سجدہ ۴۰)

جو لوگ ہماری نشانیوں میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں ڈالا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا۔ جو جی چاہے کرو، خدا تمھارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ بات سے اصل معنی لینے کے بجائے اس کو کسی اور طرف پھیر دینا (قال ابن عباس: الالحاد وضع الکلام علیٰ غیر مواضعہ، تفسیر ابن کثیر)

خدا کا رسول اپنے پیغام کی صداقت ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرتا تو منکرین کہتے کہ یہ نشانیاں تو فلاں فلاں طبیعی اسباب کے تحت ظاہر ہو رہی ہیں، ان کا تمھارے پیغام کی صداقت سے کیا تعلق۔ ایک واقعہ جس سے حق کی تصدیق نکل رہی تھی اس کو کسی اور طرف پھیر کر اپنے آپ کو حق سے محروم کر لیتے۔

یہی معاملہ وہ دوسرے دلائل کے ساتھ کرتے تھے۔ خدا کا رسول ایک واضح دلیل دیتا جو عقلی طور پر پوری طرح سمجھ میں آنے والی ہو۔ مگر وہ اس کو صحیح رخ سے لینے کے بجائے الٹے رخ پر موڑ دیتے۔ وہ طرح طرح کی لفظی بحثیں نکال کر یہ ظاہر کرتے کہ یہ دلیل دلیل نہیں ہے۔ اگر وہ دلیل ہوتی تو وہ ضرور اس کو مان لیتے۔

جب بھی کوئی سچی دعوت اٹھتی ہے، وہ کھلے کھلے دلائل کی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ اس کی تائید کے لئے اس کے گرد و پیش مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے جو اس کے برحق ہونے کی تصدیق کر رہی ہوں۔ مگر غافل اور سرکش انسان طرح طرح کی تاویل و توجیہہ نکال کر اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے۔ جس واقعہ میں خدا نے اس کے لئے اقرار کا سامان رکھا تھا اس سے وہ الحاد و انکار کی غذا لینے لگتا ہے۔ وہ علم و عقل کا مدعی بن کر علم و عقل کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلا کر حاصل کی جا رہی ہو۔

استہزار اور گریز

آدمی کے سامنے جب ایک ایسی سچائی آتی ہے جس کا توڑ وہ دلائل کی زبان میں نہ کر سکتا ہو تو اکثر وہ دو چیزوں کا سہارا لیتا ہے ۔ استہزار اور گریز۔ استہزار کا مقصد داعی کے بارے میں یہ تاثر دینا ہے کہ وہ اتنا حقیر شخص ہے کہ اس کی بات قابل اعتنا ہی نہیں۔ اسی طرح گریز کا طریقہ آدمی اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ اس کے پاس اصل بات کی براہ راست دلیل موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں زور شور سے بول کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس جواب دینے کے لئے بہت کچھ ہے، دلیل کے کے میدان میں وہ خالی نہیں ۔

پہلی چیز کی ایک مثال قرآن کی سورہ نمبر ۳۷ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی وہ دعوت پیش کی جو قرآن کے مطابق تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت تھی تو قریش نے کہا "کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں" (الصافات ۳۶)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل کا قریش کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انھوں نے آپ کو شاعر اور دیوانہ کہا تاکہ آپ کو ناچیز ظاہر کر کے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا دیں۔

دوسری چیز کی مثال سورہ نمبر ۳ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے تھے۔ یہود نے ان چیزوں کو اپنی شریعت میں حرام کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہود نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد اپنے کو ملت ابراہیمی کا حامل بتاتے ہیں حالاں کہ وہ ان چیزوں کو کھاتے ہیں جو ملت ابراہیمی میں حرام ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ملت ابراہیمی پر ہم ہیں نہ کہ محمد اور ان کے ساتھی۔ قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی مقدس کتاب تورات لاؤ اور دکھاؤ کہ اس کی کس آیت میں یہ بات لکھی ہوئی ہے (آل عمران ۹۳) اس کے جواب میں یہود نے تورات کی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ البتہ وہ دوسری دوسری باتیں کہنے لگے۔ مثلاً یہ کہ یہ بات تو بالکل معلوم و مشہور ہے، پھر اس کے لئے تورات کی کوئی آیت پیش کرنے کی کیا ضرورت۔

انسان کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو خالی پاتا ہے تو وہ استہزار اور گریز کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ناقابل التفات ظاہر کرتا ہے یا غیر متعلق الفاظ بول کر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔ اس کی مثالیں پچھلے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور آج کے دور میں بھی۔

قرآنی استدلال

سورہ الرعد (آیت ۸-۱۰) میں مادہ کے حمل سے خدا کے علم غیب اور فرشتوں کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے جس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

حاملہ کا پیٹ انسان کی پیدائش کا کارخانہ ہے۔ اس کارخانہ سے جو "پیداوار" بن کر نکلتی ہے وہ حیرت انگیز طور پر باہر کی ضروریات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ باہر کی دنیا میں عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان جو تناسب درکار ہے وہ ہزاروں برس سے مسلسل قائم ہے۔ دونوں صنفیں اتنی تعداد میں تیار کی جاتی ہیں کہ تقریباً ۵۰ فیصد مرد اور تقریباً ۵۰ فیصد عورت کا تناسب برقرار رہے۔ اسی طرح تمدن کا نظام چلانے کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد درکار ہیں۔ مزدور اور ذہین، ادیب اور انجنیئر، لیڈر اور عوام۔ چنانچہ ماں کی فیکٹری ہر صلاحیت کے انسان اتنی تعداد میں تیار کر کے باہر بھیج رہی ہے کہ خارجی دنیا میں ان کا تناسب بگڑنے نہ پائے۔ اسی طرح پہچان کے لئے ضروری ہے کہ ہر آدمی کی صورت الگ الگ ہو۔ چنانچہ ہر مرد اور عورت الگ الگ صورت کے ساتھ پیدا کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کی فیکٹری کو مسلسل نئے نئے ماڈل فراہم کئے جا رہے ہیں اور ان کے مطابق وہ کروڑوں افراد اس طرح تیار کر رہی ہے کہ ہر ایک کا نقشہ دوسرے سے مختلف ہو۔

یہ ایک مشاہدہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ناظم ہے جس کی نظر بیک وقت پیٹ کے باہر بھی ہے اور پیٹ کے اندر بھی۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھ کر ضروریات کی تفصیل مرتب کرتا ہے اور پھر نہایت صحیح اندازہ کے مطابق پیٹ کے اندر پیداوار تیار کر رہا ہے۔ دنیا میں اس قسم کا نظام ہونا یہ ثابت کرتا کہ اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ اگر ایک ایسی ہستی یہاں موجود نہ ہو تو اندر اور باہر کے درمیان یہ توازن کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔

کائنات میں غیر مرئی نگرانی کا نظام ثابت ہونے کے بعد یہ بات ناقابل فہم نہیں رہتی کہ یہ نظام دو سطح پر ہو۔ ایک خدا کی سطح پر دوسرے فرشتوں کی سطح پر جو خدا کے کارندے ہیں۔

یہ اصلاً صرف خدا کی صفت ہے کہ وہ حاضر اور غائب دونوں سے کامل طور پر واقف ہے۔ البتہ دنیا کے انتظام کے لئے اس نے کچھ درمیانی کارندے (فرشتے) بنائے ہیں۔ اور ان کو اپنی طرف سے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مخفی طور پر آدمی کے آگے اور پیچھے رہیں۔ اور خدا کے حکم کے مطابق خدا کی طرف سے آدمی کی نگرانی کرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں (نگرانی) کے نظام کو ماننے کے بعد فرشتوں کو ماننا اتنا ہی ممکن ہو جاتا ہے جتنا وائرلیس کی ٹکنالوجی کے ماننے کے بعد یہ ماننا کہ پڑوسی کے مکان میں ایک "واکی ٹاکی" موجود ہے۔

کچھ الفاظ بول دینے کا نام دلیل نہیں

حق کی دعوت آدمی کے سامنے آتی ہے۔ وہ اس کے خلاف ایک بات کہتا ہے۔ بظاہر وہ ایک دلیل دے رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ کج بحثی ہوتی ہے۔ اسی کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ یہ بات جو انھوں نے کہی، یہ تم سے جھگڑنے کے لئے کہی ہے۔ یہ صرف جھگڑالو لوگ ہیں۔ زخرف ۵۸

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخاطبین کو یہ آیت سنائی: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہوں گے) عبداللہ بن زبعری نے یہ سن کر کہا: جس طرح ہم بتوں کو پوجتے ہیں، اسی طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں اور تم خود اپنے عقیدہ کے مطابق ان کو رسول مانتے ہو۔ پھر ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں اگر ہمارے بتوں کا وہی انجام ہو جو تمھارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ کا ہوگا۔" اس کے بعد حاضرین نے اس ذہانت کی داد اس طرح دی کہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: لیس احدٌ یُعبد من دون اللہ فیہ خیر (اللہ کے سوا جس کو معبود بنایا جائے اس میں کوئی خیر نہیں) مخالفین نے کہا: کیا مسیح میں بھی کوئی خیر اور بھلائی نہیں۔ کیوں کہ ان کو بھی بنانے والوں نے خدا کے سوا معبود بنالیا ہے"۔ اس قسم کی باتوں کو قرآن میں الغار فی الکلام (حم سجدہ ۲۶) کہا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سیدھی بات سے ٹیڑھا مفہوم نکالا جائے۔ والغوا فیہ کی تفسیر میں ضحاک نے عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کے کلام میں عیب نکالو (عیبوہ، تفسیر ابن کثیر)

حقیقت یہ ہے کہ تنقید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلہ کا علمی تجزیہ کیا جائے۔ آسمانی علم یا مسلمہ حقائق کی روشنی میں ان کا غلط ہونا واضح کیا جائے۔ یہ صحیح تنقید ہے اور اس کی اجازت ہر ایک کو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ کا عقلی یا نقلی تجزیہ کرنے کے بجائے اس میں عیب لگائے جائیں۔ یہ دوسرا طریقہ نہ صرف غلط ہے بلکہ گناہ بھی ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر یہ کہتا ہے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ اسلام کا مثبت اور مستقل کام دعوت ہے نہ کہ جدال و قتال۔ البتہ اگر مخالف طاقتیں حملہ آور ہوں تو مخصوص شرائط کے تحت اس کا دفاع میدان جنگ میں کیا جائے گا۔ کسی کو اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہو تو دلائل کی زبان میں وہ اس کو رد کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اختلاف کرنے والا یہ کرے کہ جو شخص اس نقطۂ نظر کو پیش کر رہا ہے اس کو "قادیانی" یا "صہیونی ایجنٹ" کہنے لگے تو یہ کلام میں عیب لگانے کی مثال ہوگی جو نہ صرف علمی اعتبار سے بے معنی ہے بلکہ اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔ قرآن اور حدیث کی مذکورہ بالا مثال سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام خواہ کتنا ہی حق ہو، ایک آدمی جو بات کو جھٹلانا چاہتا ہو، وہ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ ڈھونڈ لے گا جس کی بنیاد پر وہ اس کلام کو بے اعتبار ظاہر کر سکے۔ کلام میں ایسا کوئی "نکتہ" پاکر آدمی کو کبھی اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہئے کہ وہ اپنے حق میں کوئی مضبوط دلیل پا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو وہ دلیل سمجھ رہا ہے وہ محض ایک جدال ہو جس کی کوئی قیمت نہ علم کی نظر میں ہو اور نہ اللہ کی نظر میں۔

حق کا انکار کرنے والے

حق کا انکار کرنے کی وجہ عام طور پر دو ہوتی ہیں۔ ظلم اور علو (نمل ۱۴) ظالم سے مراد ہے غیر صحیح۔ یعنی وہ لوگ جو مفاد اور مصلحت کے پجاری ہوں۔ اور صحیح اور غلط کا فرق کئے بغیر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور علو پسند وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر کبر اور گھمنڈ کی نفسیات لئے ہوئے ہوں۔ ظلم کی پیدائش کی زمین اگر مفاد پرستی ہے تو علو کی پیدائش کی زمین خود پرستی۔

حق کی دعوت جب کھل کر سامنے آتی ہے تو وہ تمام لوگ اس سے متوحش ہو جاتے ہیں جو صحیح اور غلط کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر دنیا سمیٹنے میں لگے ہوئے ہوں اور دل کے اندر کوئی خواہش پیدا ہونے ہی کو اپنے لئے کافی معیار سمجھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ حق کے پیغام کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بنائی ہوئی زندگی کو درہم برہم کر دیا جائے۔ ہاتھ پاؤں اور زبان پر روک، کمانے کے طریقوں میں حرام و حلال کا لحاظ، معاملات میں صحیح اور غلط کی تمیز، لوگوں کے ساتھ نمٹنے میں انصاف اور بے انصافی کا فرق، یہ چیزیں جو حق کا لازمی تقاضا ہوتی ہیں، ان کو جنجال نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی آزاد زندگی پر روک لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس لئے وہ حق کو قبول نہیں کرتے۔

دوسرا گروہ علو پسندوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو حالات کسی اونچی گدی پر بٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے ماحول میں عزت اور شہرت کا مقام ملا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے سامنے حق کی دعوت آتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے اس کے حق ہونے کا اقرار کر لیا تو ان کی بڑائی کا مقام ان سے چھن جائے گا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو مذہب کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ہوں، وہ سب سے پہلے اس پیچیدگی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عوام کو یہ باور کرائے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ جس مذہب کے نمائندے ہیں وہی اصل مذہب ہے۔ ایسی حالت میں اپنے سے باہر کسی حق کو ماننا اپنے کو گدی سے اتارنے کے ہم معنی ہوتا ہے اور ملی ہوئی گدی سے اترنا آدمی کے لئے ہمیشہ مشکل ترین چیز رہا ہے۔ وہ دنیا میں اپنے وقار کو بچانے کی خاطر حق کا انکار کر دیتے ہیں، خواہ یہ انکار ان کے آخرت کے وقار کو مشتبہ بنا دے۔

ظلم اور علو میں مؤخر الذکر زیادہ شدید قسم کی رکاوٹ ہے۔ سورۂ یوسف میں مصر کی امرأۃ عزیز کا قصہ نقل ہوا ہے۔ وہ ایک وقت حضرت یوسف کی شدید مخالف بن گئی تھی۔ اس کے بعد حضرت یوسف کی براءت کا ایک چھوٹا سا واقعہ اس کے سامنے آیا۔ یعنی خواب کے بارے میں آپ کی تعبیر کا صحیح ہو جانا۔ اس کو سن کر وہ پکار اٹھی: الآن حصحص الحق (اب حق بات ظاہر ہو گئی) دوسری طرف اسی مصر میں فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ نے مسلسل بڑے بڑے معجزے دکھائے۔ مگر وہ آخر وقت تک آپ کی صداقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ عزیز مصر کی عورت کا معاملہ ظلم یعنی ذاتی مفاد یا ہوس کا معاملہ تھا۔ جب کہ فرعون مصر کا معاملہ علو یعنی کبر اور گھمنڈ کا معاملہ تھا۔ جو شخص ذاتی مفاد کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ اگر اس کو قبول نہ کرے گا تو اس کا امکان ہے کہ وہ زبان سے اس کا اعتراف کرے۔ مگر جو شخص اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے حق سے دور ہو وہ نہ اس کو قبول کرے گا اور نہ اس کا اعتراف کرے گا۔ ایسا شخص اپنی متکبرانہ نفسیات کے تحت بنے ہوئے ذہنی خول میں زندگی گزارتا رہتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کے خود ساختہ ذہنی خول سے اس کو باہر لانے میں کامیاب ہو۔

وہ ہمارے خوراک ہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا اور ان کو لے کر صحرائے سینا میں پہنچے۔ یہاں وہ چالیس سال (۱۴۴۰۔۱۴۰۰ ق م) تک رہے۔ یہاں کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ فلسطین اور اس کے آس پاس کی زمین تمھارے لئے لکھ دی گئی ہے۔ تم وہاں داخل ہو جاؤ اور اس کو فتح کر لو۔ (استثنا ۱: ۸) اس وقت حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ دشت فاراں میں خیمہ لگائے ہوئے تھے۔ آپ نے قوم کے بارہ سرداروں کو فلسطین و شام کی طرف بھیجا تاکہ وہ "زمین کنعان کی جاسوسی کریں"۔ یہ علاقہ اس وقت عمالقہ کے قبضہ میں تھا۔ یہ لوگ چالیس دن تک سفر کرتے رہے اور اس کے بعد آکر بتایا کہ وہ لوگ بڑی طاقت والے اور قدآور ہیں۔ ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے (گنتی ب ۱۳) یہ سن کر ساری جماعت چلا اٹھی کہ ہم ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تم اور تمھارا خدا جاکر لڑیں۔ ہم تو یہیں رہیں گے (مائدہ ۲۵) اس وقت بنی اسرائیل کی تحقیق کرنے والی جماعت میں سے دو آدمی اٹھے۔ بائبل کی روایات میں ان کا نام یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا بتایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا: اگر خدا ہم سے راضی ہے تو ہم کو اس زمین پر لے جائے گا اور یہ زمین جس پر دودھ اور شہد بہہ رہا ہے، ہم کو عنایت کرے گا۔ مگر تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ تم اس زمین کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ ان کا سایہ ان سے جاچکا ہے۔ پر خداوند ہمارے ساتھ ہے (گنتی ب ۱۴) ان دونوں آدمیوں کی بابت قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں، وہ یہ ہیں:

قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غلبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین (مائدہ ۲۴)

کہا دو آدمیوں نے جو کہ ڈرنے والوں میں تھے، جن پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر چڑھائی کر کے شہر کے دروازہ تک چلو۔ جب تم دروازہ میں قدم رکھوگے اسی وقت غالب آجاؤ گے۔ اور اللہ کے اوپر توکل کرو، اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو

قرآن کے اس بیان سے توکل کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ توکل یہ نہیں ہے کہ آدمی کوئی کام نہ کرے۔ وہ بے کار پڑا رہے اور کہے کہ خدا خود ہی بھیج دے گا۔ توکل اپنی ذات کے بجائے اللہ پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی کوشش کو اپنی ذمہ داری قرار دے اور نتیجہ کو اللہ کا حق سمجھے۔ وہ اللہ کی ہدایت کی روشنی میں اپنے لئے صحیح راستہ کا انتخاب کرے اور اس پر پوری طرح جم جائے۔ اس کے بعد جدوجہد کی راہ میں مشکلات و مصائب پیش آئیں تو اس یقین کے ساتھ اس پر جما رہے کہ اللہ ضرور اس کا ساتھ دے گا اور اس کو اس منزل تک پہنچائے گا جو اس کی دنیا و آخرت کے لئے بہتر ہے —— جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کے دل سے ہر چیز کا ڈر نکل جاتا ہے۔ اللہ جس کے ایمان کو قبول کر لیتا ہے اس پر اس کی یہ خصوصی عنایت ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کو ان کی حقیقی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کو پالیتا ہے اور اسی کے ساتھ اللہ کی حکمت کو بھی۔

ایک سنت یہ بھی ہے

جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر آتا ہے اور وہ قوم اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتی، تو خدا کی طرف سے ان کو بعض مشکلوں میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ان میں قبولیت کا مادہ پیدا ہو۔ "اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تھے، پھر (جب انھوں نے نہیں مانا تو) ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔ (انعام) اس قسم کے بعض واقعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آئے ہیں (مومنون ۔ ۷۶) صحیحین میں عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبوت کے چند سال بعد جب مکہ والوں کی مخالفت اور سرکشی بہت بڑھ گئی تو تو آپ نے دعا فرمائی:

اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف — خدایا ان کے مقابلہ میں میری مدد یوسفؑ کے سات سالہ قحط جیسے سات برسوں سے کر۔

اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب ایک شخص آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اس کو اوپر دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا تھا۔ آخر ابوسفیان نے آکر آپ سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ اس مصیبت کو ہم سے دور کر دے۔ قریش کے لوگ عام طور پر کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ایمان لائیں گے (دخان ۱۲) اللہ نے اپنے پیغمبر کی دعا قبول کی اور قحط کے حالات ختم ہو گئے۔ مگر ان کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ بدر کی جنگ کی شکل میں وہ پکڑ لئے گئے (دخان ۱۶) قرآن کی سورہ نمبر ۵۲ میں کہا گیا ہے:

بلاشبہ ظالموں کے لئے آخرت سے پہلے بھی عذاب ہے۔ مگر ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے ـــ (طور ـ ۴۷)
مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظالمانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان کو آخرت کے رسواکن عذاب سے پہلے دنیا میں تنبیہی عذاب دئے جاتے ہیں۔ یہ دنیوی عذاب اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے ظلم کی ہلکی سی سزا انھیں اسی دنیا میں دی جائے تاکہ وہ اس سے سبق لے کر اپنی اصلاح کر لیں (لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون) مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس قسم کی کوئی دنیوی سزا ان کو ملتی ہے تو فوراً اس کی تاویل کر لیتے ہیں۔ وہ اس کو کسی عام سبب کا نتیجہ قرار دے کر اپنے لئے یہ تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ یہ ان کی ظالمانہ روش کی خدائی سزا نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے یہاں جو بھی خدائی نشانی یا سبق ظاہر کیا جاتا ہے وہ معمولی واقعات کے پردہ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ پردہ داری دوبارہ لوگوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ اس کو خدا کی طرف سے نہیں سمجھتے بلکہ ایک معمولی واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ جو وجہ "انسانی پیغمبر" کے انکار کی تھی، اسی بنا پر وہ ایک "دنیوی واقعہ" کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ■

دین میں الحاد

قرآن میں انسان کی جن گمراہیوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک دین میں الحاد ہے۔ الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السھم الھدف یعنی تیر نشانہ کے اِدھر اُدھر سے نکل گیا، اصل نشانہ پر نہیں لگا۔ دین میں الحاد یہ ہے کہ دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینے کے بجائے کسی بدلی ہوئی حیثیت میں لینا۔ مثلاً اللہ کے نام (اسمار حسنٰی) ہم کو اس لئے بتائے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ہم اللہ کی برتری اور کمال کا تصور کریں اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا ادراک کرکے اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں۔ اسمار حسنٰی سے اپنے لئے اس قسم کی غذا لینا دین کو اس کی اصل حیثیت میں لینا ہے۔ اس کے بجائے اسمار حسنٰی میں الحاد یہ ہے کہ اس کو سحر اور سفلی عملیات کے لئے استعمال کیا جائے۔ یا مثلاً اللہ کو قرآن میں ملک (بادشاہ) کہا گیا ہے۔ اب دنیوی بادشاہ پر قیاس کرتے ہوئے یہ نظریہ بنایا جائے کہ جس طرح بادشاہوں کے یہاں کچھ مصاحب اور مقرب ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے بھی مصاحب اور مقرب ہیں اور وہ ان کی سفارش کو اسی طرح سنتا ہے جس طرح دنیوی بادشاہ اپنے مصاحب اور مقرب کی سفارش کو سنتے ہیں۔

دین میں اس قسم کا الحاد یا انحراف اس کی تمام تعلیمات میں ہوتا ہے۔ آدمی دین کی اصل شاہراہ سے ہٹ کر کسی اور سمت میں چل پڑتا ہے اور لفظی تاویلات کے ذریعہ اپنے کو سمجھاتا رہتا ہے کہ وہ دینِ خداوندی پر قائم ہے۔ کچھ لوگ اللہ کے نام اور کلام کو عملیاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح "اسلامی عملیات" کے نام سے سحر و کہانت کو اسلام میں داخل کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اسلام کے آداب اور عبادات کو مال و اولاد کی برکت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس طرح اسلام کو اپنی مادہ پرستانہ زندگی کا ضمیمہ بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ قومی مسائل کے لئے احتجاج اور مطالبات اور دوروں اور تقریروں میں مشغول ہوتے ہیں اور اپنی اس قوم پرستانہ مہم کو اسلام کی اصطلاحات میں بیان کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلام کا اصل مدعا ہے۔ کچھ لوگ اقتدار اور لیڈری کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کی تاویل کرکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہی اسلامی سیاست ہے اور وہ اسلام کی سیاسی سربلندی قائم کرنے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دینی مسائل میں خود ساختہ بحثیں اور موشگافیاں نکالتے ہیں اور اس کی بنیاد پر ادارے قائم کرکے کہتے ہیں کہ وہ دینی تعلیم کا کام کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ عملیاتی مشقیں ایجاد کرتے ہیں اور اس کو اسلام کا نام دے کر کہتے ہیں کہ یہ اسلامی روحانیت ہے۔ کچھ لوگ جدال اور مناظرہ کے اکھاڑے قائم کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سب دین میں الحاد ہے۔ اس قسم کا الحاد آدمی کو دین سے دور کرنے والا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی دین سے قریب سمجھتا ہو۔

دین میں الحاد یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے نام پر کرنے کے بجائے دنیا کو دین کے نام پر کیا جانے لگے۔ آدمی اپنی نمود و نمائش کے لئے اٹھے اور اس کو دین کا نام دے۔ وہ اپنے دنیوی حوصلوں کو پورے کرنے کے لئے سرگرم ہو اور یہ اعلان کرے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ وہ اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کے لئے کام کرے اور ثابت کرے کہ یہی قرآن و سنت کا عین مدعا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اسلام کے پیچھے چلائے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایسا کرے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق چلے اور اسلام کی تاویل کرکے اس کو اپنے مطابق ڈھال لے تو یہ الحاد ہے جو اللہ کے نزدیک سخت گناہ ہے۔

جب زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قرآن میں قیامت کے دن کا حال بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (تکویر) یعنی اس دن زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ میں بعض عرب قبائل لڑکے کو اپنے لئے عزت اور طاقت کا نشان سمجھتے تھے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبت خیال کرتے تھے۔ یہ احساس کبھی اتنا شدید ہوتا کہ اپنی لڑکی کو پیدا ہونے کے بعد زندہ دفن کر دیتے۔ اس آیت کا اولین مصداق قدیم زمانہ کے عربوں کا یہی رواج ہے۔ تاہم بالواسطہ طور پر اس حکم میں اسی نوعیت کے دوسرے واقعات بھی شامل ہوں گے۔

ایک شخص ہے جس کی بعض غفلتوں سے موقع پا کر کچھ لوگ اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ اس کو گرفتار کرتے ہیں۔ اس کو مجرم قرار دینے کے لئے سازشیں کرتے ہیں۔ اس پر بے ثبوت الزامات لگاتے ہیں فرضی عدالتیں قائم کرتے ہیں اور اس پر مقدمہ چلا کر اس کے خلاف نام نہاد قانونی فیصلے حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کو پھانسی کے تختہ پر چڑھاتے ہیں یا گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایسے تمام لوگ بھی گویا اپنے آپ کو اسی مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں جہاں عرب کا وہ قدیم جاہل انسان کھڑا ہوا ہے جس نے اپنی بے گناہ بیٹی کو گڑھے میں دھکیل کر اوپر سے مٹی بھر دی تھی۔ کیونکہ کوئی فرد ہو یا حکومت، کسی کو حق نہیں ہے کہ جرم کے شرعی ثبوت کے بغیر کسی کو اس کی جان سے محروم کر دے۔ جو لوگ کسی کو اس قسم کی سزا دیں، جو ایسے بے ثبوت فیصلے کریں، جو اس کی موافقت میں بیانات جاری کریں، جو اس قسم کے معاملہ پر راضی ہوں اور زبان یا قلم سے اس کی تائید کریں، سب کے لئے یہ اندیشہ ہے کہ قیامت کے ہولناک دن خدا غضب ناک ہو کر ان سے پوچھے: تم نے کس جرم میں میرے اس بندے کو قتل کیا تھا۔ اور پھر اگر خدا اپنے فرشتوں کو یہ حکم دے کہ میرے اس مقتول بندے کو اس کی تمام غلطیوں کے باوجود آج زندگی دے دو اور اس کے قاتلوں کو اور قتل کی حمایت کرنے والوں کو ان کے تمام شاندار کارناموں کے باوجود موت کے گڑھے میں پھینک دو تو کون ہے جو قیامت کے دن خدا کو ایسے ایک فیصلہ سے روکنے والا ہو۔

اسی طرح ایک شخص ہے جو لوگوں کو ان کی غفلتوں اور شرارتوں پر متنبہ کرتا ہے۔ وہ ان کے اوپر تنقید کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ تمام لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن پر اس کی تنقیدوں کی زد پڑتی ہے۔ وہ بگڑ جاتے ہیں اور اس شخص کے بارے میں بے بنیاد باتیں مشہور کر کے اس کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اس کے خلاف بے ثبوت شوشے چھوڑ کر اس کی دیانت داری کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا علمی اور اشاعتی بائیکاٹ کر کے اس کو گم نامی کی قبر میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کے لئے غیر ضروری مسائل پیدا کرتے ہیں اور اس کو ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ بھی درجہ بدرجہ انھیں مجرم باپوں کی صف میں شامل ہیں جن کے اوپر خدا اتنا غضبناک ہوگا کہ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں اور زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا: تو کس جرم میں گاڑی گئی تھی۔ جس طرح بیٹی کو مار کر عرب باپ کا خوش ہونا اس کے کام نہ آیا، اسی طرح ان دوسرے لوگوں کی جھوٹی خوش خیالیاں بھی ان کے کچھ کام نہ آئیں گی اور عجب نہیں کہ آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں (۱۸ اپریل ۱۹۷۹) ■

اپنے ذہن کا قصور

قرآن کی سورہ نمبر ۴ کی ایک آیت حسب ذیل ہے:

افلا یتدبرون القرآن و لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیراً	کیا لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے
النساء ۸۲	

مولانا محمود حسن دیوبندی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے۔ مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو، جو اسی مقام میں تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمایا قل کل من عند اللہ (کہو کہ سب اللہ کی طرف سے ہے) اور پھر فرمادیا وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (اور تجھ کو جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہوگیا۔"

تفسیر قرآن، صفحہ ۱۱۷

انسان کا علم محدود ہے۔ اس لئے اکثر اوقات وہ ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو صرف اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس کے اپنے ذہن کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے سنجیدگی اور ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح سمجھے بغیر کوئی رائے قائم نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی خبر معلوم ہو تو پہلے اس کی تحقیق کرو۔ جب بھی کسی کے بارہ میں کوئی ایسی بات سامنے آئے جس سے اس کی ذات یا اس کے کام کے متعلق بری رائے قائم ہوتی ہو تو محض ایک بار سن کر اس کو مان لینا صحیح نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ یا تو اس کے بارہ میں چپ رہے یا قابل اعتماد ذرائع سے اس کی تحقیق کرے۔ جب تحقیق سے بات پوری طرح ثابت ہو جائے اس کے بعد اس کو حق پہنچتا ہے کہ اس کو مانے یا اس کو بیان کرے۔

ضروری تحقیق کے بغیر کسی کے متعلق بری رائے قائم کرنا اللہ کے نزدیک گناہ ہے۔ اور دنیا میں اس کا نقصان یہ ہے کہ سماج کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے بنیاد غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غیر ضروری شکایتیں وجود میں آتی ہیں۔ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں اور آپس میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

فیصلہ خداوندی

مفسرین قرآن کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ ایک مجلس تھی جس میں یہودی تھے، عیسائی بھی اور مسلمان بھی۔ ان میں سے ہر گروہ کا یہ خیال تھا کہ وہ دوسروں سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ یہود نے کہا کہ ہم موسیٰ کے پیرو ہیں جن کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے چنا اور ان سے کلام کیا۔ عیسائیوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ کے پیرو ہیں جو اللہ کی روح اور اس کی حکمت تھے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم محمد خاتم الرسل کی امت ہیں اور ہم خیر امت ہیں جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے۔ قرآن نے اس کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہا کہ ـــــ نہ تمہاری آرزووں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزووں پر، جو شخص بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حمایتی اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو کوئی بھی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء ۱۲۳-۱۲۴) ایک اثر میں ہے کہ ایمان نہ خوش خیالیوں کا نام ہے اور نہ ظاہری نمائشوں کا۔ بلکہ اس چیز کا نام ہے جو دل میں ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔

كما ورد في الاثر (ليس الايمان بالتمني ولا بالتحلي ولكن ما وقر في القلب وصدقه العمل) .

روى جماعة من المفسرين للقرآن الكريم أن مجلسا ضم بعضا من اليهود والنصارى والمسلمين ، فزعمت كل طائفة منهم أنهم اولى الناس بدخول الجنة ـ اليهود قالوا نحن أتباع موسى الذي اصطفاه الله برسالاته وبكلامه ، والنصارى قالوا نحن اتباع عيسى روح الله وحكمته ـ والمسلمون قالوا نحن اتباع محمد خاتم النبيين وخير أمة أخرجت للناس ، فحسم القرآن ذلك وخاطب المسلمين في صراحة ووضوح بقول الله تعالى : «ليس بامانيكم ولا اماني اهل الكتاب من يعمل سوءا يجز به ولا يجد له من دون الله وليا ولا نصيرا . ومن يعمل من الصالحات من ذكر وانثى وهو مؤمن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا » النساء ١٢٣ و١٢٤

ہر مذہب کے لوگوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے تمام مذاہب سے افضل ثابت کرتے ہیں اور پھر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کا مذہب چوں کہ سب سے افضل مذہب ہے اس لئے ان کو خدا کے یہاں سب سے افضل مقام حاصل ہوگا۔

اس قسم کا عقیدہ سراسر بے بنیاد عقیدہ ہے۔ مذاہب کے درمیان جو تقسیم ہے وہ صرف محفوظ اور غیر محفوظ کی ہے نہ کہ افضل اور غیر افضل کی۔ خدا کے یہاں ہر آدمی اپنے ذاتی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا اور جو شخص اپنے عمل کے اعتبار سے جس درجہ کا ہوگا وہی درجہ اس کو ملے گا۔ درجہ بندی کا کوئی دوسرا معیار خدا کے یہاں نہیں۔

خدا کی نظر سے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص کسی شخص کو مار ڈالے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔ اور جس نے کسی کو زندگی دی تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندگی دی (مائدہ ۳۲)

عام طور پر لوگ ان بڑے بڑے مجرمین کو مجرم سمجھتے ہیں جنھوں نے "ایٹم بم" گرا کر پوری پوری بستی کو تباہ کر ڈالا ہو۔ مگر اللہ کی نظر میں ایک شخص کو قتل کر دینے والا بھی اتنا ہی بڑا مجرم ہے جتنا سارے انسانوں کو قتل کرنے والا۔ کیونکہ ایک شخص کو قتل کر کے وہ آدمی اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ انسانی جان کے بارے میں اس کے اندر احترام کی نفسیات نہیں۔ اور جو شخص ایک بندہ خدا کے قتل کے بارے میں بے خوف ہو وہ سارے بندگان خدا کے بارے میں بے خوف ہو سکتا ہے۔

خدا کی نظر میں انفرادی جرم بھی اتنا ہی بڑا ہے جتنا کوئی اجتماعی جرم۔ کسی مقام پر بڑا فساد ہو جائے یا قومی سطح پر کوئی مصیبت پیش آجائے تو تمام لوگ اس کے سلسلہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ایک شخص کو ستایا جا رہا ہو یا ایک شخص کو کوئی ظالم اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہو تو ایسے واقعہ کو لوگ معمولی سمجھتے ہیں، اس کے دفعیہ کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔ مگر خدا کی نظر میں فرد کے خلاف ظلم بھی اتنا ہی بڑا ہے جتنا کسی اجتماع کے خلاف ظلم۔

جو لوگ اجتماعی ظلم کے موقع پر سرگرمی دکھائیں اور جب انفرادی ظلم کا موقع سامنے آئے تو وہ متحرک نہ ہوں وہ معاملہ کو اپنی نظر سے دیکھ رہے ہیں نہ کہ خدا کی نظر سے اور جو لوگ معاملہ کو اپنی نظر سے دیکھیں وہ خدا کے یہاں کسی انعام کے مستحق کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھتے تو دونوں قسم کے مواقع پر متحرک ہوتے۔ جب وہ ایک قسم کے موقع پر متحرک ہوئے اور دوسری قسم کے موقع پر خاموش بیٹھے رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اٹھنا ان کے اپنے جذبات و خواہشات کے زیر اثر تھا نہ کہ خدا کے حکم کے زیر اثر۔

تلبیس

قرآن میں یہود کو جن باتوں کا مجرم قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک تلبیس الحق بالباطل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون (البقرہ ۴۲)

اور صحیح میں غلط کو نہ ملاؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔

لبس الشئ بالشئ کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ گڈ مڈ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ (لاتخلطوا الحق بالباطل)

قدیم عرب میں یہود کو مذہبی سیادت کا مقام حاصل تھا۔ مذہبی معاملہ میں کسی کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو وہ یہودی علماء کے پاس جاتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا تو عرب لوگ یہودی عالموں کے پاس جا کر پوچھنے لگے کہ ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔

پیغمبر اسلام کو ماننے سے یہود کی مذہبی بڑائی ختم ہوتی تھی۔ اس لیے انھوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ غلط غلط باتیں پھیلا کر وہ لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے لگے۔ جب کوئی شخص ان کے یہاں جا کر آپ کے بارہ میں پوچھتا تو وہ ایسا کرتے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر لوگوں کو آپ کی طرف سے مشتبہ کر دیتے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں "ہر سائل کے دل میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں۔"

ایک چیز دلیل سے ثابت ہو جائے، پھر بھی آدمی اس کو ماننا نہ چاہے تو اس کے بعد وہ یہ کرتا ہے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر اس کو بدنام کرنے کی مہم چلاتا ہے۔ جس چیز کو وہ دلیل سے غلط ثابت نہ کر سکا اس پر عیب لگا کر وہ اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس قسم کا فعل آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو گھٹانے والا نہیں۔

واقفیت ضروری

قرآن میں قیامت کی عدالت کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہاں وہی شخص گواہی دے گا جو حق کی گواہی دے اور وہ اس کو جانتا ہو (ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق وهم یعلمون ، الزخرف ۸۶)

یہی چیز دنیا کے معاملات میں بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص گواہی دینے کے لیے آیا۔ آپ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر تم نے سورج کی طرح دیکھا ہو تو گواہی دو ورنہ اس سے الگ رہو۔ (اذا رأیت مثل الشمس فاشهد والا فدع ، احکام القرآن للجصاص)

اسی بنا پر فقہاء نے شہادت کا یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم گواہی کے لیے شرط ہے۔ کوئی شخص جس واقعہ کی گواہی دینا چاہتا ہے اس کو اس واقعہ کا ذاتی علم ہونا چاہیے۔ اگر وہ متعلقہ واقعہ کا ذاتی علم نہیں رکھتا تو نہ اس کو گواہی دینا چاہیے اور نہ اس کی گواہی کا شرعی طور پر کوئی اعتبار ہے۔

اس سے معاملات میں شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو معاشرہ میں کس طرح رہنا چاہیے۔ اس کو کیا بات بولنا چاہیے اور کیا بات نہیں بولنا چاہیے۔

ایک شخص کے کسی معاملہ میں آپ رائے دینے جا رہے ہوں تو پہلے سوچ لیجئے کہ کیا آپ اس معاملہ میں ضروری واقفیت رکھتے ہیں۔ کیا اس معاملہ میں آپ کی واقفیت اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ اس کو ذاتی علم کہا جا سکے۔ اگر آپ مذکورہ معاملہ میں ذاتی علم کی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو آپ اس معاملہ میں بولیے ورنہ خاموش رہیے۔

مزید یہ کہ یہ بات کہ آپ مذکورہ معاملہ سے پوری طرح واقف ہیں یہ بھی اس وقت درست قرار پائے گا جب کہ وہ از روئے واقعہ بھی درست ہو۔ ورنہ خدا کی عدالت میں آپ مجرم قرار پائیں گے، خواہ بطور خود اپنے آپ کو واقف کار سمجھ رہے ہوں۔

اپنی دلیل آپ

قرآن کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو بظاہر صرف " بیان " معلوم ہوتے ہیں ۔ یعنی ان بیانات کے ساتھ ان کی دلیل مذکور نہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیانات اپنی دلیل آپ ہیں ۔ کیونکہ یہ الفاظ ماورار انسانیت ہیں ۔ یہ صرف خدا ہے جو ان الفاظ میں کلام کر سکتا ہے ، کوئی اور نہیں جو ان الفاظ میں کلام کر سکے ۔

" اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا " (ابراہیم ۳۲) یہ ایک ایسا جملہ ہے جو ایک خدا کے سوا کسی اور کے حق میں کبھی بولا نہ جا سکا ۔ اور یہی اس کی صداقت کی یقینی دلیل ہے ۔ کیوں کہ اتنا بڑا بیان وہی دے سکتا ہے جو واقعۃً خالق کائنات ہو ۔ کسی دوسرے کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اتنا بڑا بیان دینے کی جرأت کر سکے ۔ چنانچہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یہ کہنے کی ہمت کی ہو کہ " میں نے زمین و آسمان کو بنایا ہے "

" اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر رات کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تم کو روشنی دے ۔ اور اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر مستقل دن کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہارے لیے رات لے آئے " (القصص ۷۱) ان الفاظ کا بولنا اللہ کے سوا کسی کے لیے سزاوار نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی شخص جرأت نہ کر سکا کہ وہ یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے ۔ اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے ۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں ۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا ان کو تھامنے والا نہیں (فاطر ۴۱) ان الفاظ پر غور کیجیے ۔ کون ہے جو ان الفاظ کو بولنے کی جرأت کر سکے ۔ یہ الفاظ وہی بول سکتا ہے جو زمین و آسمان سے بلند ہو ، جو فی الواقع یہ طاقت رکھتا ہو کہ وہ زمین و آسمان کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے ۔ کوئی شخص فرضی طور پر یہ الفاظ نہیں بول سکتا ۔ یہ خدائی کلام ہے اور خدائی کلام صرف خدا ہی بول سکتا ہے ۔ کوئی انسان خدائی کلام اپنے منہ سے نکالنے پر قادر نہیں ۔

سرکشی

ایک صاحب کو اپنے ایک مسلمان بھائی سے شکایت ہوگئی۔ اس کے بعد وہ انتقامی جوش سے بھر گیے۔ انھوں نے اس مسلمان کے خلاف ہر ممکن کارروائی کرنا شروع کر دیا ——— اس کو دھوکا دینا، اس کو بدنام کرنا، اس کے خلاف جھوٹے مقدمے چلانا، غرض کمینگی کی کوئی قسم نہ تھی جس کو انھوں نے اپنے لیے جائز نہ کر لیا ہو۔

مذکورہ بزرگ سے کہا گیا کہ آپ ایک مسلمان کے خلاف ایسی غلط کارروائیاں کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ الحرب خُدعة (جنگ دھوکا ہے)

اس قسم کا قول غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالنا ہے جو خدا کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں۔ کیوں کہ اَلحربُ خُدعة ان لوگوں کے لیے ہے جو ظالموں کے خلاف دفاع پر مجبور کر دیے گیے ہوں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو خدا کی زمین میں فساد برپا کریں۔ جو کسی انسان کو ناحق ستانے کا منصوبہ بنائیں جو کسی کا حق غصب کر کے بیٹھ جائیں۔ جو خود ظالم ہوں نہ کہ مظلوم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگ مختلف قسم کی سرکشی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں قرآن میں فرمایا گیا:

سنکتبُ ما قالوا (آل عمران ۱۸۱) کلّا سنکتب ما یقول (مریم ۷۹) ہرگز نہیں، ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتے ہیں۔ اور پھر قیامت کے دن ہم ان کو بتائیں گے۔

جو لوگ سرکشی کی باتیں کرتے ہیں اور جو لوگ ان کی باتوں کو دل چسپی سے سنتے ہیں وہ اسی لیے ایسا کرتے ہیں کہ ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا ہر لفظ خدائی رجسٹر میں ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ ان کو یقین نہیں کہ وہ اپنی ہر بات کے لیے آخرت کی عدالت میں جواب دہ ہوں گے۔

ایسے تمام لوگ جو حد سے تجاوز کریں اور حق کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کریں ان سے خدا کی کتاب ابدی طور پر یہ کہہ رہی ہے کہ خدا سے ڈرو، کیوں کہ خدا تمہارے ایک ایک لفظ کو لکھ رہا ہے۔

دلیل یا دھاندلی

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ہمیشہ بینہ (دلیل) پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کا سارا سرمایہ اندھی مخالفت اور دھاندلی ہوتا تھا۔ پیغمبر کی بات حقائق کی بنیاد پر ہوتی تھی اور ان کے مخالفین کی بات محض نفسانی سرکشی کی بنیاد پر۔

یہی موجودہ دنیا میں اہل حق اور اہل باطل کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ پیغمبر خدائی سچائی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی ہر بات مبنی بر حقیقت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کے اتارے ہوئے علم کی بنیاد پر کہتا ہے، اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے، پوری کائنات اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے برعکس اس کے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں محض اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت کہتے ہیں، اس لیے ان کی بات کو علم وعقل کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہاں کوئی شخص سچ بولے تو اس کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو وہ بھی اپنی بات کے لیے الفاظ پالیتا ہے۔ لغت اور گریمر اس کا بھی ساتھ دیتے ہیں اور اُس کا بھی۔

مگر یہ آزادی صرف موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں یہ آزادی آدمی سے چھین جائے گی۔ آخرت میں وہ اس سے عاجز ہوگا کہ وہ جھوٹ بولنے کے لیے الفاظ پاسکے۔ وہ دھاندلی کو بھی ایک صحیح رویہ بتائے اور ظالمانہ کارروائی کو بھی انصاف کہہ سکے۔

آج کی دنیا جھوٹ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہے۔ آخرت کی دنیا سچ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہوگی۔

آج کی دنیا میں لوگوں کو جھوٹ کی قیمت مل رہی ہے۔ فریب اور سازش کی بنیاد پر وہ مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب سراسر وقتی ہے۔ موت آتے ہی یہ تمام بنیادیں بالکل باطل ثابت ہوں گی۔ موت کے بعد آدمی جب اگلی دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل چکی ہوگی جس پر وہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ابدی طور پر بے جگہ ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ ابدی طور پر برباد بھی۔

دین میں غلو

اسلام میں جو چیزیں منع ہیں ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو غلو کہا گیا ہے۔ یعنی حد سے تجاوز کرنا۔ غلو کا یہ فعل ہمیشہ دینی معاملات میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں نصاریٰ کو غلو سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ لا تغلوا فی دینکم (المائدہ ۷۷) یہ نہیں فرمایا کہ لا تغلوا فی کفرکم۔

میرے ہم وطنوں میں ایک صاحب تھے ان کا نام قمرالدین تھا۔ بہت مخلص آدمی تھے۔ نماز روزہ کے حد درجہ پابند تھے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے لیے وقت پر مسجد پہونچنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔ اس کی وجہ "شرعی غسل" کے بارے میں ان کا انتہا پسندانہ تصور تھا۔ جمعہ کے دن جب وہ نہانا شروع کرتے تو بار بار انھیں شبہہ ہو جاتا کہ ان کا غسل مکمل نہیں ہوا۔ فلاں جگہ کے بال تک پانی نہیں پہونچا۔ جسم کا فلاں حصہ دھونے سے رہ گیا۔ چنانچہ وہ گھنٹوں غسل خانہ میں نہاتے رہتے۔ بعض اوقات یہ مدت اتنی لمبی اور اتنی تکلیف دہ ہو جاتی کہ غسل کے عمل میں حوض کے پانی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے آنسو بھی شریک ہو جاتے۔

یہ ایک غیر ضروری قسم کا شک تھا۔ شریعت کی نظر میں یہ غلو ہے نہ کہ اسلامی احتیاط۔ غلو کی یہ برائی ہمیشہ دینی جذبہ کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اپنے انجام کے اعتبار سے وہ دین کی ضد بن جاتی ہے۔ ابتدائی نیت کے اعتبار سے وہ بظاہر معصوم ہوتی ہے مگر عملی صورت اختیار کرنے کے بعد غیر معصوم۔

اللہ کی عبادت کرنا اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن اگر کوئی عبادت گذار مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے یا ہر رات کو سارا قرآن ختم کرنے لگے تو اس طرح کا فعل عبادت میں غلو بن جائے گا۔

اسلام میں غیرت مندی کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کی غیرت اگر اس حد تک بڑھے کہ اس کو اپنے خلاف سچائی کے اعتراف میں بھی غیرت آنے لگے تو ایسی غیرت غلو کی فہرست میں شامل ہو جائے گی۔ اسلام میں اہلِ علم کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ لیکن اگر اہلِ علم کے احترام کا مطلب یہ لیا جائے کہ اہلِ علم پر تنقید نہ کرو تو یہ غلو بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دینی جذبہ کسی عمل کو دینی نہیں بناتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل خدا کے حکم اور رسول کے نمونہ کے مطابق ہو۔

قرآن میں تکرار

قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اللہ اگر چاہتا تو ہر لفظ میں ایک بالکل نئی بات کہتا۔ مگر ذہن سازی کی حکمت کے پیش نظر قرآن میں کچھ خاص مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس واقعہ کو قرآن کے مخالفین نے ایک شوشہ بنالیا اور اس کی بنا پر اس کا مذاق اڑانے لگے:

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملیٰ علیه بکرة واصیلا (الفرقان ۶)

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پچھلوں کے قصے ہیں جن کو اس نے لکھ رکھا ہے۔ پس وہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح و شام

مولانا شبیر احمد عثمانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکہ کے مخالفین اسلام کہتے تھے کہ "محمدؐ نے اہل کتاب سے کچھ قصے کہانیاں سن کر نوٹ کرلی ہیں یا کسی سے نوٹ کرائی ہیں۔ وہی شب و روز ان کے سامنے پڑھی اور رٹی جاتی ہیں۔ نئے نئے اسلوب سے ان ہی باتوں کا الٹ پھیر رہتا ہے اور کچھ بھی نہیں"

اس قسم کی باتیں وہی لوگ کہتے ہیں جو سچائی کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کو سمجھیں تو انھیں معلوم ہو کہ جس چیز کو وہ تکرار کہہ رہے ہیں وہ ایک فطری ضرورت ہے۔

دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو "تکرار" میں مبتلا نہ ہو۔ سگرٹ پینے والا ہر روز اسی سگرٹ کی تکرار کرتا ہے۔ چائے پینے والا ہر روز اسی چائے کی تکرار کرتا ہے۔ ماں یا باپ جب روزانہ اپنے بچہ کو پیار کرتے ہیں تو وہ اسی ایک چیز کی تکرار کرتے ہیں۔ ہر آدمی کی کوئی مرغوب چیز ہوتی ہے اور ہر روز وہ اسی کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس کو تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکرار آدمی کی فطرت ہے۔ البتہ جس چیز سے اسے دلچسپی ہو اس کی تکرار کرنے سے وہ نہیں اکتائے گا اور جس چیز سے اس کو دلچسپی کا تعلق نہ ہو اس کی تکرار اسے ناگوار معلوم ہوگی۔

قرآن چاہتا ہے کہ ربانی باتیں آدمی کو اس درجہ محبوب ہوجائیں کہ ان کے معاملہ میں تکرار کا احساس اس کے اندر ختم ہوجائے۔ قرآن ایسے ہی انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کا مطلوب انسان وہ ہے جس کے لئے قرآنی باتیں اتنی لذیذ بن جائیں کہ ان کی بار بار تکرار صرف اس کی لذت میں اضافہ کرے۔ وہ ان باتوں کے اعادہ سے اکتائے نہیں بلکہ ان کو اپنے ذہن کی غذا بنائے۔ ہر تکرار میں اس کو نئی لذت ملے، قرآنی مضامین کا ہر اعادہ اس کو ازسرنو معانی کے سمندر میں غرق کردے۔

امتحان کا پرچہ

آج کل یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص پیسہ کما کر اپنے لیے ایک شاندار مکان بنائے گا، اور اس کے بعد اس کے اوپر لکھ دے گا: ھذا من فضل ربی (یہ میرے رب کا فضل ہے) بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ میرے خدا کا انعام ہے۔ خدا نے مکان کی صورت میں مجھے اپنی نعمت عطا فرمائی ہے۔ مگر موجودہ شکل میں اس کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن کی یہ آیت سورہ النمل میں آئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جب ملکہ سبا حاضر ہوئی تو آپ نے اپنے مسخر جناتوں کے ذریعہ اس کا تخت یمن (مارب) سے فلسطین (یروشلم) منگایا۔ قرآن کے بیان کے مطابق، یہ واقعہ پلک جھپکنے کے درمیان ہوا۔ ڈیڑھ ہزار میل دور رکھا ہوا تخت ایک سکنڈ میں حضرت سلیمان ؑ کے پاس پہونچ گیا۔

حضرت سلیمان ؑ نے جب یہ غیر معمولی واقعہ دیکھا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری (ھذا من فضل ربی، لیبلونی أأشکر أم أکفر)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پورے قول کو سامنے رکھئے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس "فضل" کو انھوں نے اصلاً آزمائش کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کے نزدیک خدا کا یہ خصوصی معاملہ اس لیے کیا گیا کہ اس کے ذریعہ ان کو آزمائش میں ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ وہ اس پر شکر کے جذبہ سے جھک جاتے ہیں، یا فخر کے جذبہ کے تحت اس کے برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا انعام، اپنے حقیقی معنوں میں، اہل ایمان کو آخرت میں ملنے والا ہے۔ دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ دیا جاتا ہے، وہ دراصل امتحان کا پرچہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد جانچنا ہوتا ہے نہ کہ نوازش کرنا ——— اس اعتبار سے اس دنیا کے آرام کی حقیقت بھی وہی ہے جو اس دنیا کی تکلیف کی حقیقت ہے۔ دونوں ہی آدمی کے لیے آزمائش کے پرچے ہیں۔ آرام میں شکر مطلوب ہے اور تکلیف میں صبر۔ دنیا میں خدا کا اصلی انعام یہ ہے کہ وہ آدمی کو یہ توفیق دے کہ وہ آرام میں شکر کا ثبوت دے سکے اور تکلیف میں صبر کا ثبوت۔

اعتراف اور بے اعترافی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے اندر اعتراف کا مادہ نہ ہو۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے سامنے حق واضح ہو کر آئے تو وہ اس کا اعتراف کر لے۔ قرآن میں دونوں قسم کے انسان کی مثالیں دی گئی ہیں۔

ایک انسانی کردار وہ ہے جس کا ذکر سورہ مریم میں کیا گیا ہے۔ حضرت مریم نہایت پاکباز خاتون تھیں۔ وہ فلسطین کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ خاص کے تحت ان کے یہاں بغیر باپ کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ ایک پاکدامن خاتون کے لیے بڑی سخت آزمائش تھی، تاہم فرشتہ کی ہدایت پر وہ گود کے بچہ کو لے کر شہر میں آئیں۔ یہود نے جب ایک غیر شادی شدہ خاتون کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا بچہ گود میں لیے ہوئے ہے تو انھوں نے کہا: اے مریم، تو نے غضب کر دیا۔ اے ہارون کی بہن، تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ پھر یہ حرکت تجھ سے کیوں کر سرزد ہوئی۔

حضرت مریم خود کچھ نہیں بولیں۔ فرشتہ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہود نے کہا کہ ایک چھوٹے بچہ سے ہم کس طرح بات کریں۔ عین اس وقت حیرت انگیز طور پر گود کا بچہ بول اٹھا۔ اس نے نہایت فصیح زبان میں کہا کہ میں اللہ کا بندہ (مسیح) ہوں۔ اللہ نے مجھ کو کتاب دی ہے اور اس نے مجھ کو پیغمبر بنایا ہے۔

ایک چھوٹے بچہ کا اس طرح کلام کرنا انتہائی طور پر غیر معمولی تھا۔ اس طرح معجزاتی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت مریم بدکار خاتون نہیں ہیں۔ حضرت مریم کی پاکبازی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ گود کا بچہ کلام کر کے آپ کی پاکبازی کا اعلان کرے۔ مگر اس کے باوجود یہود نے حضرت مریم کو پاکباز تسلیم نہیں کیا۔ ان کی گود میں چھوٹا بچہ دیکھ کر ان کے خلاف الزام لگانے میں تو انھوں نے بہت تیزی دکھائی۔ مگر معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جو لوگ اس روش کا ثبوت دیں ان کو کبھی حق کی ہدایت نہیں ملتی۔ حق کے داخلہ کا واحد دروازہ اعتراف ہے، اور مذکورہ قسم کے لوگوں کے یہاں یہ دروازہ موجود ہی نہیں۔

تزکیہ

قرآن میں پیغمبر کے دو خاص کام بتائے گئے ہیں ـــــ تعلیم کتاب اور تزکیہ۔ تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تعلیم ہے۔ یعنی خدائی متن کو فرشتہ سے لے کر انسانوں تک پہنچانا۔ دوسری چیز تزکیہ ہے۔ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ایجوکیٹ کرنا یا باشعور بنانا کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کے فکر کو ربانی فکر بنانا۔ ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنانا کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ سوچا جائے۔ اور اس طرح فیصلہ کریں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم مصلحین اٹھے ان میں مشترک طور پر یہ بنیادی خامی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے ''تزکیہ'' سے اپنے کام کا آغاز نہیں کیا۔ تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کے کچھ احوال اس کے سامنے آئے اور ان کو دیکھ کر وہ پرجوش طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ذہن بنائے بغیر اس نے عملی اقدامات شروع کر دئے ـــــ کسی نے انگریزی استعمار سے بگڑ کر جہاد آزادی کا نعرہ لگا دیا۔ کوئی مغربی تہذیب کے غلبہ کو دیکھ کر میدان عمل میں آگیا۔ کسی کو ''شردھانند'' کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے مجاہد اسلام بنا دیا۔ کوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک سے بے چین ہو کر سرگرم عمل ہو گیا۔ کسی کو مسلم خلافت کے زوال نے جان دینے پر آمادہ کر دیا۔ وغیرہ

یہ سب کام کا غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ کام کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو تزکیہ سے شروع کیا جائے نہ کہ اقدام سے۔

تزکیہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ افراد کو دین کا صحیح علم حاصل ہو جائے۔ وہ صحیح دینی انداز میں سوچنا جان لیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پہچان سکیں۔ وہ مختلف قسم کے حالات میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ کس وقت انھیں کیا کرنا ہے اور کس وقت انھیں کیا نہیں کرنا ہے۔

تزکیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ افراد کے اندر زمانہ شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ وہ جان لیں کہ دنیا کے حالات کیا ہیں اور ان حالات میں دین کو کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

مومن ومنافق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں۔ وہ بُری بات کی تعلیم دیتے ہیں اور بھلی بات سے روکتے ہیں (التوبہ ۶۷) دوسری طرف ارشاد ہوا ہے کہ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، وہ بھلی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں (التوبہ ۷۱) اس بات کو لفظ بدل کر کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ منافق کا منافق کے ساتھ جوڑ بیٹھتا ہے اور مومن کا مومن کے ساتھ جوڑ بیٹھتا ہے۔ اِن کا مزاج اِن سے ملتا ہے اور اُن کا مزاج اُن سے ملتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ، جب کہ مومن کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ منافق کی دلچسپی دنیا اور دنیا کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اور مومن کی دلچسپی خدا اور آخرت سے۔ منافق اپنے آپ کو کسی اصول کا پابند نہیں سمجھتا، جب کہ مومن پورے معنوں میں ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ منافق اپنے کو نمایاں کرکے خوش ہوتا ہے اور مومن کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ تواضع کا رویہ اختیار کرے۔ منافق اپنے معمولی فائدے کی خاطر حقیقت کا انکار کر دیتا ہے، جب کہ مومن اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ حقیقت کا انکار کرے۔ منافق کی لذت غیر سنجیدہ چیزوں میں ہوتی ہے اور مومن کی لذت صرف سنجیدہ چیزوں میں۔ منافق ہمیشہ مصنوعی باتیں کرتا ہے اور مومن ہمیشہ سچی باتیں۔

سوچ اور مزاج کا یہ فرق مومن اور منافق کے درمیان زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی نہیں بن پاتے، ان کا ایک دوسرے سے نباہ نہیں ہوتا۔ مومن مومن سے یا منافق منافق سے جڑے تو ہم مزاج ہونے کی وجہ سے دونوں کا جوڑ بیٹھ جائے گا۔ مگر جب جڑنے والوں میں ایک مومن ہو اور دوسرا منافق تو ان کا مزاجی اختلاف انھیں ایک دوسرے سے متوحش کر دے گا۔ وقتی ملاقات ہو تب بھی انھیں ایک دوسرے سے خوشی حاصل نہ ہوگی۔ مستقل رشتہ قائم ہو تب بھی دونوں کے درمیان اس کا نبھنا سخت دشوار ہو جائے گا۔

مومن اور منافق بظاہر ایک طرح کے ہوتے ہیں مگر مزاج کا فرق دونوں میں اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک اگر مشرق کا مسافر بن جاتا ہے تو دوسرا مغرب کا مسافر۔

ایمان بالغیب

درخت کیا ہے۔ قدرت کا ایک عظیم الشان کارخانہ۔ انسانی کارخانے مزدوروں کے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ درخت میں کھرب ہا کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا رات دن کام کرتے ہیں۔ بے شمار تعداد میں پردار کیڑے اس کی تلقیح (Pollination) کے عمل میں مشغول رہتے ہیں۔ مگر محنت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے کارخانے شور اور دھواں اگلتے ہیں۔ پانی اور فضا کو گندہ کرتے ہیں۔ مگر درخت کا کارخانہ اس کے بالکل برعکس زمین کو خاموش حسن عطا کرتا ہے۔ وہ خراب ہوا (کاربن) کو خود لے کر عمدہ ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ اس طرح حیرت انگیز اہتمام کے تحت ایک درخت بنتا ہے۔ بے شمار قسم کی ضمنی پیداوار کے علاوہ اس پر خوشنما پھول کھلایا جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر پھل نکلتا ہے۔ ساری کائنات اس کو بڑھانے میں لگ جاتی ہے۔ اس کے اندر کمال کاریگری کے ساتھ غذا کا ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو ایک قیمتی ڈھکن (چھلکے) میں پیک کیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر رنگ چھڑکا جاتا ہے۔ خوشبو ڈالی جاتی ہے۔ مزہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بالآخر نہایت اعلیٰ درجہ کی ڈبہ بند غذا کی صورت میں اس کو انسان کے لئے ٹپکا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح بے شمار قسم کے پھل، ترکاریاں، غلے، گوشت، دودھ، شہد وغیرہ کائناتی اہتمام کے ساتھ رات دن انسان کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔ مگر حضرت مسیح کے حواریوں نے جب یہ کہا کہ ہمارے لئے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتارے تو جواب ملا کہ اگر تمہارے اس قسم کے مطالبہ پر خوان اتارا گیا تو تم سخت ترین آزمائش میں پڑ جاؤ گے۔ کیوں کہ اس کے بعد اگر تم نے ناشکری کی تو تم کو اتنا سخت عذاب دیا جائے گا جو کسی کو بھی نہ دیا گیا ہو (مائدہ ۱۱۵)

کیا وجہ ہے کہ عام حالات میں ہر وقت خدا کی طرف سے بے شمار تعداد میں غذا فراہم کی جا رہی ہے۔ مگر انھوں نے ایک بار آسمان سے غذا اتارنے کو کہا تو ان کو اتنا سخت انتباہ دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزانہ جو غذائیں اتر رہی ہیں وہ اسباب کے پردے میں اتر رہی ہیں۔ جب کہ حواریوں کا مطالبہ یہ تھا کہ اسباب کے پردہ کو ہٹا کر برہنہ انداز میں ان کے لئے غذا اتاری جائے۔ اس قسم کا واقعہ امتحان کی اس پوری اسکیم کو ختم کر دیتا ہے جس کے تحت انسان کو اس دنیا میں رکھا گیا ہے۔ اسی لئے حواریوں کے مطالبہ پر حضرت مسیح نے فرمایا:

اتقوا اللہ ان کنتم مومنین (مائدہ ۱۱۲) — اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو

یعنی ایمان تو یہ ہے کہ بغیر دیکھے یقین کرو۔ جب تم کو دکھا دیا جائے تو اس کے بعد ایمان کی کیا قیمت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بندے کا سارا معاملہ غیب کا معاملہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ غیب کو نہیں کھولتا (آل عمران ۱۷۹) یہاں ہدایت کی شرط یہ ہے کہ آدمی حالتِ غیب میں ایمان لانے کے لئے تیار ہو (بقرہ ۳) وہ غیب میں رہتے ہوئے اللہ سے ڈرے (ق ۳۳) غیب کی جنت انھیں لوگوں کے لئے ہے جو غائبانہ طور پر اس کا

یقین کریں (مریم ۶۱) اللہ کے دین کی نصرت وہی معتبر ہے جو غیب میں رہ کر کی جائے (حدید ۲۵) اس طرح غائبانہ طور پر ایمان کا ثبوت دینے والوں ہی کے لئے خدا کے یہاں بخشش ہے اور عظیم مرتبے اور انعامات ہیں (ملک ۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سارا امتحان اسی بات کا ہے کہ کون حالت غیب میں مومن بنتا ہے اور کون حالت شہود میں۔ جو لوگ شہود (حقائق کے کھل جانے کے بعد) مومن بنیں، ان کے ایمان کی کوئی قیمت اللہ کے نزدیک نہیں (یونس ۹۱) مومن دراصل وہی ہیں جو غیب کا پردہ پھٹنے سے پہلے غیب کی باتوں کو مان لیں ـــــ جو شخص خدا کی نعمتوں میں اپنا حصہ پانا چاہتا ہے اس کو خدا پر اس وقت یقین کرنا ہے جب کہ ابھی وہ غیب میں ہے۔ اس کو اس آخرت کے لئے جینا ہے جس کو اس نے دیکھا نہیں۔ اس کو دنیا کی ان نعمتوں کا اعتراف کرنا ہے جس میں اس کو حصہ نہیں دیا گیا۔ اس کو ان ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جس کا فائدہ موجودہ زندگی میں نہیں ملتا۔ اس کو ان داعیان حق کا ساتھ دینا ہے جن کے داعیٔ حق ہونے کی گواہی دینے کے لئے ابھی فرشتے ظاہر نہیں ہوئے۔ اس کو ایک ایسی چیز کو اپنی منزل بنا کر سفر کرنا ہے جو موجودہ دنیا میں کبھی نہیں آتی۔

اس امتحان کا سب سے نازک پہلو اللہ کے داعی کو پہچاننا اور اس کا ساتھ دینا ہے۔ اللہ کا داعی اپنے زمانہ میں ایک "چھپی ہوئی حقیقت" ہوتا ہے۔ اللہ اپنی بے آمیز دعوت کے اعلان کے لئے جس شخص کا انتخاب کرتا ہے وہ ہمیشہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کے ساتھ دنیوی عظمتیں جمع نہ ہوئی ہوں۔ دنیوی عظمتیں جہاں ختم ہو جائیں وہاں سے حق کو پانے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے مخاطبین دعوت کو اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ وہ ایک ایسی عظمت کو پہچان لیں جو ظاہری عظمتوں سے خالی ہو کر ان کے سامنے آئی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان میں خدا کے ظہور کو دیکھ لیں جو چھپے ہوئے خدا کی تجلیاں لئے ہوئے ہے مگر دکھائی دینے والے انسانوں کی تجلیات سے خالی ہے۔

دنیوی عظمتیں ہمیشہ ایسے لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں جو اپنی ساری طاقت دنیا کمانے میں لگا دیتے ہیں۔ جن کے اتفاقی حالات ان کو تاریخی گدیوں میں سے کسی گدی پر پہنچا دیتے ہیں۔ جو مروجہ آوازوں میں آواز ملا کر عوامی قیادت حاصل کر لیتے ہیں۔ جو حکومتی منصب یا سیاسی اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔ مگر اس قسم کی چیزیں کسی کو بے آمیز سچائی سے محرومی کی قیمت پر ملتی ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ اس لطیف نفسیات سے خالی ہوتے ہیں جس کے اندر خدا کا فیضان ہدایت اترے، اس لئے ایسے لوگ کبھی وہ شخص نہیں بنتے جن کو خدا اپنی نمائندگی کے لئے چنے اور ان کے ذریعہ سے اپنے دین کا اعلان کرائے۔

تاریخ کے ہر دور میں پیغمبروں کو جھٹلایا گیا اور یہ جھٹلانے والے ہمیشہ وہ لوگ تھے جو اپنے کو دین خداوندی کا علم بردار سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان لوگوں نے وقت کے اُن دینی پیشواؤں کا دامن پکڑ رکھا تھا جو عظمت کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عظمتوں والے دین میں خدا کو پا کر مطمئن تھے۔ حالاں کہ خدا جہاں ان کو اپنے سایۂ رحمت میں لینے کے لئے پکار رہا تھا وہ دین وہ تھا جو ظاہری عظمتوں اور رونقوں سے خالی تھا۔ وہ اس یقین میں تھے کہ انھوں نے خدا کا مضبوط دامن پکڑ رکھا ہے۔ حالاں کہ ان کے ہاتھ میں فرضی خوش خیالیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

امتحان کس بات کا

قرآن میں آدم کا قصہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے: "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس نے کہنا نہ مانا اور تکبر کیا اور انکار کرنے والا ہو گیا۔ اور ہم نے کہا: اے آدم تم اور تمہاری عورت جنت میں رہو اور اس میں سے با فراغت کھاؤ جہاں چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالم قرار پاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو لغزش میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس عیش سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ ہم نے کہا: تم سب اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تم کو زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک مدت تک (بقرہ)

اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ ص ۷۶) اس کے مقابلہ میں فرشتے ذاتی بڑائی کے احساس سے خالی تھے۔ وہ ساری بڑائی صرف اللہ کے لئے تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے اللہ کا حکم پاتے ہی وہ ایک حقیر مخلوق کے آگے سجدے میں گر پڑے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ابتدا میں دو واضح کردار انسان کے سامنے رکھ دئے۔ ایک ابلیسی کردار۔ دوسرا ملکوتی کردار۔ ابلیس رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ مگر انسان کو تمام ترغیبات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم مسلک بنانا ہے۔

کوئی دولت، شہرت، اقتدار میں بڑھ جائے تو آدمی جلنے لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے سوا کسی کو بڑا دیکھنا نہیں چاہتا۔ غیر شخص کی زبان سے حق کا اعلان ہو تو وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کیونکہ ایسا کرنا دوسرے کی فکری عظمت تسلیم کرنے کے ہم معنی نظر آتا ہے، کسی پر تنقید کر دی جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ ناقد اس کی بڑائی کو چیلنج کر رہا ہے۔ خاموش تعمیری کام میں ساتھ دینے کے لئے بمشکل چند آدمی ملتے ہیں۔ اور کسی حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلائیے تو بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کی سیاست میں بڑے کی بڑائی کا انکار کرنے کے جذبہ کو تسکین مل رہی ہے۔ انسان کی اصل کمزوری ہے اپنے سوا کسی کے لئے بڑائی کو تسلیم نہ کرنا۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی اصل خوبی اللہ کی نظر میں یہ ہے کہ آدمی ذاتی بڑائی کے احساس کو مٹا دے اور اللہ کا حکم آتے ہی فوراً جھک جائے خواہ یہ جھکنا اپنے سے کمتر کا اعتراف کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

جو لوگ "ظالم" حکمرانوں کے خلاف اٹھتے ہیں بہت جلد ان کے گرد انسانوں کا غول جمع ہو جاتا ہے۔ ہجوم کو دیکھ کر اس قسم کے قائدین اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کے ملک میں ظلم کرنے والا بس وہی ایک شخص ہے جو اقتدار کی گدی پر بیٹھا ہوا ہے۔ باقی تمام لوگ عدل و انصاف کے عاشق ہیں۔ اگر اس ظالم کو کسی طرح تخت سے ہٹا دیا جائے تو اس کے بعد ہر طرف انصاف کا سیلاب بہہ پڑے گا۔ ہر طرف امن کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ مگر یہ شدید ترین غلط فہمی ہے۔ "ظالم" کے اقتدار کو چیلنج کرنے والی تحریکوں کے گرد انسانوں کا غول حقیقۃً ملکوتی نفسیات کے تحت جمع نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس غیر ملکوتی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا شکار ہمیشہ تمام قومیں ہوتی رہی ہیں۔ کسی کے اقتدار کو چیلنج کرنا اس نفسیات کے لئے مرغوب ترین چیز ہے۔ جب کوئی قائد اس قسم کا منفی نعرہ

لے کر اٹھتا ہے تو یہ نفسیات مدد کرتی ہے اور لوگ بآسانی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ظلم" کو ہٹانے کے نام پر جتنی تیزی سے اتحاد قائم ہوتا ہے، "عدل" کو قائم کرنے کے وقت وہ اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو گرانے کے لئے اٹھنا غیر ملکوتی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ ایسی تحریکیں اٹھانا زمین میں فساد برپا کرنا ہے نہ کہ اصلاح اور انصاف قائم کرنا۔ بے دینی کو اگر دین کا نام دے دیا جائے تو محض نام کی وجہ سے وہ دین داری نہیں ہو جائے گی۔

ابلیس کو انسان کے اوپر کوئی اقتدار حاصل نہیں۔ اس کے بہکانے کا طریقہ تزئین (حجر ۳۹) ہے۔ یعنی غلط روش کو صحیح بنا کر دکھانا۔ اسی تدبیر کے ذریعہ وہ رات دن اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ انسان کو اپنا ہم مسلک بنائے۔ ہر وہ موقع جہاں حق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے سامنے "جھک" جائے، جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اپنے مقابلہ میں دوسرے کی صداقت کا اعتراف کرلے، بس وہیں ابلیس آجاتا ہے اور آدمی کی نفسیات میں داخل ہو کر اس کو اکسانے لگتا ہے کہ وہ فرشتوں والی روش پر نہ جائے اور اس کی اپنی روش کو اختیار کرلے۔ وہ "جھکنے" کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرے۔ انسانی تعلقات کی تمام برائیاں خواہ وہ خاندان کے اندر ہوں یا خاندان سے باہر، ہمیشہ کسی نہ کسی شکایت پر شروع ہوتی ہے۔ ایک خلاف مزاج بات آدمی کے سامنے آتی ہے اور اس پر وہ بپھر اٹھتا ہے۔ ہر ایسے موقع پر ایک طرف خالص حق کا تقاضا ہوتا ہے اور دوسری طرف انانیت اور بے انصافی کا۔ مگر آدمی حق کے تقاضے کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے بھائی کا عدو (دشمن) بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہی ہے۔ اسی قسم کے معاملات میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون وہ تھا جو فرشتوں کی راہ پر چلا اور کون تھا جس نے ابلیس کے طریقہ کو اختیار کیا۔ کس نے ابدی جنت کا استحقاق پیدا کیا اور کون اس کا مستحق ٹھہرا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ پیش آتا ہے، اس وقت ایک روش وہ ہوتی ہے جو حق کے مطابق ہے۔ دوسری وہ ہوتی ہے جو ضد، نفرت، انانیت، خود غرضی اور انتقام جیسے جذبات سے ابھرتی ہے ۔ دوبارہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ ایک شخص کی زندگی میں اس تاریخ کو دہرایا جائے جو تخلیق آدم کے وقت پیش آئی تھی۔ ایسے موقع پر خدا اپنے نبیوں کے ذریعہ بھیجی ہوئی ہدایت کی زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ "اے بندے حق کے آگے جھک جا"۔ دوسری طرف شیطان اس کو ورغلا رہا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ انانیت والے اس طریقے کو اختیار کرے جو خود اس نے تخلیق آدمؑ کے وقت اختیار کیا تھا۔ ساری انسانی تاریخ اسی دو طرفہ کشمکش کی داستان ہے۔ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو یا غریب، جاہل ہو یا عالم، لیڈر ہو یا پیرو، عورت ہو یا مرد، سب اسی دو طرفہ پکار کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے یہ آزمائش روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں پیش آتی ہے اور کسی کے لئے بڑے بڑے قابل ذکر واقعات میں۔ کوئی اپنے پڑوسی، اپنے رشتہ دار، اپنے کرایہ دار، اپنے شریک تجارت کے مقابلہ میں اس امتحان میں کھڑا کیا جاتا ہے اور کوئی قوموں اور حکومتوں کے مقابلہ میں۔ ہر بار جب ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کسی معاملہ پر عداوت ابھرتی ہے تو اس امتحان کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی حق کے آگے "جھکنے" کی روش اختیار کرے، وہ فرشتوں کا ساتھی بنا اور جو شخص انانیت کے طریقہ پر چلے وہ ابلیس کی برادری میں شامل ہو گیا۔ ایک کے لئے ابدی جنت ہے اور دوسرے کے لئے ابدی جہنم۔

ہم کہاں ہیں

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسی ابن مریم ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون ۔ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون (المائدہ ۷۹ ۔ ۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر گئے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو برے کام سے روکتے نہ تھے جو وہ کر رہے تھے۔ کیسی بری روش تھی جو انھوں نے اختیار کی۔

یہود کی حیثیت قدیم زمانہ میں وہی تھی جو آج مسلمانوں کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلم معاشرہ کے بارے میں خدا کے قانون کو بتا رہی ہے۔ اس کے مطابق مسلم معاشرہ کا حد سے گزرنا یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو ستائیں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں۔ ایسے وقت میں خدا کی طرف سے یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جو شخص یہ دیکھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے وہ فوراً اس کو روکنے کے لئے متحرک ہو جائے۔ کسی معاشرہ کے افراد میں اگر یہ روح ختم ہو جائے تو وہ مسلم معاشرہ خدا کی نظر میں ملعون ہے۔ اس پر خدا کی لعنت نازل ہوگی نہ کہ خدا کی رحمت۔

موجودہ مسلم معاشرہ کو دیکھئے تو آج اس کی حالت یہی ہو رہی ہے۔ ہر بستی اور ہر محلہ میں ہر روز ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستا رہا ہے۔ جس شخص کے پاس بھی کوئی پیسہ یا کوئی زور آگیا ہے اس کا دماغ گھمنڈ کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ کسی مسلمان بھائی سے اگر اس کو معمولی شکایت بھی پہنچ جائے تو اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک وہ اس مسلمان کو ذلیل نہ کرے۔ وہ اس کی بربادی کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔

مسلم معاشرہ میں آج ہر جگہ اور ہر وقت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر کوئی کسی کو روکنے والا نہیں۔ کوئی کسی کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ البتہ ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی فوج تیار ہوگئی ہے جو مسلمانوں کی مظلومیت پر تقریریں کرنے اور مضامین لکھنے کو اپنا قیادتی پیشہ بنائے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کی قومی مصیبت پر لفظی بیان دینے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی انفرادی مصیبت کے لئے کوئی نہیں دوڑتا۔ دوسرے کی یزیدیت کا اعلان ہر ایک کر رہا ہے مگر اپنی یزیدیت کی خبر کسی کو نہیں ــــــ آدمی کے الفاظ کو سننے والا سب سے پہلے خدا ہوتا ہے، پھر یہ لوگ اپنے جھوٹے الفاظ آخر کس کو سنا رہے ہیں۔

مومن کی معاشی زندگی

یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ○ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون ○ واذا راوا تجارۃ اولھوا ن انفضوا الیھا وترکوک قائماً، قل ماعند اللہ خیر من اللھو ومن التجارۃ، واللہ خیر الرازقین ○ (جمعہ۔ رکوع آخر)

"اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کی نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف دوڑ پڑو، اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کا رزق تلاش کرو، اور اللہ کو خوب یاد کرو، تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ اور جب دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ تماشا اور تجارت سے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین رازق ہے۔"

یہ آیتیں پہلی بار ایک خاص موقع پر ایک خاص معاملے کے بارے میں اتری تھیں مگر ان میں ہمارے لئے دائمی نصیحت ہے۔ دراصل اس میں مسلمانوں کی معاشی زندگی کا وہ اصول بتایا گیا ہے جس کے مطابق انھیں ہمیشہ زندگی گزارنی چاہئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ (یثرب) پہنچے تو وہاں ایک بار بڑا سخت قحط پڑا۔ مقامی بازار میں غذائی چیزیں نایاب ہو گئیں۔ اس زمانے میں ایک تاجر دحیہ بن خلیفۃ الکلبی شام جا کر وہاں سے آٹا، گیہوں، زیتون کا تیل وغیرہ لاتا اور مدینہ کے بازار میں فروخت کرتا۔ اس کا معمول تھا کہ جب وہ شہر میں داخل ہوتا تو آگے آگے طبل بجواتا، جو اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ خوراک سے لدا ہوا قافلہ آگیا ہے۔ ایک بار جمعہ کا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے تھے کہ عین اسی کے درمیان طبل کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ خطبہ چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑے۔ کیونکہ یہ ڈر تھا کہ اگر شروع میں نہ پہنچے تو سامان فروخت ہو جائے گا۔ اور پھر خریداری کے لئے اگلی آمد کا انتظار کرنا پڑیگا۔ جب جانے والے جا چکے تو رسول اللہ نے پوچھا ——— "اب کتنے لوگ رہ گئے ہیں؟" جواب دیا گیا کہ بارہ مرد اور ایک عورت۔ آپ نے فرمایا

والذی نفسی بیدہ لو تتابعتم حتی لم یبق منکم احد لسال بکم الوادی نارا۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر تم سب لوگ چلے جاتے حتی کہ کوئی

ایک بھی یہاں نہ رہ جاتا تو یہ وادی تمہارے لئے آگ کی وادی بن جاتی ۔ (تفسیر ابن کثیر)
معلوم ہوا کہ یہ اقتصادی غلطی جو مسلمانوں سے ہوئی یہ اتنی بڑی غلطی تھی کہ اس کے جرم میں ان پر پتھر برس سکتا تھا، اور ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین ان کے لئے انگارہ بن سکتی تھی، مگر چند آدمیوں کی وجہ سے اللہ نے اپنا رحم فرمایا۔ اللہ نے اس موقع پر مندرجہ بالا آیتیں نازل فرمائیں اور یہ بتایا کہ مسلمانوں کو اپنی روٹی اور معاش کے مسئلہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جس سے وہ خدا کے محبوب بن سکتے ہیں اور خدا کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

اس حیثیت سے جب ہم ان آیتوں پر غور کرتے ہیں تو ہماری معاشی زندگی کے لئے پہلا اصول یہ ملتا ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ ایک طرف ہماری خرید و فروخت ہو اور دوسری طرف ذکر الہٰی کی پکار ہو تو ہم خرید و فروخت کو چھوڑ دیں اور ذکر الہٰی کی طرف دوڑ پڑیں (فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ) ہم اپنے معاشی دھندوں میں اسی وقت تک آزاد ہیں جب تک خدا کی کوئی بات ہماری سرگرمیوں سے ٹکرا نہ رہی ہو جب بھی دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہو تو لازماً ہمیں خدا کو لینا چاہیئے، نہ کہ معاش کے تقاضوں کو۔

ہماری معاشی زندگی کے لئے دوسرا اصول جو ان آیتوں میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم حصول رزق میں مشغول ہوں تو ایسا نہ ہو کہ بس وہی ہمارا سب کچھ بن گیا ہو، بلکہ اس کے ساتھ ہم خدا کو خوب یاد کر رہے ہوں۔ (وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا) ہمارے دل و دماغ میں خدا بسا ہوا ہو۔ اور ہماری زبان سے بار بار ایسے کلمات ٹپک رہے ہوں جو یہ بتاتے ہوں کہ ظاہری طور پر اگرچہ ہم معاشی دھندے میں مشغول ہیں مگر ہماری توجہ اور ہماری اصل سوچ ہر آن خدا کی طرف لگی ہوئی ہے

ہماری معاشی زندگی کا تیسرا اہم اصول وہ ہے جو آخری آیت میں بتایا گیا ہے۔ یعنی ہماری معاشی کامیابیاں یا ہماری زندگی کے لئے معاش کی اہمیت کبھی ہم کو اس دھوکے میں نہ ڈالے کہ یہی سب سے بڑی چیز ہے یا یہی ہماری زندگی کا اصل مسئلہ ہے۔ بلکہ جو کچھ خدا کے پاس ہے اسی کو ہم سب سے بڑی چیز سمجھتے ہوں (مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ) نہ معاشی ناکامی ہم کو اس احساس میں مبتلا کرے کہ ہم تو بالکل لٹ گئے، اور اب ہمارے لئے اس دنیا میں کچھ نہیں رہا، اور نہ معاشی کامیابی ہمارے اندر یہ گھمنڈ پیدا کرے کہ ہمیں جو کچھ پانا تھا وہ ہم نے پالیا۔ بلکہ ہر حال میں ہم خدا کی رحمت

اور اس کے اُخروی انعام ہی کو اصل اور سب سے بڑی چیز سمجھتے ہوں۔

یہ تین اصول ہیں جو ہماری معاشی زندگی کو مسلمان بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ اگر یہ تین باتیں ہماری زندگی میں شامل نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود تو مسلمان ہیں مگر ہماری معاشی زندگی

زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ جوڑے۔ وہ اللہ کے مشن میں اپنے آپ کو مشغول کرے۔ وہ اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا زیادہ شامل کرے کہ ہر وقت اس کو اسی کی یاد آتی رہے۔ اسی میں آخرت کی کامیابی ہے جہاں آدمی کو مرنے کے بعد جانا ہے اور مستقل طور پر رہنا ہے۔

اس کے بعد جہاں تک زندگی کے معاشی تقاضوں کا سوال ہے ان کے لئے اجازت ہے کہ آدمی بقدر ضرورت ان میں مشغول ہو۔ مگر معاشی زندگی کو جائز زندگی بنانے کے لئے ان تین شرطوں کا لحاظ ضروری ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔

زندگی اپنی تمام سرگرمیوں کے ساتھ اس بات کا امتحان ہے کہ ہم کس چیز کو اپنا خیر بناتے ہیں۔ لہو اور تجارت کو یا ذکر اللہ اور اطاعت رسول کو۔ دنیا میں کچھ چیزیں وہ ہیں جن میں مادی نفع ہے اور اس بنا پر آدمی ان کی طرف دوڑتا ہے۔ اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن میں وقتی تسکین اور ظاہری نمود و نمائش ہے اور اس لئے آدمی ان کی طرف کھنچتا ہے۔ ان چیزوں میں نفس انسانی کے لئے خواہ کتنی ہی کشش ہو مگر وہ حقیقی خیر نہیں ہیں۔ یہ موت سے پہلے کی مختصر زندگی کے کھیل تماشے ہیں جو موت کے بعد کی مستقل زندگی میں باقی نہیں رہیں گے۔ مومن وہ ہے جو اللہ کی یاد میں جئے اور اطاعت رسول کو اپنا شیوہ بنائے۔ کیونکہ یہی وہ "خیر" ہے جو موت کے بعد مستقل زندگی میں آدمی کے کام آنے والا ہے۔

اس دنیا میں مومن کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرے، وہ پوری طرح آخرت کی طرف متوجہ رہے۔ یہی کسی کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ مگر موجودہ دنیا اس طرح بنائی گئی ہے کہ یہاں آدمی کو بھوک پیاس لگتی ہے۔ یہاں اس کو مکان اور دوسرے اسباب حیات درکار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دو مختلف تقاضوں کے درمیان توازن کیسے قائم ہو۔ دو متضاد چیزوں میں کیا نسبت تلاش کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی چیز کو آدمی اپنا مقصد بنائے اور دوسری چیز کو ضرورت۔

ایمان بڑھتا ہے

ومن یقترف حسنة نزدلہ فیہا حسناً (الشوریٰ ۲۳) | اور جو شخص نیکی کرے گا ہم اس کے لئے اس کی خوبی بڑھائیں گے۔

نیکی کرنے والے کی خوبی میں اضافہ کرنے کا مطلب کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ نیکی کے ثواب میں سے یہ ہے کہ نیکی کے بعد نیکی کی توفیق حاصل ہو اور برائی کے بدلہ میں سے یہ ہے کہ برائی کے بعد آدمی کو اور برائی کا موقع دیا جائے (قال بعض السلف ان من ثواب الحسنة الحسنة بعدھا ومن جزاء السیئة السیئة بعدھا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث صفحہ ۱۱۴)

نیکی کرنا انسان جیسی مخلوق کے لئے ایک شعوری واقعہ ہے۔ آدمی جب ایک نیکی کرتا ہے تو وہ ایک برائی کو ارادی طور پر چھوڑتا ہے اور ایک نیکی کو ارادی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اس طرح ایک حقیقی نیکی کرنے والا آدمی نیکی کرکے اپنے شعور اور ارادہ کو متحرک کرتا ہے۔ وہ اپنی نفسیات کو جگاتا ہے اور اپنی روح کے اندر آمادگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نیکی آدمی کو ایک نیا انسان بنا دیتی ہے۔ ہر نیکی کے بعد آدمی مزید اور نیکی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نیکی موجودہ دنیا میں ایک عمل ہے اور اسی کے ساتھ مزید عمل کا محرک بھی۔

دنیا میں ایک جمادات ہیں اور دوسرے نباتات۔ پتھر ایک جامد چیز ہے۔ وہ بس ایک حال میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے برعکس درخت ایک نمو پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ قرآن میں مومن اور ایمان کی مثال درخت سے دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا معاملہ پتھر جیسا معاملہ نہیں ہے کہ بس ایک حالت پر پڑا رہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اس پر کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے۔ یہاں قرآن کے چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

جب قرآن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (الانفال ۲)

خدا کے لئے قربانی کے مواقع کو دیکھ کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (آل عمران ۱۷۳)

اہل ایمان کے تقویٰ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے (محمد ۱۷)

ہدایت پانے والوں کی ہدایت برابر بڑھتی رہتی ہے (مریم ۷۶)

ایمان والوں کے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے (الاسراء ۱۰۹)

اہل ایمان کی معرفت بڑھتی رہتی ہے (طٰہٰ ۱۱۴)

جو لوگ واقعی ایمان کی دولت پالیں ان کا ایمان اسی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ نہ پائیں ان کے لئے ایمان بس ایک جامد چیز ہوتی ہے، وہ بڑھنے اور ترقی کرنے والی چیز نہیں ہوتی۔

قال البیہقی عن عطاء بن یسار ان عبداللہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعالَ نؤمن بربنا ساعۃً۔ فغضب الرجل وقال اولسنا بمؤمنین قال بلیٰ ولکنا نذکر اللہ فنزداد ایماناً

عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ کچھ دیر کے لئے اپنے رب پر ایمان لائیں۔ ساتھی یہ سن کر غصہ میں آگیا اس نے کہا کہ کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ حضرت ابن رواحہ نے کہا کہ ہاں ہم مومن ہیں۔ مگر ہم اللہ کی یاد کرتے ہیں تو اس سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

مذکورہ آدمی کے نزدیک ایمان کا مطلب یہ تھا کہ توحید کا کلمہ (لا الٰہ الا اللہ) پڑھ لیا جائے۔ کلمہ کی ادائگی کے بعد اس کے نزدیک بات پوری ہو جاتی تھی۔ مگر حضرت عبداللہ بن رواحہ خدا کو اس کے ان کمالات کے ساتھ پائے ہوئے تھے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ پہلے آدمی کے نزدیک اگر کلمہ پڑھ کر بات ختم ہوتی تھی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کے نزدیک اس کے بعد بات شروع ہوتی تھی۔ خدا کا تصور ان کے ذہن میں اس طرح آتا تھا کہ وہ لامحدود کمالات کا خزانہ ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ان کے نزدیک ایسی چیز تھی جو لامحدود طور پر جاری رہے۔ وہ خدا میں جینے والے تھے۔ اور جو شخص خدا میں جئے وہ برابر خدا کی یاد کرتا رہے گا، اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ اس کی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔

قال عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، لو طہرت قلوبکم ما شبعتم من کلام ربکم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر تمہارے دل پاک ہو جائیں تو اللہ کی بات سے تم کو سیری نہ ہو۔

کسی بات سے سیر ہونے یا نہ ہونے کا تعلق آدمی کے ظرف سے ہوتا ہے۔ چھوٹا گڑھا تھوڑے سے پانی سے بھر جاتا ہے۔ مگر سمندر کو پانی کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بھرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اگر آدمی کے اندر کا ظرف یا اس کی سمائی کم ہو تو وہ ذرا سی بات سے بھر جائے گا۔ اور اگر اس کی سمائی بہت زیادہ ہو تو اس کو کبھی سیری حاصل نہیں ہوگی۔

ایک عام آدمی توحید کا مطلب صرف یہ جانتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لیا جائے۔ "کلمہ توحید" کا تلفظ کرنے کے بعد اس کو ایسا لگتا ہے کہ بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے پاس کچھ اور نہیں رہتا جس کو وہ سوچے یا اپنی زبان سے کہے۔ مگر جو شخص "توحید" کی حقیقت کو پا جائے اس کے پاس توحید کے

موضوع پر کہنے کے لئے اتنی زیادہ بات ہوگی جو کبھی ختم نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں سائنس دانوں نے کائنات کو دریافت کیا ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی دنیا کو دریافت کیا ہے جس کے ایک ایک ذرہ کی تفصیلات اتنی زیادہ ہیں جو کبھی بیان نہ کی جاسکیں۔ پھر جو شخص کائنات کے خالق کو دریافت کرے اس کے پاس تو علم کا ایسا بھنڈار ہونا چاہئے جو سارے انسانی الفاظ بولنے کے بعد بھی ختم نہ ہو۔ جو دنیا کے تمام قلم اور دنیا کی تمام سیاہی کو استعمال کرنے کے بعد بھی لکھنے سے رہ جائے۔

اگر آپ نے خدا کو دریافت نہیں کیا ہے تو آپ کے پاس خدا کے نام سے بس چند الفاظ ہوں گے۔ لاالٰہ الا اللہ کا فقرہ زبان سے ادا کرنے کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہوگا گویا بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد آپ اگر مزید کچھ جانیں گے تو وہ بس اسی فقرہ کی بے سوچی بھی تکرار ہوگی۔ لیکن اگر آپ واقعۃً خدا کو پالیں تو خدا کے بارہ میں آپ کے پاس اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو لکھنے اور بولنے سے کبھی ختم نہ ہوں۔ جن کے بارہ آپ کبھی سیر نہ ہوسکیں۔

خدا کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لئے خدا کی معرفت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوسکتی۔ جس طرح خدا لامحدود ہے اسی طرح خدا کی معرفت بھی لامحدود ہے۔ جس آدمی کی معرفت خداوندی لامحدود نہ ہو، اس نے ابھی حقیقی خدا کو نہیں پایا ہے۔ وہ کسی "محدود" میں اٹکا ہوا ہے، وہ ابھی "لامحدود" تک نہیں پہنچا۔

کوئی اندھیرے کی طرف جا رہا ہے کوئی اجالے کی طرف

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیٰئھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمٰت اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون (بقرہ ۲۵۷)

اللہ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو وہ اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لاتا ہے۔ اور جو منکر ہوئے ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں ایسے لوگ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اندھیرے سے نکل کر اجالے میں جانا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے باطل کا راستہ کھلا ہوا ہو، مگر وہ اس کو چھوڑ کر حق کے راستہ کی طرف جائے۔ اور اجالے سے نکل کر اندھیرے میں جانا یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق کا راستہ کھلا ہوا ہے مگر وہ اس کو چھوڑ کر باطل کے رخ پر چل پڑتا ہے۔ ایک شخص اسٹیشنری کی دکان کرتا ہے۔ محلہ کا ایک آدمی اس کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو ایک قلم چاہئے۔ اس نے دیکھ کر دس روپیہ کا ایک قلم پسند کیا۔ اس نے کہا کہ یہ مجھے دے دو، میں کل آؤں گا اور اس کی قیمت تم کو ادا کر دوں گا۔ دکان دار نے قلم دے دیا۔ کل آئی اور گزر گئی۔ مگر آدمی نہ دکان پر آیا اور نہ پیسہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ آدمی دکان دار کو ملا۔ دکان دار نے پیسہ کا تقاضا کیا۔ اب اس آدمی کے لئے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ کہتا کہ "معاف کیجئے، مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ میں ابھی آپ کو پیسہ دیتا ہوں" اس کے بعد وہ دکان دار کو دس روپے ادا کر دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دکان دار کا تقاضا سنتے ہی بگڑ گیا۔ اس نے کہا "آپ دس روپے کے لئے مجھ کو بے عزت کر رہے ہیں۔ یہ کوئی مانگنے کا طریقہ ہے۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کسی شریف آدمی سے کہیں سر بازار پیسہ مانگا جاتا ہے" وہ اس طرح لڑ جھگڑ کر چلا گیا اور پیسہ نہیں دیا۔

ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت تاریکی سے روشنی کی طرف جانے کی صورت ہے اور دوسری صورت روشنی سے تاریکی کی طرف جانے کی۔ جس آدمی کا ساتھی خدا ہو اس کا ذہن خدا کی توفیق سے حق کو ماننے اور امانت کو ادا کرنے کے رخ پر چلتا ہے۔ وہ انکار کے بجائے اعتراف کو اپنا شیوہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جس کا ساتھی شیطان ہو وہ شیطان کی ترغیب سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کا ذہن حق کو جھٹلانے اور امانت کو ادا نہ کرنے کی طرف چلنے لگتا ہے۔ وہ اعتراف کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انصاف کے بجائے ظلم کے راستہ پر دوڑ پڑتا ہے۔

یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے، جب بھی کوئی معاملہ سامنے پیش آئے، خواہ وہ ایک دینی پیغام کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا ہو یا لین دین کے ایک معاملہ میں حق کو ادا کرنے یا حق کو ادا نہ کرنے کا سوال ہو، ہر معاملہ میں آدمی کے سامنے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک اجالے کا اور دوسرا اندھیرے کا۔ اگر آدمی کا ساتھی خدا ہو تو اس کے ذہن کی پٹری اعتراف اور تسلیم اور ادائگی حق کے رخ پر چلتی ہے۔ اور اگر اس کا ساتھی شیطان ہو تو وہ اس کے خیال کو

اس طرح موڑتا ہے کہ اس کا ذہن برعکس پٹری پر چل پڑتا ہے۔ وہ ماننے کے بجائے انکار کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ تواضع کے بجائے گھمنڈ کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ ایک شخص ربانی نفسیات کے تحت عمل کرتا ہے اور دوسرا شیطانی نفسیات کے تحت۔

جس شخص کو اندھیرے کے بجائے اجالے کی طرف چلنے کی توفیق ملتی ہے وہ بولنے سے زیادہ چپ دکھائی دیتا ہے، کیوں کہ وہ اپنا احتساب کرنے لگتا ہے۔ وہ حق کو ٹھکراتے کے بجائے حق کو مان لیتا ہے۔ کیوں کہ وہ گھمنڈ کی نفسیات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ معاملات میں بے انصافی کے بجائے انصاف پر چلتا ہے، کیوں کہ اس کو ڈر ہوتا ہے کہ وہ آخرت کی عدالت میں پکڑا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اجالے کے بجائے اندھیرے کی طرف چل پڑتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ وہ بے معنی بحثیں چھیڑتے ہیں کیونکہ انھیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ ان کو ہر بولے ہوئے لفظ کا حساب دینا ہے۔ وہ اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے دوسروں کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے کئے کو رد کرنے والا کوئی نہیں۔ کسی کی عزت پر حملہ یا کسی کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کا منصوبہ بنانا ان کے لئے بہت آسان ہوتا ہے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ میں جو چاہوں کروں، میرا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

جب آدمی دنیا کو نظرانداز کرکے آخرت کی طرف بڑھتا ہے تو وہ اندھیرے سے اجالے کی طرف جاتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی آخرت سے بے پروا ہو کر دنیا کو اپناتا ہے تو وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جاتا ہے۔ یہ عمل آدمی کی زندگی میں ہر روز جاری رہتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے وقت اور پیسے کو ان چیزوں میں نہیں لگاتا جن کا فائدہ آئندہ زندگی میں ملنے والا ہو، بلکہ وہ اپنے وقت اور پیسہ کو ان چیزوں میں لگاتا ہے جن کا فائدہ اس کو آج کی دنیا میں مل جائے۔ جب ایک شخص خاموش دینی خدمت سے بے رغبت ہوتا ہے اور ان کاموں کی طرف دوڑتا ہے جن میں شہرت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہو۔ جب ایک شخص ان چیزوں کو دیکھکر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے جو دنیا کی رونقوں سے تعلق رکھتی ہیں، وہ چیزیں اس کی روح کی غذا نہیں بنتیں جن کو آخرت میں اللہ نے اپنے وفادار بندوں کے لئے جمع کر رکھا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں آدمی اجالے کو چھوڑ کر اندھیرے کی طرف گیا۔

اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جس کے پاس اپنے وقت اور اپنے پیسہ کا مصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اگلی زندگی کی بہتری میں لگائے، وہ نظر آنے والے فائدوں کے مقابلہ میں غیب میں چھپے ہوئے فائدوں پر اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھتا ہے، جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی شہرتوں اور عزتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان خاموش کاموں میں لگا رہتا ہے جن کو دنیا کے لوگ نہیں دیکھتے۔ البتہ خدا اور اس کے فرشتے ان کو دیکھتے ہیں۔ جس کی روح خدا کی حمد اور آخرت کی یاد میں پرورش پاتی ہے نہ کہ دنیوی اہمیت والی چیزوں پر۔ ایسا شخص وہ شخص ہے جس کے سامنے اندھیرے کی راہیں کھلی ہوئی تھیں مگر وہ ان کو چھوڑ کر اجالے کی طرف چلا گیا۔ اندھیرے کی طرف سفر کرنے والوں کی منزل دوزخ ہے اور اجالے کی طرف سفر کرنے والوں کی منزل جنت۔

وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہیں

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ

(یونس ۹-۷)

جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے اور وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا بیٹھے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا آگ ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔ جو لوگ یقین لائے اور نیک کام کیا ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو راہ دے گا جنت کی، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی آرام کے باغوں میں۔

انسانوں کی ایک قسم وہ ہے جن کو دنیا کی چیزیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پیسہ کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کو نظر آتا ہے کہ پیسہ سب کچھ ہے، اس لئے وہ پیسہ کماتے اور اس کے مسائل سے نمٹنے میں محو رہتے ہیں۔ کچھ لوگ شہرت و عزت کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں کا مرکز و محور وہ چیزیں بن جاتی ہیں جن سے ان کی امیج بڑھے، جن سے ان کی عوامی تصویر میں اضافہ ہو۔ کچھ لوگ اقتدار کے فریب میں ہوتے ہیں۔ ان کی توجہ اپنے اقتدار کے مسائل میں لگی رہتی ہے۔ یہ تمام لوگ اپنی دنیوی زندگی میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ ان کے ذہن و فکر کی تمام طاقتیں اسی پر لگ جاتی ہیں۔ وہ انھیں چیزوں کے اندر جینے لگتے ہیں۔ ان کو دنیا میں جو کچھ مل رہا ہے، اسی پر وہ راضی اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ ذہنی کیفیت ان کو آخرت کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ ان کی زندگی ایسی بن جاتی ہے جیسے انھیں اللہ سے ملاقات کا کھٹکا ہی نہ ہو، جیسے وہ اس اندیشہ سے خالی ہو گئے ہوں کہ ہار اور جیت، کامیابی اور ناکامی کا اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونے والا ہے۔ ان کی غفلت یہاں تک بڑھتی ہے کہ خدا کے دلائل ان کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے معاملات کا درست ہونا ان کو اس غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے کہ کسی دلیل اور ثبوت پر ان کو دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی بات لفظوں یا خاموش اشاروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مال و جائداد، عزت و شہرت اور عہدہ و اقتدار ایسی مادی صورتوں میں ہوتے ہیں جن کے مزے کو وہ چکھ رہے ہوں، جن کی اہمیت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ "حقیر" کو چھوڑ کر "بڑی چیز" کو لے رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً وہ جنت کو چھوڑ کر جہنم کو لے رہے ہوتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں ان کی مدہوشی ان کو یہ بات سمجھنے نہیں دیتی۔ مگر مرنے کے بعد جب وہ اپنے سامنے جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھیں گے، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں وہ جو کچھ کر رہے تھے اس کی حقیقت آخرت کے اعتبار سے کیا تھی۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو خدا پر اس وقت سے پہلے یقین لے آتے ہیں جب کہ وہ اپنی طاقتوں اور عظمتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ ان کا یقین ان کو صحیح اور درست رویہ پر قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں اور سرگرمیوں

کو آخرت کی بنیاد پر چلاتے ہیں نہ کہ دنیا کی بنیاد پر۔ اللہ پر ان کا یقین ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ ان کا ایمان اور عمل صالح ان کو ان نفسیاتی پیچیدگیوں سے پاک کر دیتا ہے جو کسی معاملہ میں حق کے پہلو کو سمجھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ جب اللہ کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ جب اللہ کی کوئی دلیل سامنے آتی ہے تو اس کی معقولیت کو سمجھنے میں انہیں دیر نہیں لگتی۔ جب خدائی اشارے اپنی خاموش زبان میں بولتے ہیں تو ان کے کان ان کو سننے کے لئے بہرے ثابت نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کا زندہ ایمان ان کو خدائی راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خوشیوں کے سرسبز باغوں کے اندر بنے ہوئے بہترین مکانات میں ہمیشہ رہیں گے۔

انسان کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کو پکڑے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔ مگر موجودہ دنیا میں آدمی کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ خدا اس کے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہاں خدا کا ظہور آیات کی صورت میں ہوا ہے۔ آخرت میں خدا اپنی بے حجاب صورت میں نمایاں ہوگا، حتیٰ کہ لوگ اس کو چاند اور سورج کی طرح دیکھیں گے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ دلائل اور نشانیوں کے ذریعہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں آدمی کو خدا کی کتاب میں خدا کو پانا ہے۔ قدرت کے پھیلے ہوئے کرشموں میں خدا کو دیکھنا ہے۔ خدا کی طرف پکارنے والے انسانوں کی آواز میں خدا کی آواز کو سننا ہے، جو شخص اس طرح خدا کو پائے، اسی نے خدا کو پایا۔ وہی خدا کا مومن بنا۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ اگرچہ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔ یہ "غیب" کو شہود دینا ہے۔ خدا کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی اس طرح اس کا مومن بن جانا ہے جیسے کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہے۔ لیکن اگر ایک بار آدمی اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دے تو خدا اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ وہ اس کی رہنمائی اور مدد کے لئے اتر آتا ہے۔ خدا اس وقت تک ہم سے الگ کھڑا رہتا ہے جب تک ہم غیب کے پردہ سے گزر کر اس کی طرف نہ لپکیں۔ مگر جب ہم اس کی طرف لپکتے ہیں تو اس کے بعد وہ ہم سے الگ نہیں رہتا۔ اب وہ ہمارا ہم نشین بن جاتا ہے۔ "اب وہ مومن کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ وہ مومن کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، وہ مومن کا پاؤں بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے" جو ایک بار خدا کا دامن پکڑ لے، خدا خود ضامن بن جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اب خدا کا دامن کبھی نہ چھوٹے گا، وہ کبھی اپنے رب سے محروم نہ ہوگا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کا دامن نہ پایا ہو، وہ کسی اور دامن کو خدا کا دامن سمجھ بیٹھا ہو۔

"ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے ان کو جنت تک پہنچا دے گا" ۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں داخلہ کسی آدمی کو اپنے ایمانی وجود کی وجہ سے ملے گا نہ کہ اس کے ظاہری کمالات کی وجہ سے۔ جس شخص کی شعوری ہستی اور اس کا اندرونی انسان اس قابل پایا جائے گا کہ جنت کی لطیف اور نفیس دنیا میں اس کو بسایا جائے، اسی کو وہاں بسنے کا اجازت نامہ عطا ہوگا۔ جنت کی دنیا کا شہری وہی شخص بن سکے گا جو اپنے فکر و مزاج اور اپنے کیفیات و رجحانات کے اعتبار سے وہاں کی آبادکاری کے لئے موزوں ثابت ہو۔ جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ "انسان" نہ پایا جائے گا ان کو جنت کے ماحول سے دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابد تک عذاب کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے ۔۔۔۔ جنت طیب روحوں کی آبادکاری کا مقام ہے اور جہنم خبیث روحوں کا قید خانہ۔

جب تمام حقیقتیں کھل جائیں گی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ کو نکال ڈالے گی۔ اس وقت آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اس دن زمین سب خبریں بتا دے گی۔ کیوں کہ تمھارے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس دن لوگ مختلف جماعتوں میں آئیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھیں۔ پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا (زلزال) دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے:
اور جس روز اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے پھر وہ جدا جدا کئے جائیں گے۔ پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ران کے چمڑے ان پر گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے اعضا سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اسی اللہ نے بلوایا ہے جس نے ہر چیز کو بلوایا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔ تم دنیا میں اس سے چھپ نہ سکتے تھے کہ تمھارے کان اور آنکھیں اور چمڑے تمھارے خلاف گواہی دیں۔ بلکہ تم اس گمان میں رہے کہ اللہ کو تمھارے بہت سے اعمال کی خبر ہی نہیں۔ تمھارے اس گمان نے جو تم نے اپنے رب سے کیا تھا تم کو ہلاک کیا۔ پس آج تم خسارہ میں پڑ گئے۔ یہ لوگ صبر کریں تب بھی آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے اور اگر عذر کرنا چاہیں تو اب کوئی عذر مقبول نہیں۔ ہم نے دنیا میں ان کے کچھ ساتھی مقرر کر دئے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوش نما بنا کر دکھاتے تھے۔ ان کے حق میں اللہ کا قول پورا ہو کر رہا۔ جو ان سے پہلے جنوں اور انسانوں پر پورا ہوا تھا۔ یقیناً وہ سب خسارے میں رہے (حم سجدہ)

دنیا میں آدمی ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ سچائی کے پیغام کو ٹھکراتا ہے۔ وہ حق دار کو اس کا حق ادا کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ جس پر قابو پاجاتا ہے اس کے اوپر خداوند بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کو صداقت کا معیار بنا لیتا ہے۔ وہ دنیا میں اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ یہاں آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے اپنے اختیارات کو استعمال کرے۔ مزید یہ کہ ہر آدمی کے پاس الفاظ کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جس سے وہ اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو چھپا سکے۔ ہر آدمی کے پاس خوبصورت تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کر سکے۔ یہ سب کچھ یہاں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے مگر ساری کائنات خاموش کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی ہے۔ درختوں کی پتیاں مظلوم کی حمایت میں نہیں بولتیں۔ سورج اور چاند حق کی طرف سے اپنا کوئی بیان نہیں دیتے۔ زمین و آسمان اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ایک غیر جانب دار تماشائی کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ دنیا میں بولنے والی زبان صرف ایک ہی نظر آتی ہے اور وہ انسان کی زبان ہے۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حق کی پامالی کو دیکھتا ہے اور اس سے بے تعلقی ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود غرضیوں اور مصلحتوں کے تحت بولتا ہے۔ وہ طاقت ور کی طرف داری کرتا ہے خواہ وہ باطل پر ہو اور کمزور کو نظر انداز کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو۔ ایک ایسی کائنات جہاں چڑیوں کے سریلے نغمے بلند ہوتے ہوں۔ جہاں سورج روزانہ اندھیرے کو اجالے میں لے آتا ہو، وہاں کوئی حق کی حمایت میں بولنے والا نہیں۔ وہاں کوئی بے انصافی

کا پردہ پھاڑنے والا نہیں۔

آنے والی قیامت اسی سوال کا جواب ہے۔ قیامت کے دن کائنات کا مالک اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس دن حق کی حکمرانی ہوگی۔ اس دن زمین و آسمان کی تمام چیزیں بول پڑیں گی۔ حتیٰ کہ آدمی کے اپنے اعضاء بھی سچائی کی گواہی دینے لگیں گے۔ اس کے بعد عزت والا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک حق پر تھا اور وہ تمام لوگ ذلت کے ابدی عذاب میں دھکیل دئے جائیں گے جو خدا کے نزدیک ناحق پر چل رہے تھے۔

ایک عظیم الشان شہر ہے۔ ہر قسم کی رونقوں سے بھرا ہوا۔ اس کے بعد اچانک بھونچال آتا ہے۔ پورا شہر خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو شہر کی سڑکوں پر عالی شان سواریوں میں دوڑتے تھے ان کی حقیقت ایک بے زور کیڑے سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے اونچے اونچے سجے ہوئے مکانات اینٹ پتھر کے ملبہ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ ان کا صدر اور گورنر بھی اتنا ہی بے قیمت تھا جتنا ایک عام مزدور۔ زلزلہ نے شہر کی تمام مصنوعی شان و شوکت کو باطل کر دیا۔ اس کے بعد جو بچا وہ وہی تھا جو شہر کی اصل حقیقت تھی۔

قیامت بھی اسی قسم کا ایک زلزلہ ہے۔ قیامت کیا ہے۔ پردہ کا ہٹا دیا جانا، تمام غیر واقعی چیزوں کا باطل کر دیا جانا۔ موجودہ دنیا میں آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اصل حقیقتیں اس سے اوجھل ہیں۔ خدا اور آخرت کا عالم جو اصل عالم ہے، وہ یہاں مکمل طور پر غیب میں ہے۔ انسان نظر آتا ہے مگر خدا نظر نہیں آتا۔ قیامت کے آتے ہی یہ حالت بدل جائے گی۔ خدا اپنے تمام جلال کے ساتھ سامنے آجائے گا۔ جنت، دوزخ، فرشتے، سب آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ اس حقیقی عالم کی نسبت سے انسان کی جو اصل حیثیت ہے وہ پوری طرح کھل جائے گی۔ دنیا میں آدمی اپنے حقیقی وجود کو ایک ظاہری پردہ میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ بے زور ہو کر بھی زور آور دکھائی دیتا ہے آخرت میں وہ اپنے اصلی اور حقیقی روپ میں بے پردہ ہو جائے گا۔ آدمی اپنی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے جیسا ہے' ویسا ہی وہ ظاہر کے اعتبار سے ہو جائے گا۔ اس سے بچے ہوئے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کو رب العالمین اپنی رحمتوں میں لے لے، جن کو وہ اپنی مغفرت میں ڈھانپ لے۔

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس امتحان کی وجہ سے لوگوں کو آزادی ہے۔ اس وقتی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہر آدمی اچھل کود رہا ہے۔ مگر جب امتحان کی کاپی چھین لی جائے گی تو آدمی اپنے آپ کو اس اصلی مقام پر کھڑا ہوا پائے گا جہاں وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے تھا۔

کیسا عجیب وہ وقت ہوگا ———— کتنے شان دار قلعے اس دن ملبہ کا ڈھیر ہوں گے۔ کتنے "بڑے" اس دن کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہوں گے۔ کتنے خوش پوشاک اس دن گدھوں اور کتوں کی طرح دکھائی دیں گے۔ کتنے زبان آور اس دن گونگوں کی مانند کھڑے ہوں گے۔ کتنے "دین دار"، اس دن اس طرح نظر آئیں گے جیسے ان کا دین خداوندی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ کتنے اپنی دولت پر ناز کرنے والے اس دن اس حال میں ہوں گے کہ ان کے پاس ایک کوڑی بھی نہ ہوگی جس سے وہ آخرت کی دنیا کی کوئی چیز حاصل کر سکیں۔

ایک خدا کے سوا تمام سہارے جھوٹے ثابت ہوں گے

• اور جن لوگوں نے انکار کیا ان سے قیامت کے دن کہا جائے گا: کیا تم کو میری باتیں سنائی نہیں جاتی تھیں۔ پھر تم نے گھمنڈ کیا اور مجرم بن کر رہے۔ اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور اس گھڑی کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ تو تم کہتے کہ ہم نہیں جانتے وہ گھڑی کیا ہے۔ ہم کو تو اس کا بس ایک خیال سا ہے اور ہم کو یقین نہیں ہوتا۔ اور کھل گئیں ان پر برائیاں ان کاموں کی جو وہ کرتے تھے۔ اور اب ان پر وہ چیز الٹ پڑی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو اسی طرح بھلا دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ اور تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تم کو مدد دینے والا نہیں" —— قرآن کی سورہ نمبر ۴۵ میں قیامت کا یہ منظر پیش کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

ذالکم بانکم اتخذتم آیت اللہ ھزوا وغرتکم الحیوٰۃ الدنیا فالیوم لایخرجون منہاولاھم یستعتبون (جاثیہ ۳۵)

یہ اس وجہ سے کہ تم نے اللہ کی باتوں کی ہنسی اڑائی اور تم کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا۔ پس آج یہ لوگ نہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے عذر قبول کیا جائے گا۔

ہر آدمی کسی نہ کسی ناز یا برتے پر جی رہا ہے۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہے، کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کے پاس پیسہ ہے، اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ اس کا اپنا حلقہ اور اس کے اپنے اعوان و انصار ہیں جو ہر موقع پر اس کی مدد کے لئے کافی ہیں۔ کسی کو یہ ناز ہے کہ وہ بزرگوں کا دامن تھامے ہوئے ہے، دنیا سے لے کر آخرت تک کہیں اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ کوئی کسی جماعت سے وابستہ ہے اور کوئی کسی ادارہ سے، کوئی عوامی قافلہ میں شریک ہے تو کوئی سرکاری قافلہ میں، غرض ہر ایک اپنے کو کسی نہ کسی سہارے پر کھڑا کئے ہوئے ہے اور اس کے ناز پر جی رہا ہے۔ یہی ناز یا غرہ دعوت حق سے بے پروائی برتنے کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ اللہ کی باتیں کھلے کھلے دلائل کے ساتھ آدمی کے سامنے آتی ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ان دلائل کا کوئی حقیقی جواب اس کے پاس نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس کو نہیں مانتا۔ اس کا ناز اس کو جھوٹے بھروسے کی نفسیات میں مبتلا رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں اس دعوت کو نہ مانوں تو میرا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ دلائل کے اعتبار سے خالی ہو کر بھی وہ اپنے جھوٹے سہارے کو پکڑے رہتا ہے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے سہارے بالکل بے حقیقت تھے۔ انھوں نے دنیا میں خدا کی نشانیوں کی پروا نہ کی تو قیامت کے دن خدا بھی ان کی پروا نہ کرے گا۔ دنیا میں جھوٹے سہاروں پر جینے والے آخرت میں بالکل بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔ ابدی بربادی ان پر ٹوٹ پڑے گی اور کوئی بھی چیز نہ ہوگی جو ان کو اس سے بچانے والی ثابت ہو —— آدمی جہنم کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ مگر کسی نہ کسی گھڑے ہوئے سہارے کی بدولت وہ اپنے کو جہنم سے مامون سمجھے ہوئے ہے۔

اس کی سوچ، اس کا اخلاق، اس کے معاملات، سب اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اندرونی وجود میں قلب سلیم (شعراء ۸۹) اور خارجی سلوک میں قائم بالقسط (نساء ۱۳۵) کا مصداق بن جاتا ہے۔ یہی دین اسلام ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو سکھانے کے لئے قرآن اتارا گیا۔

قرآن کو قلم کے ذریعہ کتاب کی صورت میں لکھوا کر انسان کے حوالے کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اہتمام تھا کہ وہ کسی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر اگلی نسلوں تک پہنچ سکے۔ قرآن آج مکمل طور پر محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس کے ماننے والے بھی بے شمار تعداد میں دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ مگر قرآن والی زندگی عملاً کہیں نظر نہیں آتی۔ قرآنی امکانیات اسی طرح بند حالت میں پڑے ہوئے ہیں جس طرح چند سو سال پہلے بھاپ اور بجلی کی طاقتیں بند پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کے جواب کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا، جب تک خدا کی سنتِ امتحان کو سامنے نہ رکھا جائے۔ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں قرآن کو ماننے والے اور قرآن کو نہ ماننے والے دونوں اپنا اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ کوئی شخص قرآن کا انکار کر کے گمراہ ہونا چاہے تو اس کو بھی پوری آزادی ہے۔ اور کوئی قرآن کو مان کر عملاً قرآن کے خلاف چلنا چاہے تو اس کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے۔ قرآن کو نہ ماننا کسی کے بچاؤ کے لئے عذر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح قرآن کو مان لینا کسی کو حالتِ امتحان سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ موجودہ دنیا میں جس طرح قرآن کو ماننے یا نہ ماننے کی آزادی ہے۔ اسی طرح اس کو مان کر اس کی تعلیمات پر چلنے یا نہ چلنے کی آزادی بھی ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قرآن کا انکار کر کے جس طرح اپنی گمراہیوں کے لئے آزاد ہے۔ دوسرے گروہ کو اسی طرح قرآن کا نام لیتے ہوئے قرآن کے خلاف عمل کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ مسلم قوم بھی خدا کی عدالت میں جانچ کی ٹھیک اسی سطح پر کھڑی کی گئی ہے جہاں دوسری غیر مسلم قومیں کھڑی ہوئی ہیں:

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصریٰ والصٰبئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون (بقرہ ۶۲)

یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس۔ اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

جب تک اللہ کی یہ سنت باقی ہے، یہ امکان بھی باقی رہے گا کہ کوئی گروہ قرآن و اسلام کا نام لے اور عملاً اس طرح رہے گویا قرآن اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ حتیٰ کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادی یہاں تک ہے کہ ایک شخص قرآن کے عالم اور مفسر کی حیثیت سے نمایاں ہو۔ دنیا کی زندگی میں وہ دین خداوندی کا چیمپین بنے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی دینی قیمت نہ ہو۔ وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ دھکیل دیا جائے جنھوں نے قرآن کو سرے سے مانا ہی نہ تھا، جن کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (۱۹ جنوری ۱۹۷۹)

توکل کیا ہے

دنیا دار الامتحان ہے اس لئے یہاں جدوجہد کرنا ہے۔ مگر مومن اللہ کے لئے جیتا ہے اس لئے اس کا بھروسہ اللہ پر رہتا ہے۔ جدوجہد مومن کے حالت امتحان میں ہونے کا تقاضا ہے اور توکل اس کی ایمانی نفسیات کا۔

ایمان اور توکل دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین (اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو) اس دنیا میں آدمی کو جس امتحان میں پورا اترنا ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنے والا ثابت ہو۔ وہ سب کچھ اللہ کی طرف سے سمجھے اور کسی بھی حال میں اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرے۔ مگر یہ امتحان اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ آدمی کو مخالفانہ حالات میں رکھا جائے۔ غیر متوکلانہ حالات ہی میں توکل کا امتحان ہو سکتا ہے۔ توکل یہ ہے کہ آدمی اسباب کے ذریعہ نتیجہ نکلتا ہوا دیکھے، اس کے باوجود اس کو اللہ کی طرف منسوب کرے۔ اسباب کا سرا چھوٹنے سے ناکامی سامنے آئے پھر بھی وہ یہی سمجھے کہ خدا کا حکم شامل حال نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ اسباب وعلل کے درمیان اپنے کو گھرا ہوا پا کر وہ اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لائے۔ مگر اس کا دل اس وقت بھی سارے معاملہ کو بس اللہ کا معاملہ سمجھ رہا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو امتحان کس بات کا ہوگا اور کیوں کر یہ معلوم ہوگا کہ آدمی حقیقی معنوں میں اللہ پر بھروسہ کرنے والا تھا یا ظاہری اسباب میں گم ہو جانے والا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو توکل سے کے خلاف حالات میں توکل کا ثبوت دینا ہے۔ اسباب وعلل کے درمیان رہتے ہوئے یہ یقین کرنا ہے کہ صرف ایک اللہ موثر حقیقی ہے۔ آسانیوں اور مشکلوں سے گزرتے ہوئے خود آسانیوں اور مشکلوں میں نہیں الجھنا ہے بلکہ ہر حال میں صرف اللہ کی طرف اپنی نظریں جمائے رکھنا ہے۔

امتحان لازماً یہ چاہتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو مختلف راہیں ہوں اور اس کے لئے موقع ہو کہ وہ اپنی آزادانہ رائے کے تحت دونوں میں سے کسی ایک کو چن سکے۔ اسی مصلحت کی بنا پر موجودہ دنیا کے اوپر اسباب وعلل کا پردہ ڈال دیا گیا ہے اور آدمی کے لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے ہیں کہ جو نتیجہ سامنے آئے وہ عمل اور جدوجہد کے ذریعہ سامنے آئے۔ آدمی ایک چھوٹا سا معمولی بیج مٹی کے اندر ڈالتا ہے اور اس کے بعد حیرت انگیز طور وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک ایسا ہرا بھرا درخت نکلا چلا آرہا ہے جس میں لکڑی ہے، پتیاں ہیں، پھول ہے، پھل ہے، مزہ ہے، خوشبو ہے اور بے شمار دوسری چیزیں ہیں، یہ واقعہ سراپا ایک قدرتی معجزہ ہے۔ معجزہ کے سوا کوئی چیز ایسے حیرت ناک وجود کو پیدا نہیں کر سکتی جس کا نام درخت ہے۔ مگر اس معجزاتی واقعہ کو اسباب کے پردہ میں ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ آدمی کے لئے یہ بھی ممکن ہو کہ وہ سمجھے کہ ظاہری اسباب نے اس کو وجود دیا ہے۔ آدمی تعلیم حاصل کر کے ایک ڈگری لیتا ہے اور اس کے بعد ایک اچھی ملازمت کے ذریعہ شاندار تنخواہ وصول کرتا ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سراسر ایک خدائی کرشمہ ہے۔ آدمی کے اندر یہ انوکھی صفت ہونا کہ وہ سوچے، وہ لکھ اور بول سکے۔ وہ کتاب کی لکیروں کو معانی کی صورت میں پڑھے، وہ خیالات کو منظم کرے۔ وہ باتوں کو یاد رکھے اور ان کو دہرائے۔ وہ عزم وارادہ کے تحت اپنی قوتوں کو استعمال کرے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری بے شمار چیزیں جن کی مساعدت سے ایک شخص تعلیم یافتہ بنتا ہے اتنا حیران کن حد تک بعید الوقوع ہے کہ معجزۂ خداوندی کے سوا کسی اور لفظ سے اس کو تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ سب کچھ بظاہر ایسے حالات کے تحت

انجام پاتا ہے کہ آدمی اگر چاہے تو بآسانی اس سارے واقعہ کو کچھ خاص اسباب کی طرف منسوب کر دے۔ اس طرح آدمی کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کو وہ بیک وقت دو رخ سے دیکھ سکے۔ ایک رخ سے دیکھنے میں وہ اس کو خدا کا کرشمہ نظر آئے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں ایسا معلوم ہو گویا سب کچھ خود انسان کے فراہم کئے ہوئے معلوم و متعین اسباب کے تحت وقوع میں آیا ہے۔

امتحان کی غرض سے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے نتائج کو اسباب کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اسباب کی فراہمی کے بغیر نتائج وقوع میں نہ آئیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو سبب اور نتیجہ میں اتنی کم نسبت ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "سبب" کی حیثیت ایک "بہانہ" سے زیادہ نہیں۔ درخت بظاہر آدمی کے عمل کے نتیجہ میں ظہور میں آتا ہے۔ مگر اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو درخت ایک ایسی چیز ہے جس کو وجود میں آنے کے لئے اتنے زیادہ عوامل درکار ہیں کہ اس کے لئے ایک پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ اس پورے واقعہ میں انسان کے عمل کا حصہ اتنا کم ہے کہ اس کو "نہیں" کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک آدمی کا ایک علم کا ماہر بننا بظاہر اگرچہ انسان کی کوششوں سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر ایک شخص کا صاحب علم بننا اتنا انوکھا واقعہ ہے جس کو ظہور میں لانے کے لئے خدائی طاقتوں کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے تمام تر اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے وقوع میں آتا ہے۔ اس پورے واقعہ میں بھی انسان کی اپنی کوششوں کا حصہ اتنا حقیر ہے کہ وہ بالکل ناقابل شمار ہے۔ امتحان کے مقصد سے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کر دیا ہے کہ اسباب کی فراہمی کے بغیر کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔ مگر کائنات کے اندر کسی واقعہ کا ظہور میں آنا ایک ایسا معجزہ ہے جس کو خدا کے سوا کوئی ظہور میں لانے پر قادر نہیں ——— کفر یہ ہے کہ آدمی اسباب و علل کے ظاہری پردوں میں اٹک کر رہ جائے، وہ انہیں اسباب کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ اس کے برعکس ایمان یہ ہے کہ آدمی ظاہری پردوں سے گزر کر اس کے پیچھے کام کرنے والی حقیقتِ عظمیٰ کو دیکھ لے اور اس کا اقرار کرتے ہوئے اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

توکل کا دوسرا پہلو معاملات میں اللہ پر اعتماد ہے۔ یعنی جب کوئی بات اپنے خلاف پیش آئے تو آدمی سارے معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال کر صبر کرے۔ اللہ کے راستہ پر چلنا اور اللہ کے دین کا داعی بننا سراسر آزمائش کا معاملہ ہے۔ آدمی ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جہاں طرح طرح کے لوگ ہیں، ان کی طرف سے طرح طرح کے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کی نازیبا حرکت پر نفرت اور شکایت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ کبھی کسی کی ترقی اور کامیابی کو دیکھ کر حسد کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کسی کی تنقید کو سن کر کبر اور انانیت کا شیطان جاگ اٹھتا ہے۔ کبھی کسی کے ہاتھوں مادی نقصان پہنچ جاتا ہے اور آدمی چاہنے لگتا ہے کہ اس کا انتقام لے۔ کبھی لوگ ایک سچی بات کا انکار کر کے آدمی کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض بار بار مختلف قسم کی ناخوشگوار صورت سامنے آتی ہے اور آدمی کے اندر ردعمل کی نفسیات ابھرتی ہے۔ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ سے الجھ جائے اور اس کے خلاف جو کچھ کر سکتا ہے کر ڈالے۔ مگر توکل یہ ہے کہ ایسے ہر موقع پر آدمی صرف اپنی ذمہ داری کو یاد رکھے اور باقی تمام معاملات کو اللہ کے اوپر ڈال دے۔ وہ اللہ سے بہتر بدلہ کی امید کرتے ہوئے خاموش ہو جائے۔ وہ اپنا رخ انسان کے بجائے اللہ کی طرف کر دے۔

آخرت کا راستہ صبر کا راستہ ہے

"وہ لوگ اپنے واجبات کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ وہ اللہ کی محبت میں غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی رضامندی کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔ ہم کو تو اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ ہے۔ پس اللہ ان کو اس دن کی سختی سے بچائے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہ وہاں تختوں پر مسندیں لگائے ہوئے ہوں گے۔ وہاں نہ گرمی کی تکلیف ہوگی اور نہ سردی کی۔ جنت کے درخت ان پر جھکے ہوئے سایہ کر رہے ہوں گے۔ اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے۔ لوگ ان کے پاس چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے لئے پھر رہے ہوں گے۔ وہ شیشے بھی چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے ٹھیک اندازہ کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسے پیالے پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے رہیں گے۔ تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے ہر طرف نعمتیں اور بڑی بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمھارا بدلہ اور تمھاری کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہوئی (الدھر)

قرآن کا یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی کوششیں آخرت میں سعی مشکور (دہر ۲۲) کا درجہ حاصل کریں گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی ہولناکیوں کا اتنا شدید احساس رکھتے ہوں کہ وہ ان کے اوپر ایک قسم کا آسمانی محاسب بن کر چھا جائے۔ ان کا حال یہ ہو جائے جیسے کہ وہ موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور اسی کے زیر اثر سارا کام کر رہے ہیں۔ وہ جب کوئی عہد کریں، خواہ منت کا عہد ہو یا ایمان کا عہد یا قول و قرار کا عہد، تو وہ اس کو اس طرح پورا کریں جیسے وہ بے پناہ یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر انھوں نے اس کو پورا نہ کیا تو جہنم کی آگ انھیں پکڑ لے گی۔ ان کا ایمان باللہ ان پر جن باتوں کو لازم کر رہا ہے اور ان کا عہد ان کو جن چیزوں کا پابند بنا رہا ہے، ان کو وہ اس طرح پورا کریں جیسے وہ ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں ان کے لئے دو میں سے صرف ایک چیز کے انتخاب کا سوال ہے۔ یا قول و قرار کے تقاضوں کو پورا کرنا یا جانتے بوجھتے اپنے آپ کو جہنم کے الاؤ میں گرا دینا۔

آخرت کے احساس ہی کے تحت ان کے اندر جو دوسری خصوصیت پیدا ہوتی ہے وہ بندوں کے ساتھ مہربانی ہے۔ وہ اپنے لئے اپنے رب سے مہربانی چاہتے ہیں اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمائی میں محتاجوں کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا سہارا بنتے ہیں جو حالات کے نتیجہ میں بے بس ہو گئے تھے یا بندشوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ بندگان خدا کی خدمت کا یہ کام جو وہ کرتے ہیں، بدلہ اور شکرانہ وصول کرنے کے لئے نہیں کرتے۔ اس کا محرک تمام تر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کے دن جب وہ خدا کے سامنے تمام کمزوروں سے زیادہ کمزور حالت میں کھڑے

ہوں، اس وقت ان کا خدا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ ان کی مدد فرمائے۔ دنیا کی زندگی میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک ان کے لئے دراصل ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ وہ بھوکے کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا ان کو کھلائے، وہ کمزوروں کو سہارا دیتے ہیں تاکہ خدا ان کو سہارا دے۔ وہ انسانوں کی طرف سے ڈالی ہوئی تکلیفوں کو معاف کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی غلطیوں کو معاف کر دے۔

ان لوگوں کو یہ نعمتیں اس لئے ملیں گی کہ انھوں نے صبر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کل کی دنیا کے لئے جینا، دکھائی دینے والے "جنت اور جہنم" کو نظر انداز کرکے نہ دکھائی دینے والے جنت وجہنم کے لئے سرگرم ہونا ایک بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں ہر وقت آدمی کے صبر کا امتحان ہے۔ اس راہ میں کہیں ملتے ہوئے فائدوں سے محرومی کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خارجی مجبوری کے بغیر خود سے اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی بے عزتی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کہیں زیادہ کو چھوڑ کر کم پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں قدرت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں کو روک لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنی مقبولیت کو دفن کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں شہرت اور استقبال کے راستے کو چھوڑ کر گمنامی کے طریقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کہیں الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے اپنی زبان کو بند کر لینا پڑتا ہے۔ کہیں جانتے بوجھتے دوسرے کا بوجھ اپنے سر پر لے لینا پڑتا ہے۔ کہیں اپنے آپ کو ایک ایسے کام میں شریک کرنا پڑتا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی کریڈٹ ملنے والا نہیں۔ غرض جنت کی طرف سفر کا سارا معاملہ صبر و برداشت کا معاملہ ہے۔ جو اپنے آپ کو دبانے اور کچلنے کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی اس راہ کو طے نہیں کر سکتا:

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللّٰہ خیر لمن آمن وعمل صالحا ولا یلقّٰھا الا الصّٰبرون (قصص ۸۰)

اور کہا ان لوگوں نے جن کو علم ملا تھا، خرابی ہو تمھاری۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لایا اور نیک عمل کیا۔ اور یہ بات انھیں کے دل میں پڑتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

دنیا کی زندگی دراصل صبر کا امتحان ہے۔ صبر کی ایک قسم وہ ہے جو باہر کی دنیا کے خلاف ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی ماحول کی رکاوٹوں کا خاموش مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دینی سفر کو جاری رکھتا ہے۔ مگر سب سے بڑا صبر وہ ہے جو خود اپنے خلاف پیش آتا ہے۔ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کی وجہ سے اپنے کسی بھائی کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، ایسے موقع پر منفی جذبات کی پرورش سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کے خلاف حسد جاگ اٹھتا ہے۔ اس وقت دشمن جیسی بے رحمانہ نظر سے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑتا ہے تاکہ حسد اور رقابت کے بیج کو نکال پھینکا جائے۔ کبھی آدمی ایک شخص کو اچھا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا نیازمندانہ انداز ہوتا ہے اور کبھی ایک شخص کو برا سمجھتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ صرف اس کا تنقید و احتساب کا مزاج ہوتا ہے، ایسے مواقع پر اپنے آپ کو کھینچ کر ایسے مقام پر لے جانا پڑتا ہے جہاں وہ تعریف و تنقید سے بلند ہو کر دوسروں کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔ دوسروں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کے بغیر کوئی شخص دین دار نہیں بنتا اور انصاف اور خیر خواہی پر قائم ہونا صبر کے بغیر ممکن نہیں۔ ■

تعلقات کی بنیاد

اور ابراہیم نے کہا: اللہ کے سوا جن بتوں کو تم نے پکڑ رکھا ہے وہ صرف دنیا کے باہمی تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کا مخالف ہو گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہو گا اور کوئی تمھارا مددگار نہ ہو گا۔ (عنکبوت ۲۵)

ابراہیم علیہ السلام نے قدیم عراق کے باشندوں کو دعوت دی کہ اللہ کی عبادت کرو، اللہ سے ڈرو اور شرک سے بچو۔ یہ دعوت لوگوں کو اتنی سخت معلوم ہوئی کہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ خدا کے پیغمبر کو مار ڈالیں یا اس کو زندہ جلا دیں۔ قوم کی طرف سے اتنا سخت ردعمل کیوں ظاہر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شرک ان کے لئے تعلقات دنیا کی بنیاد بنا ہوا تھا۔ شرک کو چھوڑنا اور پیغمبر کا ساتھ دینا دنیوی تعلقات کو توڑنے کے ہم معنی نظر آتا تھا۔ اپنی دنیا کو بچانے کے لئے انھوں نے طے کیا کہ پیغمبر کی تحریک کو ختم کر ڈالیں۔

آدمی ہمیشہ قوم یا گروہ کے ساتھ جیتا ہے۔ جن لوگوں کے درمیان باہمی موانست ہو جاتی ہے وہ اس انس کی بنا پر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کرتے ہیں ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے نفسیاتی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی اجتماعیت یا گروہ بندی حقیقۃً دنیوی محرک کے تحت ہوتی ہے مگر اعتقادی بنیاد یا نظریاتی علامت کے طور پر کچھ چیزیں ان کے درمیان محترم ہو جاتی ہیں۔ کبھی کوئی بت، کبھی کوئی شخصیت، کبھی اور کوئی مادی یا غیر مادی تصور۔ یہ مرکزِ محبت جو لوگوں کو جوڑتا ہے، اس کی شدید طور پر حفاظت کی جاتی ہے۔ کیوں کہ لوگوں کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے ٹوٹتے ہی ان کے دنیوی مفادات کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ آدمی جس نظام مودّت سے وابستہ ہو اس سے علیحدگی عام حالات میں بھی مشکلات کا باعث ہوتی ہے اور اگر یہ علیحدگی ایک ایسے شخص کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں ہو جو مروجہ نظام مودت کا ناقد بنا ہوا ہو تو پھر مشکلات کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ مرکزِ محبت بنانے کے قابل ذات صرف خدا کی ہے۔ وہی حقیقی طور پر یہ شان رکھتا ہے کہ انسان اس کو اپنا معبود بنائے اور اس کی بنیاد پر اپنے اجتماعی تعلقات کی تنظیم کرے۔ اس کے سوا ہر سہارا جھوٹا ہے۔ کسی بھی دوسری چیز کو حقیقی طور پر معبودیت کا یہ مقام حاصل نہیں۔ خدا کے سوا آدمی جس کو یہ مقام دے وہ اس کے لئے دھوکا ثابت ہو گا۔ آخرت میں جب حقیقت کھلے گی تو غیر اللہ کی بنیاد پر باہم محبت کرنے والے ایک دوسرے پر لعنت کریں گے اور ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے۔

کتنے لوگ ہیں جو اپنے ہم قوم اور اپنے حلقہ والوں کے درمیان بہت با اخلاق دکھائی دیں گے۔ مگر جہاں مودّت کا یہ رشتہ نہ ہو وہاں ان سے کسی اخلاق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی خوش خلقی، شرافت، فیاضی، تعاون اور ایفائے عہد ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کے "معبود بھائی" ہوں۔ جن سے اس قسم کی دوستی اور تعلق نہ ہو، ان کو وہ اخلاق کا تحفہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کی اخلاقیات ان کی مودّت دنیا کے نظام کے تابع ہے نہ کہ خدا کے تابع۔

دوسروں کو کم تولنا اور اپنے لئے پورا تول لینا

"آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو اپنے گھیرے میں لے لے گا" (ہود۔ ۸۴) یہ پیغمبرانہ آواز حضرت شعیب علیہ السلام کی تھی جو انھوں نے ساڑھے تین ہزار برس پہلے مدین والوں کو سنائی۔

مدین، قدیم عرب میں بحر احمر کے کنارے ایک شہر تھا۔ حضرت ابراہیم (۱۹۸۵۔ ۲۱۶۰ ق م) کی بیوی قطورہ کے بطن سے آپ کے ایک صاحبزادے مدین نامی پیدا ہوئے۔ انھیں کی نسل ابتداءً یہاں آباد ہوئی اور ان کے نام پر شہر کا نام مدین رکھا گیا۔ انھیں مدین کی نسل سے، حضرت ابراہیم کے تقریباً ۵ سو برس بعد، حضرت شعیب پیدا ہوئے۔ اس وقت تک مدین کی قوم میں کافی بگاڑ آگیا تھا۔ اللہ نے حضرت شعیب کو پیغمبری عطا کی اور ان کو مامور کیا کہ حضرت ابراہیم کی اس بگڑی ہوئی اولاد کو حق کا پیغام سنائیں۔ قوم مدین کی کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے ان کے بارے میں کہا گیا کہ تم اپنے آج کے اچھے حال پر خوش مت ہو۔ کیونکہ آئندہ تمھارے لئے شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔ وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ وہ ناپ تول پورا نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو چیزیں دینے میں کمی کرتے تھے (اعراف۔ ۸۵) اس اخلاقی بیماری کو قرآن میں دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "خرابی ہے گھٹانے والوں کے لئے، جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں، اس دن جب کہ سارے لوگ مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (التطفیف)

"اپنے لئے بھرپور لینا اور دوسروں کو دینے میں کمی کرنا" ایک وہ ہے جو دکان داروں کے یہاں ملتا ہے۔ جو دکان دار ایسا کرتا ہے کہ اپنے لئے ناپنا اور تولنا ہو تو زیادہ لینے کی کوشش کرے اور دوسروں کو دینا ہو تو چاہے کہ کسی نہ کسی طرح اس میں گھٹا دوں، خواہ ناپنے اور تولنے میں کمی کر کے یا ملاوٹ اور خلاف نمونہ چیز دے کر، وہ خدا کے یہاں ملعون ہے اور اس کی ساری کمائی حرام کی کمائی ہے۔ اپنے اس دھوکے بازی کے کاروبار سے وہ خواہ کتنا ہی نفع حاصل کر رہا ہو، آخرت کے دن وہ سخت میں ہوگا۔ تاہم اس ذہنیت کا تعلق صرف دکان داری سے نہیں ہے بلکہ انسانی تعلقات کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ "جو اہل علم اپنے معاصر فضلاء کی تعظیم و توقیر کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی اس آیت کے ذیل میں آجاتے ہیں"۔ اسی پر ان تمام دوسری صورتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے جب کہ آدمی اپنے لئے تو چاہتا ہے کہ اپنے واقعی حق سے بھی زیادہ وصول کرے اور دوسرے کو اس کے واجبی حق کے بقدر دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

وہ اپنے اوپر تنقید سن کر بھڑ اٹھے اور خود دوسروں کا احتساب کرے تو چاہے کہ وہ اس کا خوش دلی کے ساتھ استقبال کریں۔ اس کی چیزوں کی پزیرائی دوسرے کے یہاں نہ ہو تو اس کو گروہی عصبیت قرار دے کر خود وہ دوسرے کی چیز کے ساتھ اسی عصبیت کا معاملہ کرے۔ دوسروں کے سامنے وعظ کہے کہ امتیازی سلوک نہ کرو اور خود اپنے دائرہ میں دوسروں کے ساتھ امتیازی سلوک کو جائز کئے ہوئے ہو۔ اس کے پاس دوسروں کے لئے حقیقی فیاضی کا ایک کلمہ بھی نہ ہو اور دوسروں سے امید رکھے کہ وہ اس کو ساری دنیا کے لئے روشنی کا مینار تسلیم کریں۔

اللہ کے ذکر سے ان کے دل دہل جاتے ہیں

انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایتہ زادتھم ایماناً وعلیٰ ربھم یتوکلون (انفال ۲)

ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب اللہ کا کلام ان کو سنایا جائے تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

یہ آیت ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر کے بعد اتری ہے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ بدر کی فتح کے بعد جو مال غنیمت ملا تھا اس کی تقسیم کے سوال پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ——— یہ مال اسلامی حکومت کا ہے یا لشکریوں کا۔ اس میں مہاجرین کا زیادہ حصہ ہے یا انصار کا۔ رسول اللہ ؐ کی حفاظت کرنے والوں کو زیادہ ملنا چاہیے یا دشمن کا پیچھا کرنے والوں کو۔ وغیرہ۔ اس قسم کی اختلافی بحثیں جاری تھیں کہ یہ آیت اتری۔

جب بھی باہمی معاملات پیش آتے ہیں تو لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایت اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص معاملہ کو اپنے ذہن سے دیکھتا ہے اور دوسرا اپنے ذہن سے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے بات بڑھتی ہے، مسئلہ کو غیر جانب دارانہ انداز سے دیکھنے کا مزاج ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اولاً اگر اصولی اختلاف تھا تو آخری مرحلہ میں وہ ضد، عصبیت، نفرت اور انانیت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مومن وہ ہے جو شیطان کی طرف سے اس قسم کی فضا پیدا کئے جانے کے باوجود اصلاح حال کے لئے تیار رہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص سے وقتی تاثر کے تحت جھگڑ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو خدا کی یاد دلائی جاتی ہے تو اچانک اس کا دل دہل جاتا ہے۔ وہ شخص جو ایک ''انسان'' کے مقابلہ میں اپنے کو قوی محسوس کر کے اس کو دبانے پر تلا ہوا تھا، خدا کی عظمتوں اور قوتوں کو سوچ کر سہم جاتا ہے۔ اب اس کا سر جھک جاتا ہے۔ اس کے الفاظ کے ذخیرے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے دلائل کو بھولنے لگتا ہے۔ جو شخص ایک لمحہ پہلے تک اپنے حق پر زور دے رہا تھا، اب اس کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس سے جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈر اور خدا کی زمین میں متکبر نہ بن، تو اس کو فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ فی الواقع بڑائی صرف ایک اللہ کے لئے ہے۔ اس کے سوا جتنے ہیں سب چھوٹے ہیں۔ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ کہنے والے نے صحیح کہا۔ میرے لئے تواضع کے سوا کوئی دوسرا رویہ درست نہیں۔ حق وانصاف پر قائم رہنے میں دنیوی نقصانات کا خطرہ سامنے آتا ہے یا اپنی ساکھ گرتی ہوئی نظر آتی ہے تو اللہ کی مدد کا یقین اس کے اندر نیا عزم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تمام مصالح کو اس بھروسہ پر نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس کا خدا اس کی مدد کرے گا، اس کا خدا اس کو بے عزت ہونے سے بچائے گا۔

اللہ کی آیتوں کو سن کر ایمان بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیت جو حکم دے رہی ہے اسی میں اس کو زندگی کا راز دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایک بظاہر مصلحت کے خلاف بات خدا کی طرف منسوب ہونے کے بعد

عین مصلحت نظر آتی ہے ، ایک بظاہر نقصان کا طریقہ خدا کا حکم بننے کے بعد عین فائدہ کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک بظاہر نفس پر شاق گزرنے والا معاملہ خدا کی مرضی کا درجہ پانے کے بعد عین مطلوب چیز بن جاتا ہے۔ وہ دنیوی بھروسوں کو نظر انداز کر کے خدا کے بھروسہ پر چل پڑتا ہے۔ وہ ظاہری مصالح سے بے پرواہو کر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔

ایمان کا مطلب ہے کسی چیز کو ماننا، اس کا یقین کرنا۔ اگر آپ کے سامنے ایک پنسل پڑی ہو اور آپ اس کو دیکھ کر کہیں کہ یہ پنسل ہے، تو گویا کہ آپ نے پنسل کے وجود کا اقرار کیا۔ مگر پنسل کی موجودگی کا اقرار آپ کے دل کے اندر کوئی ہل چل نہیں پیدا کرے گا۔ آپ "یہ پنسل ہے" کہہ کر بھی ویسے ہی رہیں گے جیسے آپ اس کے کہنے سے پہلے تھے۔ لیکن اگر آپ کے کمرہ میں اچانک ایک بڑا سانپ نکل آئے اور آپ اس کو دیکھ کر کہیں کہ "یہ سانپ ہے" تو یہ دوسرا جملہ بھی اگرچہ محض اقرار کا جملہ ہے، مگر یہ آپ کے تمام شعور کو متحرک کر دے گا اور آپ کی شخصیت کو ہلا دے گا۔ کیوں کہ پنسل ایک بے ضرر لکڑی ہے۔ جب کہ سانپ ایک خوفناک جانور ہے اور آپ کی ذرا سی غفلت بھی آپ کو اس کا شکار بنا سکتی ہے۔

"ایمان" بظاہر منھ سے کچھ الفاظ بولنے کا نام ہے۔ مگر ایمان کا تعلق جس چیز سے ہو اس کی مناسبت سے دل میں اثر پیدا ہونا ضروری ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں نے خدا کے وجود کا اقرار کیا، میں اس پر ایمان لایا، تو آپ تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ اس مالک کائنات کو جاننے اور ماننے کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں جس کا انعام بھی بہت بڑا ہے اور جس کی سزا بھی بے حد سخت ہے، ایسے خدا کا اقرار، اگر وہ فی الواقع اقرار ہو، تو آپ کی پوری شخصیت کو ہلا دے گا۔ اس کا نام سن کر آپ کا دل دہل اٹھے گا۔ اس کے کلام کے آگے آپ ڈھ جائیں گے۔

مذکورہ آیت مال غنیمت کا حکم بیان کرنے کے ذیل میں اتری ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ مال غنیمت میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ مگر اس کا حکم بتانے سے پہلے کہا جاتا ہے کہ ــــ "اللہ سے ڈرو"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ یا اسلامی نظام قائم ہونے کا انحصار سب سے زیادہ کس چیز پر ہے۔ وہ اس پر ہے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں پیدا ہو جائیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر لوگوں کے اندر اللہ کا ڈر سمایا ہوا نہ ہو تو کسی قسم کا قانونی نفاذ یا کوئی بھی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیر معاشرہ کے اندر اسلامی نظام برپا کرنے کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

اگر آپ مینڈکوں کی پنسیری بنانا چاہیں تو وہ کبھی نہیں بنے گی۔ کیوں کہ آپ چند مینڈک پکڑ کر ترازو کے پلہ میں رکھیں گے تو دوسرے چند مینڈک پھدک کر باہر جا چکے ہوں گے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ انسان ایک بے حد سرکش مخلوق ہے جو کسی طرح اپنے کو قابو میں آنے نہیں دیتا۔ جو بھی خارجی تدبیر اس کو قابو میں لانے کی کی جاتی ہے اس سے وہ کسی نہ کسی طرح نکل بھاگتا ہے۔ آدمی کو قابو میں لانے والی واحد چیز یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہو، اس کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہو کہ اگر اس نے بے انصافی کی تو موت کے بعد خدا کا عذاب اس کو پکڑے گا۔

اللہ کے یہاں دونوں برابر نہیں ہو سکتے

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجاھد فی سبیل اللہ لا یستوٗن عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولٰئک ھم الفائزون یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنٰت لھم فیھا نعیم مقیم (توبہ ۲۱ ـ ۱۹)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی خدمت کرنے کو اس شخص کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو لوگ کہ ایمان لائے اور جنھوں نے گھر چھوڑا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف سے رحمت اور رضا مندی کی اور ایسے باغوں کی کہ ان میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی۔

کعبہ، اسلام کے ظہور کے بہت پہلے سے تمام عربوں کے نزدیک مقدس چلا آرہا تھا۔ صدیوں کی تاریخ نے اس کی عظمتیں لوگوں کے دلوں میں قائم کر دی تھیں۔ اس سے معمولی انتساب بھی ایک قابل تذکرہ چیز سمجھا جاتا تھا۔ کعبہ کی زیارت اتنا مقدس عمل تھا جس کو آدمی فخر کے ساتھ بیان کر سکتا تھا۔ کعبہ کا خادم اور منتظم ہونا ایک ایسا مسلمہ اعزاز تھا کہ جس کو حاصل ہو جائے اس کو وہ قوم کا سردار بنانے کے لئے کافی ہو۔ مکہ کے مشرکین کعبہ کی انھیں پر فخر روایات کے اوپر کھڑے ہوئے تھے۔ کعبہ سے انتساب اور اس کی زیارت و خدمت نے ان کو لوگوں کی نظر میں محترم بنا دیا تھا۔ وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ اس کے باہر بھی فضل و شرف کا کوئی درجہ ہے جو کسی کو خدا کی طرف سے عطا کیا جائے۔

دوسری طرف اسلام تھا جس کی ابھی کوئی تاریخ نہیں بنی تھی۔ جس کے گرد ابھی تک عظمتوں کی روایات جمع نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی تصویر لوگوں کی نظر میں یہ تھی کہ —— ایک یتیم جو ابھی تک بکریاں چراتا تھا، اپنے ذاتی حوصلوں کے تحت داعیٔ حق بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کچھ لٹے پٹے لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایک، دیکھنے والوں کو قوم کے اصاغر کا وقتی مجمع نظر آتا تھا۔ دوسرا، قوم کے اکابر کا شان دار قافلہ جو عزت و شرف کی ابدی مسندوں پر جلوہ افروز ہو۔

مکہ کے لوگ اپنے آپ کو کعبہ کی عظمتوں کے جلو میں پاکر مطمئن تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی دینی حیثیت مسلّم ہے۔ ان کی خدا پرستی میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں۔ مگر خدا کے یہاں ایسی دینداری کا کوئی اعتبار نہیں جس کے ساتھ دنیوی عزتیں اور مادی ترقیاں وابستہ ہو گئی ہوں۔ جو دین تجارت بن گیا ہو، وہ کسی کی خدا پرستی کو جانچنے کا

معیار کیسے بن سکتا ہے۔ خدا پرستی تو ایسے دین کے ساتھ جانچی جاتی ہے جو دنیا کی چمک دمک سے خالی ہو۔ خدا ایک غیبی حقیقت ہے اور وہ ہمیشہ غیبی روپ میں انسان کے سامنے آتا ہے۔ خدا پرست وہ ہے جو خدا کو اس کی غیبی صورت میں پالے۔ وہ یتیم چرواہے کے اندر چھپے ہوئے داعیٔ حق کو دیکھ لے۔ وہ ایک انسان کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات میں خدا کی آواز کو پہچان لے۔ وہ معمولی آدمیوں کے ساتھ چلنے والے فرشتوں کی آہٹ کو سن سکے۔ مکہ کے لوگ انتظام حرم اور خدمت حجاج جیسے نمائشی کام کر کے خدا پرستی کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ ان کو خبر نہ تھی کہ عالم الغیب جہاں خدا پرستی کا کریڈٹ دینے کے لئے ان کا انتظار کر رہا ہے وہ دوسرا مقام ہے اور وہ وہی ہے جس کو غیر اہم سمجھ کر انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی خدمت کرنا بجائے خود ثواب کے کام ہیں۔ مگر اس وقت کے تاریخی حالات میں وہ مکہ والوں کے لئے کام سے زیادہ اعزاز بن چکے تھے۔ وہ اس کے ذریعہ بیک وقت دینداری کا شرف حاصل کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ عزت و اقبال کی گدیاں بھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے والوں کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے لئے دین داری عملاً اپنے آپ کو بربادی کے راستہ پر ڈالنے کے ہم معنی تھی اول الذکر کو دین کے نام پر عزت و جاہ کا تمغہ ملتا تھا۔ ہر قسم کی دنیوی سہولتیں فراہم ہوتی تھیں۔ یہ تسکین حاصل رہتی تھی کہ ہماری دین اور دنیا دونوں محفوظ ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر کے لئے دین ایک سراپا جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ اس میں رواج کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی قوت فیصلہ کو استعمال کرنا تھا۔ سامنے کے فائدے کو چھوڑ کر غیب کے فائدے کی جانب دوڑنا تھا۔ عافیت کی زندگی کو خیر باد کہہ کر کھکھیڑ کی زندگی اختیار کرنا تھا۔ ایک کے لئے دین ایک شاندار تجارت تھی دوسرے کے لئے دین سراپا قربانی۔ ایک گروہ حالات کے رتھ پر سوار تھا۔ دوسرے گروہ کا معاملہ یہ تھا کہ رواجی فکر کے دائرہ سے نکال کر اس نے اپنے آپ کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا مومن بنایا تھا۔ دنیا کے بنے ہوئے نقشہ سے بغاوت کر کے اپنے آپ کو آخرت کے اَن دیکھے راستہ پر ڈالا تھا۔ چلتی ہوئی زندگی سے موافقت کرنے کے بجائے ایک ایسی نئی تحریک کا ساتھ دیا تھا جس میں بظاہر کش مکش اور محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ اس قسم کی جان جوکھم دینداری اختیار کرنے کے بعد بھی وہ وقت کے مذہبی ٹھیکیداروں کی نظر میں بے دین ہی بنے ہوئے تھے۔

اللہ کے یہاں اُس ایمان کا درجہ بہت بڑا ہے جب کہ آدمی کا ایمان اس کے لئے عزتیں اور شوکتیں جمع کرنے کے ہم معنی نہ بن رہا ہو۔ جب ایمان کی راہ اختیار کرنا اس قیمت پر ہو کہ آدمی سے اس کا گھر بار اور عزیز و اقارب تک چھوٹ جائیں۔ جب اسلام کے لئے اٹھنے میں کچھ ملنا تو درکنار اپنے جان و مال کو اس کی راہ میں قربان کر دینا پڑے۔ ایسے ہی لوگ خدا کے سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خدا کی رحمتیں اور اس کی رضامندیاں ہیں — ان کے لئے ابدی خوشیوں اور راحتوں کی وہ دنیا ہے جس کا دوسرا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کا مقام ہے۔ یہاں حق کو ہمیشہ مشتبہ حالت (انعام ۹) میں سامنے لایا جاتا ہے۔ آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ پردہ پوش حق کو بے پردہ حالت میں دیکھ لے۔ جو خدا کو اس کے غیبی لباس میں نہ پا سکے اس نے خدا کو پایا ہی نہیں۔

حقیقی دین داری کیا ہے؟

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ

(حج ۳۷-۳۴)

اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کرنا مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو دئے ہیں۔ اللہ ہی تمھارا ایک اللہ ہے، تم اسی کے ہو کر رہو اور خوش خبری دے دو عاجزی کرنے والوں کو۔ وہ لوگ کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور وہ سہنے والے ہیں جو ان پر پڑے۔ اور نماز قائم رکھنے والے ہیں اور ہمارے دئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور قربانی کے جانور کو ہم نے تمھارے لئے اللہ کی نشانی بنایا ہے۔ اس میں تمھارا بھلا ہے۔ پس تم ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام لو۔ جب وہ ذبح ہو جائیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال کو اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو تمھارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کو ان کا گوشت اور ان کا خون نہیں پہنچتا۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ سجھائی اور خوش خبری دے دو نیکی کرنے والوں کو۔

ایک شخص ہے، اس نے قیمت دے کر ایک جانور خریدا اور قربانی کے دن منتر کی طرح کچھ رٹے ہوئے جملوں کو پڑھ کر اس کو ذبح کر دیا۔ گوشت کا کچھ حصہ خود کھایا، کچھ دوسروں کو دے دیا۔ خریداری کے وقت سے لے کر گوشت کھانے تک قربانی کے نام سے جو چیز اس نے جانی وہ بس ایک جانور تھا یا اس کا گوشت و خون۔ اس کی روح نے اس کے سوا کسی اور چیز کا تجربہ نہیں کیا۔

دوسرا شخص وہ ہے جس نے فدائیت کے جذبہ سے ایک جانور لیا۔ جب وہ اس کو مذبح کی طرف لے کر چلا تو اس کا دل کہہ رہا تھا: خدایا! میں جانور کو نہیں خود اپنے آپ کو تیری طرف لے کر آ رہا ہوں، جب اس نے جانور کو مقررہ طریقہ پر ذبح کیا تو اس کی زبان سے نکلا: "خدایا! یہ میری اپنی جان کا ہدیہ ہے جو میں جانور کی جان کی صورت میں تجھ کو پیش کر رہا ہوں۔ تو اس کو قبول کر لے" جانور کی قربانی کے معاملہ نے اس کو اس قربانی کے معاملہ کو یاد دلایا جو بندے کی طرف سے خالق کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور جانور کی قربانی اس کی صرف ایک ظاہری علامت ہے۔ قربانی کے دوران اس کا دل پگھلتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ قربانی اس کے اندر نرمی پیدا کر کے ہر قسم کے برے جذبات کو نکالتی رہی۔ وہ کبر، عداوت، انتقام اور خود نمائی کے جذبات کو اللہ کے لئے قربان کرتا رہا ——— جو شخص گوشت اور خون کی سطح پر رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا صرف گوشت اور خون بھیجا اور جو شخص قربانی کے دوران تقوی کا تجربہ کرتا رہا اس نے گویا اپنے اللہ کو قربانی کا تقوی بھیجا۔ اور تقوی ہی وہ چیز ہے

جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے، اس کو ہمارے گوشت اور خون کی ضرورت نہیں۔

یہی معاملہ پورے دین کا ہے۔ دین کا ایک "گوشت اور خون" ہے اور دین کا ایک "تقویٰ" ہے۔ ایک اس کا چھلکا ہے اور ایک اس کا مغز ہے۔ اللہ کو مغز کی ضرورت ہے نہ کہ چھلکے کی۔ جو لوگ چھلکے کی سطح پر دین کو پائیں، انھوں نے ایسے دین کو پایا جو دنیا کی زندگی میں خواہ دین نظر آئے مگر آخرت میں خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں انھیں لوگوں کا دین قیمت والا ہوگا جنھوں نے مغز کی سطح پر دین کو پایا ہو۔

کچھ لوگ ایمان اور ذکر اور تلاوت اور نماز کا چرچا کرتے ہیں اور ان میں مشغول ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ اچھا دینی کام کر رہے ہیں لیکن اگر ان کا حال یہ ہو کہ ایمان ان کے لئے زبان سے کچھ الفاظ بول دینے کا نام ہو۔ ذکر یہ ہو کہ گنتی کا ایک نصاب مقرر کیا جائے اور کچھ مقرر الفاظ کو اس کے مطابق صبح و شام دانوں پر شمار کر لیا جائے۔ تلاوت کا مطلب ان کے لئے یہ ہو کہ کتاب اللہ کے الفاظ کو، کسی غور و فکر کے بغیر، محض مخارج کی صحت کے ساتھ دہرا لیا جائے۔ نماز سے ان کو جو چیز ملے وہ بس یہ ہو کہ مقررہ وقت پر کچھ مقررہ اعمال کو اعضاء و جوارح کے ذریعہ ادا کر لیا۔ اگر ان کا حال یہ ہو تو گویا انھوں نے دین کے نام پر "گوشت اور خون" کا تحفہ اپنے رب کو بھیجا، وہ تقویٰ کا تحفہ اس کو نہ بھیج سکے۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کو تقویٰ کا تحفہ مطلوب ہے نہ کہ گوشت اور خون کا۔

اسی طرح کچھ لوگ مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ لگائیں۔ مگر ان کا مکمل اسلام عملاً جس چیز کا نام ہو وہ یہ کہ کوڑے اور پھانسی کی سزائیں جاری کی جائیں۔ اور اسی طرح کے کچھ اور حکومتی قوانین کے اجراء کا اعلان کر دیا جائے۔ ان کا مکمل اسلام ان کو بس خارجی اور ظاہری چیزیں دے۔ وہ ان کو نہ اللہ کی قربت کا تجربہ کرائے اور نہ دل کی گھلاوٹ کا۔ وہ نہ آدمی کو کبر اور انانیت سے خالی کرے اور نہ انتقام اور عداوت کے جذبات سے۔ وہ نہ ان کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے بلند انسان بنائے اور نہ یہ مزاج بنائے کہ وہ دوسروں کے لئے وہی پسند کریں جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ وہ دوسروں پر شرعی سزائیں نافذ کرنے کا نعرہ لگائیں مگر خود لفظی تنقید کو بھی برداشت نہ کریں۔ ان کے اندر حقیقی معنوں میں نہ خدا کا خوف ابھرے اور نہ بندوں کی خیر خواہی۔ اگر ایسا ہو تو کہا جائے گا کہ انھوں نے اسلامی نظام کا صرف "گوشت اور خون" پایا ہے، اسلامی نظام کا "تقویٰ" پانے میں وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ دین کی ان شکلوں پر دوڑیں جن میں عوامی بھیڑ جمع ہوتی ہے۔ جن سے چندے اور نذرانے وصول ہوتے ہیں۔ جن سے سستی قیادت حاصل ہوتی ہے جن سے اخباری شہرت ملتی ہے، جن سے اعزازات اور مناصب کے دروازے کھلتے ہیں۔ جن کے ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک شان دار جلسہ میں معزز مہمان بن کر جائے اور ایک لفظی تقریر کر کے خدمت اور عمل کا کریڈٹ حاصل کرلے۔ ایسے لوگ "گوشت اور خون" کی سطح پر دین داری دکھا رہے ہیں۔ جب کہ تقویٰ کی سطح پر دینداری یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو توڑے اور سچائی کے آگے اپنے کو جھکائے۔ خدا کو اشتہاری دین داری مطلوب نہیں ہے بلکہ وہ دینداری مطلوب ہے جو تقریری اسٹیج پر نہیں بلکہ خاموش عمل کے میدان میں ہوتی ہے۔ جہاں آدمی دوسرے سے زیادہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جب وہ نفس پر چوٹ برداشت کرتے ہوئے دوسرے کو اس کا حق ادا کرتا ہے۔ ■

تقویٰ کی حقیقت

قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبك كثرة الخبیث ۚ فاتقوا الله یا اولی الالباب لعلكم تفلحون (مائدہ ۱۰۰)

کہہ دو، ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تم کو خوش لگے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

غیر خدائی بنیادوں پر بظاہر کتنی ہی شان دار ترقی حاصل کرلی جائے وہ بے حقیقت ہے۔ کیوں کہ بالآخر ایسی تمام ترقیاں ڈھ جائیں گی اور وہی انسان کامیاب انسان ہوگا جو خدائی بنیادوں پر کھڑا ہوا ہو۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص حقیقی اوصاف رکھنے کے باوجود لوگوں کی نظر میں حقیر بن جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ دنیوی زور کو اپنے گرد جمع نہ کرسکا۔ اسی طرح کچھ لوگ حقیقی اوصاف نہ رکھتے ہوئے بھی عزت اور خوش حالی اور اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے دنیوی اہمیت کی چیزوں، مثلاً دولت، عہدہ، اعوان و انصار کو اپنی پشت پر اکٹھا کرلیا تھا۔ تاہم ایک طیب ہے اور دوسرا خبیث اور خبیث اور طیب دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ موجودہ مصنوعی صورت حال صرف اس لئے ہے کہ زمین کے مالک نے لوگوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ مگر یہ صورت حال یقینی طور پر عارضی ہے۔ جلد ہی ایسا ہوگا کہ زمین کا مالک اپنے جلال و کمال کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت تمام لوگ اپنے اپنے حقیقی مقام پر آ جائیں گے۔ مالک کائنات کے ظاہر ہوتے ہی تمام مصنوعی عظمتیں اچانک مٹ جائیں گی۔ ہر آدمی اس اصل مقام پر پہنچ جائے گا جو فی الواقع اس کا مقام ہے۔ اس وقت کتنے لوگ، جو دنیا میں شہرت اور عزت کی جنتوں میں بس رہے تھے، اپنے آپ کو ذلت اور ناکامی کے جہنم میں جلتا ہوا پائیں گے۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ اسی مقام پر تھے۔ اور کتنے لوگ جو مسکینی اور بے بسی کے جہنم میں گرفتار دکھائی دیتے تھے، ہر قسم کی عزتوں اور ترقیوں کی بہشت میں باغ باغ ہو رہے ہوں گے۔ کیوں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ جس مقام پر تھے وہ یہی تھا۔

اللہ کا خوف آدمی کو آنے والے وقت سے پہلے اس حقیقت واقعہ کا احساس کرا دیتا ہے جس کو بے خوف انسان صرف اس وقت جانے گا جب کہ وہ اس سے دوچار ہو چکا ہوگا۔ جب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا کا مالک اللہ ہے تو عزت اسی کو حاصل ہوگی جس کو خدا عزت دے اور ذلت اس کے لئے ہوگی جس کو خدا ذلیل کردے یہ احساس جس کے دل میں بیٹھ جائے اس کو دنیا کی تمام شان و شوکت حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اقتدار کی گدی پر بیٹھ کر بھی اپنے کو بے زور پاتا ہے۔ وہ دولت کے انبار کو پاکر بھی اپنے کو محتاج سمجھتا ہے۔ وہ مکمل معنوں میں حقیقت پسند بن جاتا ہے وہ ہر چیز کو اس شکل میں دیکھنے لگتا ہے جیسی کہ وہ حقیقۃً ہے۔

یہ اہل تقویٰ کی کامیابی کا وہ پہلو ہے جو اخروی اعتبار سے ہے۔ وہ حساب کا دن آنے سے پہلے اپنے

کو حساب کی ترازو میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ خدا کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت کو اس وقت سے پہلے تسلیم کر لیتے ہیں جب کہ خدا اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا اور کسی کے لئے ماننے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ حالت غیب میں جو شخص اس طرح اللہ کا اقرار کرے وہ امتحان میں پورا اترا۔ آخرت میں جب اللہ اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو ایسے بندوں کو وہ اپنی رحمتوں سے مالا مال کر دے گا اور یہی اصلی اور حقیقی کامیابی ہے۔

مگر اللہ نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ اگر خدا کے بندوں کی کوئی قابل لحاظ تعداد تقویٰ کی اس روش کو عملاً اختیار کرے تو اس کی کامیابیوں کا آغاز اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں دنیائیں خدا کی دنیائیں ہیں اور جو حقیقت پسندانہ اوصاف آدمی کی آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہیں، وہی حقیقت پسندانہ اوصاف دنیا کی کامیابی کو بھی یقینی بناتے ہیں۔ انسان کو ذاتی طور پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہ دراصل اللہ کی نصرت ہے جو کسی کو کامیاب بناتی ہے۔ اللہ کی نصرت ہی آدمی کو آخرت میں کامیاب بنائے گی اور وہی آدمی کی دنیا کو بھی کامیاب بنانے والی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آخرت میں آدمی کے انفرادی عمل کے مطابق اس کو کامیابی دی جائے گی۔ ایک شخص اگر ذاتی طور پر سچا مومن ہے تو محض اپنے ذاتی ایمان کی بدولت وہ آخرت کی کامیابی کا مستحق قرار پا جائے گا۔ مگر دنیا میں اہل ایمان کی کامیابی (غلبہ) کا انحصار اجتماعی ایمان پر ہے۔ یعنی دنیا کی زندگی میں اہل ایمان کو اسی وقت غلبہ اور سربلندی حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ قابل لحاظ تعداد میں سچی خدا پرستی کی شرائط کو پورا کر رہے ہوں۔

دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لئے کس قسم کے افراد کا مجموعہ درکار ہے۔ اس کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو اپنے آپ کو اس مقام پر رکھنے کے لئے راضی ہو جائیں جو کہ باعتبار حقیقت ان کا مقام ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں آدمی کا مقام عجز ہے۔ اس لئے ہر آدمی اللہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر عاجز محسوس کرے۔ وہ گھمنڈ اور خود رائی سے اپنے کو پاک کرلے۔ بندے کے مقابلہ میں آدمی کا مقام برابری کا ہے۔ ہر آدمی کا باعتبار حقیقت وہی درجہ ہے جو کسی دوسرے آدمی کا ہے۔ عزت، دولت، اقتدار یا نسلیت اور قومیت کی بنا پر ایک آدمی اور دوسرے آدمی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے دو آدمیوں میں اس قسم کا فرق کتنا ہی زیادہ پایا جائے مگر دونوں آدمی اپنے کو یکساں درجہ کا انسان سمجھیں، کوئی شخص نہ احساس کمتری کا شکار ہو اور نہ احساس برتری کا۔

ان اوصاف کے پیدا ہونے کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ اللہ سے ڈرنے والوں میں یہ خصوصیات سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ دنیا کا نظام بھی سب سے زیادہ بہتر طور پر سنبھال سکتے ہیں۔ اور اس لئے وہ سب سے زیادہ اللہ کی نصرت کے مستحق بنتے ہیں۔ ان کا تقویٰ ان کو عجلت پسندی، ذاتی نمود و نمائش، باہمی عداوت اور بے انصافی سے پاک کر دیتا ہے۔ ان کے حوصلے اور تمنائیں دنیوی چیزوں کے بجائے اخروی چیزوں میں لگ جاتی ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں ان کو خدا کی اس دنیا میں کوئی چیز کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔

توبہ وہی ہے جو سنجیدہ فیصلہ بن جائے

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (نساء ۱۷-۱۸)

اللہ ضرور ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی سے برا کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ توجہ فرماتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے، حکمت والا ہے۔ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں جو برائی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت آجاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ان لوگوں کی توبہ جن کو حالتِ کفر پر موت آتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

توبہ کے اصل معنی متوجہ ہونے کے ہیں۔ آدمی سے کوئی برائی ہوجائے اور پھر اللہ کے سامنے حاضری کا احساس اس کے اندر شدید ندامت کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ بیتابانہ طور پر چاہنے لگے کہ دوبارہ اس سے ایسی برائی سرزد نہ ہو تو اس کو شریعت میں توبہ کہتے ہیں۔ قرآن کے مطابق مطلوب توبہ وہ ہے جو توبہ نصوح ہو۔ نصوح کے معنی ہیں خالص۔ عربی میں کہتے ہیں نَصَحَ العسلَ یعنی شہد کو صاف کرکے اصلی شہد بنایا۔ توبہ نصوح وہ توبہ ہے جو سچی توبہ ہو جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت پیدا ہوئی ہو۔

حدیث میں آیا ہے: الندم توبة (اخرجہ احمد و ابن ماجہ عن عبداللہ بن مسعود مرفوعاً) اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کی اصل ندامت و شرمندگی ہے۔ شرمندگی کا احساس جتنا شدید ہوگا، آدمی کی توبہ اتنی ہی سچی اور خالص ہوگی۔ جب آدمی غلطی کرکے تڑپ اٹھے اور خدا کے یہاں بازپرس کا احساس اس کو بے چین کردے تو اس کی توبہ محض چند الفاظ کو زبان سے بول دینا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کی پوری ہستی کے لئے ایک نئی زندگی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ وہ احساس گناہ سے شدید طور پر شرمندہ ہوتا ہے، وہ بے تابانہ اللہ سے معافی مانگتا ہے۔ وہ عزم کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا نہ کرے گا۔ وہ فوراً اپنی اصلاح میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرتا ہے۔ جو حقوق پامال ہوئے تھے ان کی ادائگی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اس ایک سوال پر لگ جاتی ہے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو سابقہ غلطیوں سے مکمل طور پر پاک کر ڈالے۔ امام حسن بصری نے فرمایا: التوبة النصوح ان تبغض الذنب کما احببته وتستغفر منه اذا ذکرته یعنی سچی توبہ یہ ہے کہ برائی سے تم کو نفرت ہوجائے جس طرح اس سے پہلے اس سے محبت تھی اور جب برائی یاد آئے تو اللہ سے اس کے لئے مغفرت مانگو (ابن کثیر)

توبہ کا سب سے نازک امتحان وہ ہے جب کہ ایک آدمی کو دوسرے سے شکایت ہوجائے اور

انتقامی جذبہ کے تحت وہ اپنے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی کر گزرے۔ اس قسم کے معاملات میں اپنے کو توبہ کی طرف لے جانا کسی آدمی کے لئے مشکل ترین جہاد ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے ذہن کا گھوڑا اگر ایک بار بدک جائے تو پھر وہ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ بس مخالف سمت ہی میں دوڑتا رہتا ہے۔ کسی شکایت کے باعث اگر اس نے کسی کے خلاف ایک بار بری رائے قائم کر لی تو ہزار دلائل کے بعد بھی وہ دوبارہ اپنے ذہن کو صاف نہیں کرتا۔ اگر اس نے انتقامی جذبہ کے تحت کسی کو اجاڑنے کا اقدام کر دیا تو قرآن و سنت کی تمام تصریحات بھی اس کو اس اقدام سے روکنے والی ثابت نہیں ہوتیں۔ اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے کسی کے نقطۂ نظر کی بابت ایک بار کوئی الٹی بات ذہن میں آگئی تو وہ دوبارہ ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لیتی ——— لوگوں نے توبہ کا ایک روایتی مفہوم بنا لیا ہے اور کچھ خاص طرح کی چیزوں کے بارے میں "توبہ توبہ" کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے توبہ کے بارے میں شریعت کے حکم کی تعمیل کر لی، وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ حالاں کہ وہ نازک مواقع جہاں اصلاً ان کی "توبہ" کا امتحان لیا جا رہا ہے وہاں وہ گناہ سے توبہ کے بجائے گناہ پر اصرار کو اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی غلطی سے توبہ کرنا آسان ہوتا ہے جو صرف ایک غلطی ہو، اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی پیچیدگی شامل نہ ہوئی ہو۔ مثلاً کسی وراثت کے ذریعہ آپ کے پاس کوئی ایسی زمین آگئی جو حقیقۃً غصب کی زمین تھی۔ ایسی زمین کو اس کے جائز مالکوں کی طرف لوٹانا بھی توبہ ہے۔ اس توبہ کی راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہے وہ صرف مفاد پرستی ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے کو توبہ پر آمادہ کرنا نسبتاً آسان ہے ــــ مگر غلطی کی ایک اور قسم ہے اور یہ غلطی وہ ہے جب کہ اس کے ساتھ ضد اور انتقام کے جذبات شامل ہو جائیں۔ مثلاً کسی کے پیغام کو رد کرنے کے بعد اس کی صداقت ظاہر ہونے پر دوبارہ اس کو ماننا، کسی کے خلاف غصہ اور تلخی کی حالت میں کوئی اقدام کر دینے کے بعد اپنے اقدام کو واپس لینا۔ کسی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دینے کے بعد دوبارہ اس کا اعتراف کرنا۔ نفرت کے جذبہ کے تحت کسی کو نقصان پہنچا دینے کے بعد پھر اس کی تلافی کرنا، وغیرہ ——— اس دوسری قسم کی توبہ آدمی کے لئے ہمیشہ مشکل ترین ہوتی ہے۔ مگر یہی وہ توبہ ہے جس سے آدمی اپنے رب کے قریب آتا ہے۔ اور یہی وہ "قربانی" ہے جس کے بعد نصرت خداوندی کے دروازے اس کے لئے اس طرح کھول دئے جاتے ہیں کہ پھر کبھی بند نہیں ہوتے۔

توبہ، یعنی حق کے راستہ سے ہٹ جانے کے بعد دوبارہ حق کی طرف آنا، زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہی ایمان و اسلام کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ آدمی جب ایک بار کسی حق کا انکار کر دے تو خواہ اس کے حق میں کتنے ہی دلائل ظاہر ہوں وہ اس کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے، وہ اس کی طرف لوٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ـ ایسی حالت میں اپنی عزت کو خطرہ میں ڈال کر دوبارہ حق کی طرف لوٹنا ایک ایسا عمل ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے ـ ایک شخص کسی کے خلاف ظلم کر بیٹھے اور حالات کی موافقت کی وجہ سے ظلم میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد حقائق سامنے آنے کے بعد اپنی غلطی پر متنبہ ہونا اور اپنی برائی کی پروا نہ کرتے ہوئے صحیح رویہ کی طرف پلٹ آنا انسان کے لئے ایسی ترقیات کے دروازے کھولتا ہے جس کو کسی بھی دوسرے طریقے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ آدمی جو اپنے رب پر راضی رہا

"انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو سرفراز کیا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو بے قدر کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ اور محتاج کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔ اور مردہ کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال سے بے حد محبت رکھتے ہو۔ ہرگز نہیں، جب زمین توڑ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی۔ اور آئے گا تیرا رب اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ اس دن جہنم سامنے لائی جائے گی۔ اس دن آدمی سوچے گا۔ مگر اب سوچنے کا موقع کہاں۔ وہ کہے گا۔ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ بھیج دیا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی روح چل اپنے رب کی طرف۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر مل جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ (الفجر)

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا رویہ جہنم کو یاد کر کے بنے۔ دوسرے وہ جن کا رویہ جہنم سے بے خوف ہو کر بنے۔ کون جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈر کر جی رہا ہے اور کون اس سے بے پروا ہو کر جی رہا ہے، اس کا اظہار زندگی کے معاملات میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر بار جب زندگی کے مواقع میں سے کوئی موقع پیش آتا ہے تو آدمی اپنے ردعمل سے بتا دیتا ہے کہ دونوں میں سے کون سی حالت ہے جس میں اس کے صبح و شام گزر رہے ہیں۔

ایک وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو عزت اور دولت ملتی ہے تو ان کے اندر اپنی بڑائی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انھیں تنگی اور سختی پیش آجائے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ساری اہمیت دنیا کی عزت اور بے عزتی کی ہے، وہ دنیا کے آرام اور تکلیف کو سب سے زیادہ قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا سابقہ جب کمزور سے پیش آتا ہے تو اس کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے پاس وہ چیز نہیں جو ان کی نظروں میں لحاظ کے قابل ہے۔ ان کے سامنے کوئی ضرورت مند آجائے تو اس کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں ابھرتا۔ ان کو دنیوی مال و متاع کی اتنی حرص ہوتی ہے کہ اخلاقی حدوں کو توڑ کر اور حرام و حلال کی تمیز سے آزاد ہو کر اس کو سمیٹنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ اس قدر سخت دل ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص جو بزور اپنا حصہ وصول کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ ان سے اپنا حصہ پانے کی امید نہیں کر سکتا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو قیامت سے پہلے قیامت کے اندیشوں سے کانپتے رہتے ہیں۔ کوئی معاملہ کرتے وقت ان کے اندر یہ سوچ ابھر آتی ہے کہ بات یہیں دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آخرت تک جاتی ہے۔ نعمت ان کے لئے شکر کا موقع ہوتا ہے اور سختی آتی ہے تو ان کے اندر صبر کا جذبہ جاگتا ہے۔ بے طاقت انسان کے پیچھے ان کو خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ خدا کے یہاں اپنی بے عزتی کا اندیشہ ان کو روکتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی پر قابو

پا جائیں تو اس کو بے عزت کرنے کی کوشش کریں۔ ان کو کوئی بھوکا مل جاتا ہے تو اس کو کھلاتے ہیں تاکہ خدا انھیں آخرت کے دن کھلائے۔ وہ کسی ضرورت مند کو پا لیتے ہیں تو اس کی ضرورت پوری کرتے ہیں تاکہ جب وہ خدا کے یہاں پہنچیں تو خدا ان کی ضرورتیں پوری کرے۔ ان کو ایک ایسا نفس حاصل ہوتا ہے جو ہر وقت خدا میں اٹکا ہوا ہو۔ جس کا ہر رویہ آخرت کی مصلحت کے تحت ظاہر ہو نہ کہ دنیا کی مصلحت کے تحت۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا سے راضی ہوئے، اس لئے خدا بھی ان سے راضی ہو گا۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں خدا کے لئے رکے۔ ان کی زبان خدا کے لئے بند ہوئی۔ انھوں نے اپنے جی کو خدا کے لئے تھاما۔ انھوں نے اپنی مصلحتوں کو خدا کے لئے قربان کیا۔ وہ آسمان کی سطح پر جئے جب کہ دوسرے لوگ زمین کی سطح پر جی رہے تھے۔ یہی لوگ خدا کے سچے بندے ہیں۔ موجودہ دنیا کو توڑ کر جب نیا عالم بنے گا اور وہ خدا کے پاس پہنچیں گے تو خدا ان کو نہال کر دے گا۔ ان کو اپنے وفاداروں کے گروہ میں شامل کرے گا۔ ان کے لئے ان جنتی مکانوں کے دروازے کھول دے گا جو ابدی باغات میں بنے ہوں گے جہاں ہر قسم کی نعمتیں بے حساب مقدار میں جمع ہونگی۔ جہاں نہ موت ہے اور نہ کوئی حادثہ۔ جہاں نہ غم ہے نہ تکلیف۔ جہاں نہ تکان ہے اور نہ اکتاہٹ۔ آدمی اپنے رب کی اس لازوال دنیا کا باشندہ بن جائے گا جس کو دیکھے بغیر اس نے اپنی پوری زندگی کو اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔

حافظ ابن عساکر نے حضرت امامہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا سکھائی:
اللھم انی اسألك نفسا بك مطمئنة تؤمن بلقائك وترضی بقضائك وتقنع بعطائك (اے اللہ میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جو تیرے اوپر مطمئن ہو، تجھ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو، تیرے فیصلہ پر راضی ہو۔ تیرے دئے ہوئے پر قانع ہو) جو شخص دنیا کی ناخوش گواریوں پر اللہ کے لئے راضی ہو جائے، آخرت میں خوش گواریوں پر رضامندی اسی کے حصہ میں آتی ہے۔

نفس مطمئن کا مطلب غم سے پاک دل نہیں ہے بلکہ نفسیاتی گرہوں سے پاک دل ہے۔ مومن کی زندگی دنیا میں کبھی غم سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے غم سے خالی زندگی کا مقام جنت ہے۔ مومن سے دنیا کی زندگی میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ دنیا میں وہ دنیا کے غم کو لے کر نہ جئے بلکہ آخرت کے غم کو لے کر جئے۔ دنیوی چیزوں کا حرص، کسی کے پاس دنیا زیادہ ہو تو اس سے جلنا اور کسی کے پاس دنیا کم ہو تو اس کو حقیر سمجھنا، خوشامد اور تعریف کرنے والوں سے خوش رہنا اور تنقید اور اختلاف کرنے والوں کو بری نظر سے دیکھنا۔ یہ چیزیں جس شخص کے اندر ہوں اس کا سینہ تاریکیوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ منفی نفسیات کے اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ دنیوی محرکات سے اوپر اٹھ جائیں، جن کا سینہ حرص، گھمنڈ، انانیت، نفرت، انتقام، خود پسندی اور بے انصافی سے خالی ہو، ان کے دل کو خدا کی طرف سے اطمینان وسکینت کا نور پہنچتا ہے۔ آخرت کی عظمت ان کے ذہن پر اس قدر چھا جاتی ہے کہ دنیا کی راحت اور تکلیف دونوں ان کو بالکل حقیر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مداح اور اپنے ناقد کو ایک نظر سے دیکھنے لگتے ہیں یہی نفوسِ مطمئنہ ہیں اور انھیں کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

خدا پرستی کیا ہے

قرآن میں کہا گیا ہے : "کیا لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے فرماں بردار ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ کہدو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہمارے اوپر اتارا گیا ہے اور اس پر جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب، موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں باہم فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔ (آل عمران ۸۵-۸۳)

اس سے معلوم ہوا کہ تمام نبیوں پر ایک ہی دین اتارا گیا۔ اور وہ وہی ہے جو ساری کائنات کا دین ہے۔ یعنی اللہ کے لئے مطیع و مسخر ہو جانا۔ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں ملا دینا۔ خدا کے تخلیقی منصوبہ میں اپنے آپ کو ہمہ تن جوڑ دینا۔ جس شاہراہ اطاعت پر ساری کائنات چل رہی ہے، اسی پر چلنے لگنا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: "وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم کو دوزخ کی آگ سے بچا۔ صبر کرنے والے، راستی پر چلنے والے، عاجزی کرنے والے، خرچ کرنے والے اور سحر کے وقت گناہوں کی معافی مانگنے والے۔ اللہ کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور فرشتوں کی اور اہل علم کی۔ وہ عدل سے انتظام کرنے والا، کوئی الٰہ نہیں بجز اس زبردست حکمت والے کے۔ یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اور جو اختلاف کیا اس میں اہل کتاب نے، وہ آپس میں ضد کی وجہ سے کیا۔ جب کہ انھیں صحیح علم پہنچ چکا تھا۔ اور جو کوئی اللہ کی نشانیوں سے انکار کرے گا تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے (آل عمران ۲۰-۱۶)

گویا اللہ کو پانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس کو مدبر کائنات کی حیثیت سے پالے۔ جب آدمی اس حیثیت سے خدا کو پاتا ہے تو اس کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ وہ سرتاپا عاجز اور حقیر ہے۔ وہ اللہ کو مدد کے لئے پکارنے لگتا ہے۔ وہ موت کے بعد زندگی کے تسلسل کو دیکھ لیتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ خدایا مجھ کو ابدی ناکامی سے بچا۔ اس کی تنہائیاں خدا کی یاد میں بسر ہونے لگتی ہیں۔ ان احساسات کے قدرتی نتیجہ کے طور پر دنیا میں لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ صبر، سچائی اور فروتنی کا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی چیز کو بھی خدا کی چیز سمجھنے لگتا ہے جس کا عملی اظہار اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

آدمی جب خدا کی عظمتوں کے ساتھ اس کو پالیتا ہے تو اس کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ضد، گھمنڈ، خود پرستی جیسے پردے اس کی نگاہوں سے ہٹ جاتے ہیں اس کو صاف نظر آتا ہے کہ اصل دین یہی ہے۔ خدا کی وہ نشانیاں جو دین کی اس حقیقت کو آشکارا کر رہی ہیں، اس کو صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس جب آدمی خدا پرستی کے بجائے اپنی ذات کی پرستش کی سطح پر ہو تو ضد اور گھمنڈ کا ہالہ اس کو گھیر لیتا ہے۔

کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہونے کے باوجود وہ سچائی کو دیکھ نہیں پاتا۔ وہ اپنے خود ساختہ دین ہی کو اصل دین سمجھتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ اس وقت سے پہلے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب کہ خدا خود ظاہر ہو جائے اور آدمی کے لئے جھوٹے سہاروں اور لفظی تاویلوں کی آڑ میں چھپنے کا موقع سرے سے باقی نہ رہے۔

"سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے"، کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے براہ راست اپنے زیر انتظام کائنات میں جو دین قائم کر رکھا ہے وہی دین انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے اختیار و ارادہ کے تحت اسی آفاقی دین پر قائم ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کو جان لینا چاہئے کہ معاملہ بالآخر اسی کے یہاں پیش ہونا ہے جو آج تم سے اطاعت و فرماں برداری کا مطالبہ کر رہا ہے۔ پھر کیا جو خدا وسیع تر کائنات میں یہ نظام قائم کئے ہوئے ہے کہ اس کا کوئی جزء دوسرے اجزاء سے ٹکرائے بغیر اپنا فریضہ ادا کرے۔ وہی خدا انسان سے اس پر راضی ہو جائے گا کہ وہ آپس میں ٹکرائیں اور دوسرے کی بربادی پر اپنی تعمیر کا خواب دیکھیں۔ جو خدا بقیہ کائنات میں خاموش طور پر تمام سرگرمیاں انجام دے رہا ہے وہی خدا انسان کے لئے یہ پسند کرے گا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر چیخے اور فضا کو شور و غل سے بھر دے۔ جو خدا اتنا حکمت پسند ہے کہ شیشم اور چنار کے درخت کو سو سال میں مکمل کرتا ہے وہی خدا انسان کے معاملہ میں اس عجوبہ کو دیکھنا پسند کرے گا کہ وہ نعروں اور تقریروں کے کرتب دکھائیں اور صبح و شام میں تعمیر و ترقی کا مینار کھڑا کر دیں۔ خدا کی جس دنیا میں پانی کا دھارا بہنا چاہتا ہے تو زمین اپنے راستے اس کے لئے کھول دیتی ہے۔ اسی دنیا میں خدا انسانوں سے اس بات پر خوش ہو جائے گا کہ وہ دوسرے کا اعتراف نہ کریں اور دوسرے کے فضل و کمال کو ماننے سے انکار کر دیں۔ کائنات کا ایک فرد کہیں غلاظت ڈال دے تو کروروں بیکٹیریا وہاں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ غلاظت کے کیمیائی اجزاء کو الگ کر کے اس کو دوبارہ کائنات کے صالح اجزاء کا حصہ بنا دیں۔ اسی کائنات میں خدا انسان کو اس بات پر انعام دے گا کہ وہ کسی بھائی کی غلطی کو دیکھے تو اس کو وہ اس لئے پکڑ لے کہ اس کے ذریعہ اس کو ذلیل کرنا ہے، غلطی کی تلافی یا درستگی سے اس کو کوئی دل چسپی نہ ہو۔

قرآن جس نظام آخرت کا لفظی تعارف ہے وہی نظام اللہ تعالیٰ نے انسان کے سوا بقیہ کائنات میں آج بھی قائم کر رکھا ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت کمتر اندازہ ہوگا اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ قرآن میں آخرت کی کامیابی اور ناکامی کے جو اصول بتائے گئے ہیں وہ محض ترنم اور خوش الحانی کے لئے ہیں یا کائنات میں اللہ تعالیٰ اپنے جس پسندیدہ نظام کو قائم کئے ہوئے ہے۔ اس کے سوا بھی کسی چیز پر وہ انسان سے راضی ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ قرآن میں وہ بندوں کو عدل پر قائم ہونے کا حکم دے۔ ساری کائنات کو حد درجہ عدل پر چلا رہا ہو۔ مگر جب فیصلہ کا دن آئے تو وہ غیر عادلانہ بنیادوں پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کر دے۔ اللہ نے اپنی کتاب کو نہ تو بطور شاعری کے اتارا ہے اور نہ کائنات کو بطور کھیل کے پیدا کر دیا ہے۔ اللہ سراپا خیر اور عدل ہے اور اس کا فیصلہ جو انسانوں کے لئے ظاہر ہوگا وہ بھی سراپا خیر اور عدل ہوگا۔ اس کے سوا کوئی اور امید قائم کرنا ایک ایسی بے بنیاد خوش گمانی ہے جو زمین و آسمان میں کہیں اپنے لئے جگہ نہیں پا سکتی۔

برا نام دینا

یاایھا الذین اٰمنوا لایسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرًا منھم ولانساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منھن ولاتلمزوا انفسکم ولاتنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولٰئک ھم الظالمون (الحجرات ۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، اور نہ ایک دوسرے کو برا لقب دو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو شخص توبہ نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ولاتنابزوا بالالقاب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے منع فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم تفسیر طبری کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

(ولاتنابزوا بالالقاب) نھی ان یدعی الرجل باسم یکرھہ اوصفۃ (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان) من سخر من المومنین و نبزھم بالالقاب وخالف امر اللہ عزوجل فقد استحق اثم الفسق (طبری)

ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا ہے کہ کسی آدمی کو ایسے نام سے پکارا جائے جس کو وہ پسند نہ کرے یا ایسی صفت سے جو اس کو پسند نہ ہو۔ جو مسلمان کسی شخص کا مذاق اڑائے اور اس کو برا لقب دے اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو وہ فسق کے گناہ کا مستحق ہوگیا۔

ایک شخص سے آپ کو اختلاف ہوجائے تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو اس کے اصل نام سے پکاریں اور اس کی اس صفت پر اظہار خیال کریں جو اس کی معروف صفت ہے، اگر آپ ایسا کریں تو ایسا کرنا آپ کے لیے جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کو ایک نیا نام دیں، مثلاً عبدالوہاب کے بجائے اس کو وہابڑا کہیں تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر آپ اس کے مسلک کو اس کے ظاہر کیے ہوئے لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے کچھ دوسرے الفاظ میں بیان کریں، مثلاً یہ کہیں کہ یہ کافروں کا ایجنٹ ہے، تو یہ سراسر فاسقانہ حرکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے۔

اس آیت میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے، اس کا تلخ تجربہ ہم کو ماہنامہ الرسالہ کے سلسلہ میں ہوا۔ الرسالہ میں اسلام کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا جارہا ہے ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق تعمیر ملت سے ہے۔ الرسالہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ قرآن کے حکم کے مطابق، صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ اس بات سے برہم ہو کر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ الرسالہ مسلم دشمنوں کا ایجنٹ ہے، وہ مسلمانوں کو بزدلی سکھا رہا ہے، وغیرہ۔

اس طرح کے تبصرے، مذکورہ آیت کے مطابق، بلاشبہ فسق ہیں۔ یہ ہم کو وہ نام دینا ہے جو ہم نے اپنا نام نہیں رکھا، اور ہماری طرف وہ الفاظ منسوب کرنا ہے جو ہم نے اپنی زبان سے ادا نہیں کیا۔ لوگوں کو اگر کہنا ہے تو یہ کہیں کہ الرسالہ صبر اور اعراض کی پالیسی پر عمل کرنے کا سبق دیتا ہے اور ہم فلاں شرعی یا علمی دلیل کی بنا پر اس کو رد کرتے ہیں۔ انھیں جو کچھ بولنا ہے "صبر اور اعراض" پر بولیں نہ کہ "بزدلی" یا کسی اور نام پر جو انھوں نے خود سے گھڑ کر ہمارے اوپر چسپاں کر دیا ہو۔ ہم نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ "مسلمان صبر کریں" ہم نے یہ نہیں کہا کہ "مسلمان بزدل بنیں" ایسی حالت میں جو شخص ہمارے اوپر وہ لفظ چسپاں کرتا ہے جو ہم نے نہیں کہا تو اس کو جاننا چاہیے کہ اس کے اوپر قرآن کی مذکورہ آیت چسپاں ہو رہی ہے، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔

مذکورہ آیت میں مزید یہ فرمایا گیا ہے کہ دوسرے شخص کو برا کہنے والا اگر توبہ نہ کرے تو اللہ کے یہاں وہ خود ظالم قرار پائے گا۔ یہی بات حدیث میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ یہاں ہم چند روایتیں نقل کرتے ہیں:

عن ابی ذر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لایرمی رجل رجلاً بالفسوق ولایرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذلک (رواہ البخاری) وعن ابن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایما رجل قال لاخیہ کافر فقد باء بہا احدہما (متفق علیہ) وعن ابی ذر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک شخص دوسرے شخص کو فسق یا کفر کا الزام لگائے تو یہ الزام ضرور کہنے والے پر لوٹے گا اگر اس کا ساتھی ایسا نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بھی اپنے بھائی کو کافر کہے تو وہ ضرور دونوں میں سے ایک پر پڑے گا۔ حضرت ابوذر کہتے

علیہ وسلم من دعیٰ رجلاً بالکفر او قال عدو اللہِ ولیس ذالک الاحاء علیہ (متفق علیہ)

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دوسرے شخص کو کافر کہہ کر پکارے یا اس کو خدا کا دشمن کہے اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ بات خود کہنے والے پر لوٹ آئے گی۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو برا نام دینا بے حد سنگین جرم ہے۔ اور اس کی سنگینی کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ جس شخص کو برا نام دیا گیا ہے، اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اس برے نام کا سارا وبال خود کہنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ شریعت اسلام نے اس سے کسی کو نہیں روکا کہ وہ حقائق وواقعات کی بنیاد پر کسی کے خیالات کا تجزیہ کرے جس کو موجودہ زمانہ میں علمی تنقید کہا جاتا ہے۔ مگر کسی کو برا نام دینا (کسی کے بارہ میں مخالفانہ ریمارک پاس کرنا) سراسر غیر شرعی فعل ہے۔ یہ اللہ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ اگر مخاطب ویسا نہ ہو تو یہ برا نام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا بوم رینگ (Boomerang) عمل ہے۔ یہ ایک ایسا پتھر ہے جو دوسرے پر نہ پڑے تو وہ لوٹ کر خود پھینکنے والے پر پڑتا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے: "عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا۔ بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزاء کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ حالاں کہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے مگر ضد اور نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ آیۂ ہذا میں خداوند قدوس نے اس قسم کی باتوں سے منع فرمایا ہے۔ یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ نہ مسخرا پن کرے نہ ایک دوسرے پر آوازے کسے جائیں، نہ کھوج لگا کر عیب نکالے جائیں اور نہ برے ناموں اور برے القاب سے فریق مقابل کو یاد کیا جائے۔ کسی کا برا نام ڈالنے سے آدمی خود گنہ گار ہوتا ہے۔ اُسے تو واقع میں عیب لگا یا نہ لگا، لیکن اس کا نام بدتہذیب، فاسق، گنہ گار، مردم آزار پڑ گیا۔ جو پہلے ہو چکا اب توبہ کر لو۔ اگر یہ احکام و ہدایات سننے کے بعد بھی ان جرائم سے توبہ نہ کی تو اللہ کے نزدیک اصلی ظالم یہ ہی ہوں گے۔"

دو قسم کے انسان

والتین والزیتون۔ وطور سینین۔ وھذا البلد الامین۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین۔ الا الذین امنوا وعملوا الصٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون۔ فما یکذبک بعد بالدین۔ الیس اللّٰہ باحکم الحاکمین۔ (التین)

قسم ہے تین اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو سب سے اچھی ساخت پر۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو سب سے نچلی پستی میں۔ مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں تو ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا۔ پھر کیا چیز تجھ کو روز جزا کے جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے۔ کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔

تین اور زیتون سے مراد فلسطین کی دو پہاڑیاں ہیں جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور بعثت ہوئی۔ طور، صحرائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا۔ بلد امین (مکہ) وہ شہر ہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے گیے۔ بائبل میں ہے : خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر چمکا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا (استثنا ۳۳ : ۱-۲) یہود کی نظر میں سب سے زیادہ عظمت حضرت موسیٰ کی تھی اور عیسائیوں کی نظر میں حضرت مسیح کی۔ اس لیے پیغمبر آخر الزماں کے ساتھ ان دونوں مسلّمہ شخصیتوں کی مثال دے کر بتایا کہ خدا کی طرف سے ان داعیوں کا آنا کس طرح ایک عظیم حقیقت کو آشکارا کرنے کا سبب بنا۔ وہ یہ کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک احسن تقویم کے مقام پر ہے اور دوسرا اسفل سافلین کے مقام پر۔ اور جب انسانوں میں اس قسم کا فرق پایا جائے تو ان کا انجام ایک کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر دنیا کی زندگی میں خدا کی عدالت ہے۔ وہ اسی لیے آتا ہے کہ دو قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے۔ ایک وہ انسان ہے جو حق کے آگے جھک جاتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو حق کے آگے سرکشی دکھاتا ہے۔ ایک دوزخ میں جی رہا ہے، دوسرا جنت میں سانس لے رہا ہے۔ پیغمبر اس لیے آتا ہے

کہ دونوں قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کردے ۔ دودھ بلویا جاتا ہے تو مکھن الگ ہو جاتا ہے اور چھاچھ الگ ۔ اسی طرح پیغمبر کی دعوت کا اٹھنا ایک قسم کا بلونے کا عمل ہے ۔ اس کے نتیجہ میں دونوں قسم کے انسان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں ۔

کسی آبادی میں جب اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارنے کے لیے اٹھتا ہے تو عملاً یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور کچھ اس کے منکر بن جاتے ہیں ۔ یہ گویا انسانیت کی تقسیم ہے جو اللہ کے نمائندے کے ذریعہ عمل میں آتی ہے ۔ وہ شخص جو اپنی فطرت کو زندہ کیے ہوئے تھا اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ سچائی کی آواز کو اس طرح پہچان لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کی آواز کو ۔

خدا نے اس کو انسان کی زبان سے پکارا تو اس نے اپنے رب کی آواز کو پہچان لیا اور اس کی طرف دوڑ پڑا ۔ حق کی دعوت جب اس کے ذہن سے ٹکرائی تو اس کے اندر اعتراف، تواضع، تقویٰ اور حق شناسی ابھرا ۔ اس نے اپنی زندگی کو پوری طرح اللہ کے راستہ پر ڈال دیا ۔ دنیوی مفاد، عزت کا سوال، مصلحتوں کے اندیشے، کوئی بھی چیز اس کے لیے اپنے رب کا راستہ اختیار کرنے میں رکاوٹ نہیں بنے ۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جنھوں نے خدا کی دی ہوئی آنکھ اور کان کو اس طرح بگاڑ رکھا تھا کہ خدا کی آواز انتہائی عیاں ہونے کے باوجود، ان کی سمجھ میں نہ آسکی ۔ وقتی مفادات، عوامی دباؤ اور شخصی مصالح کو انھوں نے وہ اہمیت دی جو صرف حق کو دی جانی چاہیے ۔ انھوں نے دنیا کے تقاضوں کو ترجیح دی اور آخرت کے تقاضوں کو ٹھکرا دیا ۔ وہ اپنی ذات میں گم رہے اور خدا کی طرف نہیں لپکے ۔

حدیث میں آیا ہے کہ اِذَا قَرَأَ اَحَدُکُمْ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ فَاَتٰی عَلٰی آخِرِھَا (اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ) فَلْیَقُلْ بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ ۔ جب تم میں سے کوئی شخص سورہ والتین والزیتون پڑھے اور اس کے آخر تک پہونچے تو اس کو چاہیے کہ وہ کہے کہ ہاں، اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں ۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا : سُبْحَانَکَ فَبَلٰی ۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ ایک شخص جب اس کو پڑھے تو اس کے پڑھنے سے اس کی نفسیات میں ہلچل پیدا ہو ۔ وہ قرآن کے مضامین کے مطابق ہر موقع پر مناسب جواب پیش کرتا چلا جائے ۔

یہ فرق کیوں

قرآن میں اہلِ جنت کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مقربین خاص۔ اور دوسرے عام انعام یافتہ لوگ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مقربین خاص کی تعداد پہلے لوگوں میں زیادہ ہوگی اور بعد کے لوگوں میں کم ہوگی۔

وکنتم ازواجاً ثلاثۃ۔ فاصحاب المیمنۃ مااصحابُ المیمنۃ واصحاب المشئمۃ مااصحاب المشئمۃ۔ والسابقون السابقون۔ اولئک المقربون۔ فی جنات نعیم۔ ثلۃ من الاولین ۔وقلیل من الآخرین ۔ (الواقعہ)

اور تم لوگ (قیامت میں) تین قسم کے ہو جاؤ گے۔ پھر دائیں والے، کیا خوب ہیں دائیں والے۔ اور بائیں والے، کیسے برے ہیں بائیں والے۔ اور آگے والے تو آگے ہی والے ہیں۔ وہ مقرب لوگ ہیں۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان کی بڑی تعداد اگلوں میں سے ہوگی، اور تھوڑی تعداد پچھلوں میں سے ہوگی۔

اس قرآنی بیان کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیر اپنی تفسیر کی کتاب میں لکھتے ہیں:

لاشک ان اول کل امۃ خیر من آخرھا فیحتمل ان تعم الآیۃ جمیع الامم کل امۃ بحسبھا۔ ولھذا ثبت فی الصحاح وغیرھا من غیر وجہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم

(الجزء الرابع، صفحہ ۲۸۴)

اس میں شک نہیں کہ ہر امت کا پہلا گروہ اس کے بعد کے گروہ سے بہتر ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ آیت حسب حیثیت تمام امتوں کے لیے ہو۔ اور صحاح اور دوسری کتب حدیث میں ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے اور اس کے بعد جو لوگ آئیں گے۔

پہلے گروہ اور دوسرے گروہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں: "ہر امت کے پہلے طبقہ میں نبی کی صحبت یا قرب عہد کی برکت سے

اعلیٰ درجہ کے مقربین جس قدر کثرت سے ہوئے ہیں، پچھلے طبقوں میں وہ بات نہیں رہی"۔ مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ اگر یہ فرق صحبت کی وجہ سے پیدا ہوتا تو قرآن میں یہ درج ہونا چاہیے تھا کہ دورِ اوّل کے تمام لوگ " السابقون " ہوں گے اور دورِ ثانی کے تمام لوگ " اصحاب الیمین"۔

اس کے برعکس قرآن کے مطابق "صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد ہوں گے اور "غیر صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد۔

اصل یہ ہے کہ یہ فرق اصلاً نوعیت ایمان کے اعتبار سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ صرف نوعیتِ زمانہ کے اعتبار سے۔ پیغمبر کا دور دعوت کا دور ہوتا ہے۔ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں وہ دعوت کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان کا اسلام ان کے لیے ایک دریافت ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کو وہ برتر ایمان عطا کرتی ہے جو ان کو السابقون کی صف میں داخل کر دیتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں بعد والوں کا اسلام نسلی اسلام ہوتا ہے۔ ان کو اسلام بطور وراثت ملتا ہے نہ کہ بطور دریافت۔ ظاہر ہے کہ وراثت والے اسلام میں وہ خصوصیات نہیں ہو سکتیں جو دریافت والے اسلام میں ہوتی ہیں۔ تاہم بعد کے دور میں بھی جن افراد کو اللہ کی توفیق سے دریافت والا اسلام حاصل ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پائیں گے کہ انھیں السابقون کی صف میں داخل کیا جائے۔

٥

زکوٰۃ کے بارے میں

قرآن میں زکوٰۃ کی آٹھ مدوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے ایک مد فی سبیل اللہ (التوبۃ) ہے۔ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ قرآن کا لفظ اگرچہ عام (اللہ کے راستے میں) ہے۔ تاہم جمہور فقہائے اس مد کو جنگ کے لئے خاص کیا ہے۔ ان کا متفقہ مسلک یہ ہے کہ زکوٰۃ کی یہ مد ان افراد کے لئے ہے جو ذاتی طور پر بطور خود کسی اسلامی جنگ میں حصہ لیں۔ اور حکومت کی طرف سے ان کی تنخواہ مقرر نہ ہو۔ (جمہور العلماء علی ان المراد بہ هنا الغزو۔ وان سهم (سبیل اللہ) یعطی للمتطوعین من الغزاۃ الذین لیس لهم مرتب من الدولۃ، فقہ السنۃ، المجلد الاول صفحہ ۳۹۴)

اگر مسئلہ کی اس صورت کو تسلیم کر لیا جائے تو گویا فی سبیل اللہ کی ہدایت اب عملاً منسوخ ہو چکی ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا طرز پر جنگ میں شریک ہونا صرف قدیم زمانہ میں ممکن تھا۔ اب جدید حالات میں اس قسم کی شرکت کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کی جنگ اتنی زیادہ پیچیدہ اور ٹکنکل ہوتی ہے کہ صرف باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ لوگ ہی اس میں حقیقی حصہ لے سکتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ لوگوں کو جنگ میں حصہ لینے کا موقع دینا موجودہ زمانہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی شکست کا انتظام کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر، اب صرف حکومت کے مشاہرہ یاب افراد ہی جنگ میں حصہ لے سکتے ہیں۔ دراصل فی سبیل اللہ ایک عام لفظ ہے۔ اس میں وہ تمام کام شامل ہیں جو اللہ کے راستے میں کئے جائیں۔ خاص طور پر اس سے وہ کام مراد ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ اسلام میں اصل چیز "حرب" نہیں بلکہ اصل چیز "دعوت" ہے۔ اسلامی عمل اصلاً دعوت سے شروع ہوتا ہے اور حرب صرف اس وقت پیش آتی ہے جب کہ فریق ثانی کی طرف سے اس کا آغاز کر کے داعیان اسلام کو دفاعی مقابلہ کے لئے مجبور کر دیا گیا ہو:

ومن اھم ماینفق فی سبیل اللہ فی زماننا ھذا اعداد الدعاۃ الی الاسلام وارسالھم الی بلاد الکفار من قبل جمعیات منظمۃ تمدھم بالمال الکافی کما یفعلہ الکفار فی نشر دینھم۔

رشید رضا، تفسیر المنار

فی سبیل اللہ میں خرچ کی سب سے اہم مد موجودہ زمانہ میں یہ ہے: اسلام کے داعی تیار کرنا اور اسلامی تنظیموں کی طرف سے ان کو غیر مسلمین کے ملکوں میں بھیجنا جو کافی مال سے ان داعیوں کی مدد کریں۔ جس طرح دوسرے مذاہب والے اپنے دین کو پھیلانے کے لئے کرتے ہیں۔

اقامت دین

سورہ انعام میں حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤ، سلیمان، ایوب، یوسف، موسٰی، ہارون، زکریا، عیسٰی، یحیٰی، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ان تمام پیغمبروں کو ہم نے عالم پر فضیلت دی اور ان کو ہدایت بخشی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے: اولئك الذین هدى الله فبهداهم اقتده (الانعام ۹۰) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ ایک ہی میثاق نبوت ہے جو حضرت محمد، نوح، ابراہیم، موسٰی، عیسٰی اور تمام پیغمبروں سے لیا گیا۔ یہ میثاق اس بات کا تھا کہ لوگوں کے سامنے حقیقت آخرت کو پوری طرح کھول دیا جائے تاکہ کوئی شخص بھی آنے والے نازک مرحلۂ حیات سے بے خبر نہ رہے۔ پھر جو کوئی تصدیق کرے وہ اپنی تصدیق کا ابدی انعام پائے اور جو منکر بنا رہے وہ اپنے انکار کی ابدی سزا بھگتے۔ احزاب ۸-۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی مشترک پیغمبرانہ مشن ہے جس کے لئے ہر نبی کو کام کرنا ہے۔ اب اگر گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر نبی کے یہاں کچھ چیزیں مشترک ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنا، حضرت نوح کا کشتی بنانا۔ حضرت موسٰی کا ید بیضا کا معجزہ دکھانا۔ حضرت سلیمان کا ہوا میں اڑنا۔ حضرت یوسف کا مسائل قحط کو حل کرنا۔ حضرت یحیٰی کا قتل ہو جانا۔ حضرت مسیح کا مردہ کو زندہ کرنا۔ ان میں سے ہر چیز ہر نبی کے یہاں الگ الگ ہے۔ کوئی نبی اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مشترک نہیں ہے۔ انھیں غیر مشترک چیزوں میں حکومت کا قیام بھی ہے۔ کیوں کہ وہ بعض پیغمبروں کے یہاں پایا جاتا ہے مگر اکثر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔

اب اگر فبهداهم اقتده کا مطلب یہ لیا جائے کہ ایک پیغمبر دوسرے پیغمبروں کی تمام چیزوں کا اتباع کرے تو یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ کسی پیغمبر نے کیا۔ حتیٰ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم جو نبی کامل ہیں۔ انھوں نے بھی نہیں کیا۔ مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کو ذبح نہیں کیا۔ آپ نے جنوں کو مسخر کرکے ان سے کام نہیں لیا۔ آپ نے ید بیضا کا معجزہ نہیں دکھایا۔ آپ نے مردوں کو زندہ نہیں کیا۔ وغیرہ اسی طرح دوسرے نبیوں میں بیشتر وہ ہیں جنھوں نے جہاد بمعنی جنگ نہیں کیا۔ اور حکومت قائم نہیں کی۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات میں اتباع سے مراد مشترک امور میں اتباع ہے نہ کہ غیر مشترک امور میں اتباع۔

ہدایت اور میثاق کا تعلق جب تمام نبیوں کے ساتھ یکساں ہے تو لامحالہ ہدایت اور میثاق کا ایسا

مفہوم لینا پڑے گا جو تمام نبیوں کے درمیان مشترک ہو، جو تمام پیغمبروں پر یکساں طور پر صادق آتا ہو نہ کہ کسی ایک پیغمبر پر۔ اس اصول کی روشنی میں جب نبوت اور کار نبوت کا مشترک پہلو تلاش کیا جائے تو وہ ایک ہی نکلتا ہے ـــــ اعلان آخرت، ایک ایک فرد پر یہ کوشش کرنا کہ وہ دنیا میں ربانی بن کر رہے۔ ورنہ آخرت میں اس کو ابدی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی ایک بات ہے جو تمام نبیوں کے درمیان مشترک ہے۔ اب اگر آدمی اس ایک بات کو اپنی زندگی میں بخوبی طور پر پکڑے اور دوسروں کو اس کی طرف بلائے تو یہ اقامت دین ہے اور اگر وہ اس ایک بات کے سوا کسی اور بات کو اشو بنا کر اس پر تحریک چلانے لگے تو یہ تفرق فی الدین (الشوریٰ ۱۳)

اس "مشترک دین" کے سوا جو چیزیں پیغمبروں کی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف ملتی ہیں وہ اضافی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ حقیقی۔ یعنی وہ دوسرے تقاضوں کے تحت کسی پیغمبر کی زندگی میں شامل ہوتی ہیں نہ کہ اس کے اصلی مشن کے تحت۔

حکومت والے پہلو کے بارہ میں اگر یہ کہا جائے کہ تمام نبیوں کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قائم کرنا تھا۔ البتہ کچھ انبیاء کوشش کے درجہ میں رہ گئے اور کچھ آخری کامیابی کے درجہ تک پہنچے۔ تو یہ بات واقعہ کے مطابق نہ ہوگی۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ کو لیجئے۔ اس انقلابی نظریہ کے دعو یدار یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا مشن مصر میں سیاسی انقلاب برپا کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت وقت کا تختہ الٹ دیں اور ملک کے حکمراں طبقہ کو سرزمین مصر کی فرماں روائی سے بے دخل کر کے ملک کے اقتدار پر قبضہ کریں اور پھر وہاں کے نظام کو بدل کر نئی بنیادوں پر سیاسی و معاشی و تمدنی انقلاب برپا کریں۔ مگر یہ بات سراسر غلط قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ اگر حضرت موسیٰ کا مقصد یہی تھا تو فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی کے بعد مصر میں آپ کے لئے میدان صاف ہو چکا تھا اور وہاں حضرت موسیٰ اپنی "قیادت و فرماں روائی کی غیر معمولی قابلیت" کو کام میں لا کر مطلوبہ سیاسی نظام قائم کر سکتے تھے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ مردہ فرعون کے ملک کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ حضرت ابراہیم کا عراق چھوڑ کر جانا اگر اس لئے تھا کہ وہاں آپ کے لئے مواقع حکومت نہیں تھے تو حضرت موسیٰ کیوں مصر کو چھوڑ کر چلے گئے جہاں آپ کے لئے مکمل طور پر مواقع حکومت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت کے مشن کی یہ تعبیر سراسر بے بنیاد ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن سے کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔

حکمراں کے مقابلہ میں

ایک صاحب نے کہا: آپ کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ حدیث میں آیا ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنا سب سے افضل جہاد ہے (افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر، ابو داؤد، ابن ماجه، ترمذی) میں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر حدیث میں جس چیز کو افضل جہاد بتایا گیا ہے وہ عدل وانصاف کی ایک بات کہنا ہے نہ کہ حکمران کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔ ظالم حکمراں کے سامنے انصاف کی بات کہنا بلاشبہ ایک بہت بڑی بھلائی ہے۔ مگر کسی قائم شدہ مسلم حکومت کو "ظالم" قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی تحریک چلانا سراسر باطل ہے جس کا شریعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ سے لے کر اب تک تمام علماء کا اجماع رہا ہے۔

سعید بن جبیر تابعی کہتے ہیں۔ میں نے عبد اللہ بن عباس رضی سے پوچھا۔ کیا میں بادشاہ کو بھلائی کا حکم دوں اور برائی سے روکوں۔ صحابی نے جواب دیا: اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ بادشاہ تم کو قتل کردے گا تو نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا۔ میں نے تیسری بار پوچھا، انھوں نے پھر یہی جواب دیا اور کہا، اگر تم کو ایسا کرنا ہی ہو اور اس کے سوا چارہ نہ ہو تو تنہائی میں اس کو نصیحت کرو (قال سعيد بن جبير قلت لابن عباس آمر السلطان بالمعروف وانهاه عن المنكر قال ان خفت ان يقتلك فلا۔ ثم عدت فقال لی مثل ذلك۔ ثم عدت فقال لی مثل ذلك، وقال ان كنت لابد فاعلا ففيما بينك وبينه، جامع العلوم والحکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمراں کی برائی کے اعلان کے سلسلے میں ہماری حدود کیا ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس کو قتل وقتال اور ایک دوسرے کو مٹانے کے مرحلہ تک نہ جانے دیا جائے۔ کوئی داعی مسلم حکمراں کو فنا کرنے کا منصوبہ بنائے یا مسلم حکمراں داعیوں کی جماعت کو فنا کرنا چاہے، دونوں حالتوں میں مسلمانوں میں باہمی قتل وخون کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی بھی ایسی تحریک جو لوگوں کو باہمی قتل وخون تک پہنچائے سراسر باطل ہے۔ ہر مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی جان اور مال اور آبرو حرام ہے اور کسی بھی حال میں کسی مسلمان کو اجازت نہیں کہ ان کو اپنے لئے جائز کرے۔ اس لئے مسلم حکمراں کی اصلاح کا کام لازمی طور پر صرف کہنے یا اعلان کرنے کی حد تک محدود رہنا چاہئے۔ اور اس کا بھی زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے تنہائی میں کہا جائے۔ یعنی مصلح اور حکمراں دونوں تنہائی میں بیٹھیں اور مصلح خیر خواہی اور دلسوزی کے انداز میں اس کی برائی پر اس کو نصیحت کرے۔

مذکورہ بزرگ نے اس کے بعد اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دوسری مشہور حدیث کا حوالہ دیا جو مسلم نے

ان الفاظ میں نقل کیا ہے : ابوسعید خدری رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو ہاتھ سے روک دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اس کو برا کہے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے (من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه وان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان) میں نے کہا کہ اس حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ظالم حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرو۔ یہ حدیث تو سادہ طور پر مسلم معاشرہ کے اندر افراد کی عمومی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ مسلم معاشرہ میں ہر مسلمان کو اس طرح رہنا چاہئے کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کو برائی کرتے دیکھے تو اس کو بقدر استطاعت روکے۔ اس کا کسی قسم کی انقلابی سیاست سے کیا تعلق۔

روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ایک آدمی کو کسی آدمی سے شکایت ہو جاتی ہے، جب کسی کا مفاد دوسرے سے ٹکراتا ہے، جب کسی کے لئے کسی کے مقابلہ میں "انا" کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو آدمی اس وقت ظلم اور بے انصافی پر اتر آتا ہے ـــــــ طاقت ور پڑوسی کمزور پڑوسی کی تخریب کے منصوبے بناتا ہے، صاحب مکان اپنے کرایہ دار کو خانہ بدر کرنے کی سازشیں کرتا ہے۔ مالک اپنے ملازم کی معاشیات کو برباد کر دینا چاہتا ہے۔ جائداد والا ایک وارث کو اس کا حق دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ ایک ادارہ اپنے کارکن کو ذلیل کر کے نکال دیتا ہے۔ ایک شخص اپنے دوست اور رشتہ دار کا دشمن بن جاتا ہے۔ ایک لیڈر اپنے اوپر تنقید کرنے والے کو رسوا کر دینا چاہتا ہے۔ ایک کمانے والا اپنے نہ کمانے والے رشتہ دار کو ذلیل کرتا ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور ہر بستی اور ہر محلہ میں اس قسم کے واقعات ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ سماجی برائی ہے جس کے خلاف سرگرم ہونے کی مذکورہ بالا حدیث میں تلقین کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی دیکھے کہ اس کے قریب ایک آدمی برائی کر رہا ہے یا کسی بندۂ خدا کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہا ہے تو اس معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ ہو جائے۔ بلکہ بقدر استطاعت اس میں اپنے کو شریک کرے۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک وہ اپنے بھائی کے خلاف ہونے والی برائی کو ختم ہوتا ہوا نہ دیکھ لے۔

سیاسی تصادم سے بچنے کا مطلب ظلم سے سمجھوتہ نہیں ہے بلکہ اپنی قوتوں کو زیادہ نتیجہ خیز کام میں لگانا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کو خدا پرستی اور انصاف پر قائم کرنا، لوگوں کو موت اور آخرت کے مسئلہ سے ہوشیار کرنا، تعمیری میدان میں اپنے کو مستحکم بنانا، اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، یہ وہ کام ہیں جن کا کرنا ہر حال میں ممکن رہتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ لوگ اپنے عمل کا آغاز یہاں سے کریں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو نہیں ملنے والا ہے اس کو پانے کی کوشش میں وہ بھی ہاتھ سے چلا جائے جو بروقت مل سکتا ہے۔

اصول ، مفاد

موجودہ بائبل اگرچہ محرّف ہو چکی ہے ، تاہم اس میں بہت سے اجزار ایسے ہیں جو نہایت عبرت ناک ہیں ۔ بائبل اپنی موجودہ شکل میں سابق اہل کتاب (یہود) کی تاریخ بھی ہے اور ان کے نبیوں کے فرمودات کا مجموعہ بھی ۔ اس میں بار بار بتایا گیا ہے کہ اگر تم خدا کی شریعت پر چلو اور خدا کے حکموں کو مانو تو تمھیں ہر قسم کی کامیابی حاصل ہوگی ۔ اور اگر تم خدا کے حکموں کو نہ مانو اور اس کے خلاف چلنے لگو تو خدا تم کو حقیر کر کے تم کو تمہارے دشمنوں کے حوالے کر دے گا (مثال کے طور پر، احبار، باب ۲۶)

بعد کے زمانہ میں جب یہود کے اندر بگاڑ آیا تو خدا نے اپنے نبیوں کے ذریعہ مسلسل انھیں انتباہ دیا ۔ اس کی تفصیلات بائبل کے کئی ابواب میں پھیلی ہوئی ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، یرمیاہ کی کتاب) اس سلسلہ میں چیتاونی دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ مردود چاندی کہلائیں گے ۔ کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے (یرمیاہ، ۶ : ۳۰) :

یہود کے بارے میں یہ بات بحیثیت نسل نہیں کہی گئی ہے بلکہ بحیثیت اہل کتاب کہی گئی ہے ۔ یہ ان قوموں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جن کو الہامی کتاب بھیجی جائے ، جن کے درمیان پیغمبر خدا کی ہدایت لے کر آئیں ۔ ایسی قوم جب خدا کی بتائی ہوئی روش سے ہٹ جائے تو خدا بھی اسے رد کر دیتا ہے ۔ وہ لوگوں کے درمیان ایسے ہو جاتے ہیں جیسے مردود چاندی یا ایسا سکہ جس کو بینک نے رد کر دیا ہو ۔

اس سلسلہ میں بائبل میں (نیز قرآن و حدیث میں) جو بیانات ہیں ، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے دو طریقے ہیں ۔ ایک ہے ، خدا کی پسند پر جینا ۔ اور دوسرا ہے ، اپنی پسند پر جینا ۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہے ، اصولِ حق کے لیے جینا ، اور دوسرا ہے ، ذاتی مفاد کے لیے جینا ۔

جب لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کی تمام سوچ اور ان کے تمام جذبات خدا کی طرف متوجہ ہوں، وہ خدائی ہدایات کو اولیت دیتے ہوں۔ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں ربانی مقاصد کو اونچا رکھیں، تو ایسے لوگ خدا کی نظر میں محبوب اور معزز ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ بندوں کی نظر میں بھی محبوب اور معزز قرار پاتے ہیں۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ خدا کو بھولے ہوئے ہوں، وہ خودساختہ شریعت پر چلیں۔ ان کے ذاتی مفادات ہی ان کی زندگی کا مرکز و محور بن جائیں، تو خدا ایسے لوگوں کی طرف سے اپنی نظریں ہٹا لیتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قوم لوگوں کے درمیان حقیر اور مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے۔

عروج و زوال کا یہی قانون سابق اہل کتاب (یہود) کے لیے تھا۔ اور عروج و زوال کا یہی اٹل قانون موجودہ اہل کتاب (مسلمانوں) کے لیے بھی ہے۔ یہود کی قیمت اللہ کی نظر میں ان کے عمل کے اعتبار سے تھی، اسی طرح مسلمانوں کی قیمت بھی اللہ کی نظر میں ان کے حقیقی عمل کے اعتبار سے قرار پائے گی نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔

اگر مسلمانوں کا حال یہ ہو جائے کہ ان کے رہنما ذاتی عزت و شہرت (self-glory) کے لیے کام کریں۔ ان کے دولت مند اپنی دولت کو صرف ذاتی حوصلوں کی تکمیل میں لگائیں۔ ان کا دانشور طبقہ اپنی زبان و قلم کو بازار کا سودا بنالے۔ ان کے خواص ان چیزوں کی طرف دوڑیں جن میں اخباری اہمیت (news value) ہوتی ہے۔ ان کے عوام خودساختہ رسموں کو اپنالیں، ان کی اخلاقی حس اتنی کند ہو جائے کہ کوئی شخص عدل کو عدل اور ظلم کو ظلم کہنے والا باقی نہ رہے۔ جب ایسا ہو جائے تو مسلمانوں کے حق میں بھی اسی قانون خداوندی کے نفاذ کا انتظار کرنا چاہیے جو سابق اہل کتاب (یہود) پر نافذ ہوا۔ موجودہ گروہ بھی اسی طرح رد کر دیا جائے جس طرح پچھلا گروہ رد کیا گیا۔

خدا کے یہاں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ خدائی قانون کے نفاذ میں کسی گروہ کا کوئی استثناء نہیں۔ وہ دوسرے گروہ کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرے گا جو اس نے پہلے گروہ کے ساتھ کیا۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو خوش فہمی ہو تو اس کو قرآن کی

یہ آیت پڑھنی چاہیے :

لیس بامانیکم ولا امانیّ اھل الکتاب من یعمل سوءاً یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیاً ولا نصیرا

(النساء ۱۲۳)

نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب (یہود) کی آرزوؤں پر ہے۔ جو شخص بھی برا عمل کرے گا اس کو ضرور اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حامی اور مددگار نہ پائے گا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے جو نوٹ لکھا ہے وہ نہایت بامعنی ہے۔ اس نوٹ کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"کتاب والوں، یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں۔ جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے گی، ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر حمایت کرکے ہم کو بچالیں گے۔ اور نادان اہلِ اسلام بھی اپنے حق میں یہی خیال کرلیا کرتے ہیں۔ سو فرمادیا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پر موقوف اور منحصر نہیں۔ جو برا کرے گا، پکڑا جائے گا۔ کوئی ہو، اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی۔ اللہ جس کو پکڑے، وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ اور جو کوئی عمل نیک کرے گا، بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو، سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے۔ اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب وعقاب کا تعلق اعمال سے ہے، کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ سو ان امیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں میں ہمت کرو۔"
(صفحہ ۱۲۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اس کا برتر ادب، اس کے بلند مضامین، اس کی ابدی تعلیمات، اس کا اختلاف و تضاد سے خالی ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ خدائی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ قرآن میں ہدایت کا سامان ہے۔ وہ انسان کی اس تلاش کا جواب ہے کہ وہ زندگی کی معنویت کو سمجھ سکے۔ اس کی فطرت جس رہنمائی کو مانگ رہی ہے، قرآن میں وہ اس کو واضح اور مکمل صورت میں پالیتا ہے۔ قرآن اس کے تمام اندرونی سوالات کا جواب ہے۔ مگر یہ ہدایت کسی کو اپنے آپ نہیں مل جاتی۔ اس کو وہی شخص پاتا ہے جس کے اندر حقیقی طلب کا مادہ ہو۔ جو یہ غیر علمی اصرار نہ کرے کہ وہ آنکھ سے دیکھ کر ہی کسی بات کو مانے گا۔ بلکہ وہ بصیرت سے سمجھ میں آنے والی باتوں پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو۔ جو حقیقتِ اعلیٰ (خدا) کے آگے جھک کر اس بات کا ثبوت دے کہ وہ مصنوعی خودپرستی سے پاک ہے۔ جو اپنی کمائی میں دوسرے کا حصہ لگا کر یہ ظاہر کرے کہ اپنی ذات سے باہر پائے جانے والے تقاضوں کو ماننے کے لئے اس کا سینہ کھلا ہوا ہے۔ جو انسانی محدودیت کا اقرار کرتے ہوئے خارجی ہدایت کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہو۔ جو اس سوال کو اہمیت دے کہ موجودہ دنیا کا نامکمل ہونا ایک زیادہ مکمل نظام عالم کی تشکیل کا تقاضا کرتا ہے ــــ یہ طلبِ صادق کی علامتیں ہیں۔ ایسے ہی طالبین کے حصہ میں ہدایت آتی ہے اور وہی اس کائنات میں فلاح کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں (بقرہ ۱-۵)

اسلامی زندگی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ ایک شخص کو جب اس بات کی پہچان ہو جائے کہ اس کائنات کا خالق، مالک اور رب اللہ ہے۔ وہ اُس کو اِس طرح اپنے شعور کا حصہ بنا لے کہ اللہ ہی اس کا سب کچھ بن جائے وہ اسی پر بھروسہ کرے۔ اسی سے امید رکھے۔ اسی سے خوف کھائے۔ اپنی زندگی کو ہمہ تن اسی کے رخ پر ڈال دینے کا فیصلہ کرے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے بعد چار عبادتوں کو اسلام میں ارکان کا درجہ حاصل ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ یہ چاروں عبادتیں اسلام کے ارکان بھی ہیں اور اسلام کے مطلوب اوصاف کی علامات بھی۔ نماز اللہ کی قربت تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ روزہ صبر کی تربیت ہے۔ زکوٰۃ یہ پیغام دیتی ہے کہ بندوں کے عملی خیرخواہ بن کر رہو۔ حج اسلامی اتحاد کا عالمی سبق ہے۔ یہی چار چیزیں اسلام کا خلاصہ ہیں۔ بندۂ مومن سے اولاً یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے رب کی یاد میں ڈوبا رہے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کے تصور سے خالی نہ ہو۔ پھر جس دنیا میں آدمی کو دیندار بن کر رہنا ہے، وہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں۔ ان کی طرف سے بار بار تکلیف کی باتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اگر آدمی اپنے سوا دوسروں کے اعتراف کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ اگر وہ دوسروں کو برداشت کرتے ہوئے دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کے لئے تیار نہ ہو تو موجودہ دنیا میں وہ حق کے سفر کو کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔

یہ ایمان اور عبادت اگر حقیقی طور پر آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے اندر وہ خدا پرستانہ زندگی ابھرتی ہے جو مالک کائنات کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ دنیا میں اس کی ہستی کا ظہور حق اور عدل کا ظہور بن جاتا ہے۔

اللہ کا نام لے کر حق کے سوا نہ کہو

حضرت موسیٰ علیہ السلام ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں آئے۔ اس وقت بنی اسرائیل (یہود) مصر میں آباد تھے۔ مصر کی مشرک قوموں کے ساتھ رہتے رہتے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ طریقے سرایت کر گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جاؤ اور وہاں آزادانہ ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کرو۔ قرآن کی ساتویں سورہ (اعراف) میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے اور اس سے کہا کہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی پیغمبری کے ثبوت میں کچھ معجزے دکھائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ معجزات دیکھنے کے بعد فرعون کے درباری مبہوت ہو گئے۔ انھوں نے کہا: یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے (اعراف ۱۱۰)

اس آیت پر حاشیہ لکھتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک انقلابی مفسر اپنی تفسیر کی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا تو محض اس کے اس فعل سے اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمراں طبقہ سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا۔ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ یہ شخص پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتا ہے جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لئے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لئے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا"

تبصرہ

سورۂ اعراف (آیت ۱۰۳ تا ۱۴۳) کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ پوری تفسیر مصنف کا اپنا ذہنی تخیل ہے۔ قرآن کی متعلقہ آیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۔ اس انقلابی تفسیر کی بنیاد تمام تر صرف فرعون کے درباریوں کے اس مختصر جملہ پر ہے کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں (۱۱۰) سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت خود حضرت موسیٰ کی تقریر سے معلوم ہوگی یا آنجناب کے مخالفین کی باتوں سے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ موسیٰ کی نشانیوں پر ظلم کرتے رہے (۱۰۳) ظلم کے معنی ہوتے ہیں وضع الشئ فی غیر محلہ۔ یعنی انھوں نے حضرت موسیٰ کی باتوں کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر بیان کیا اور ان کو خود ساختہ معنی پہنائے۔

۲۔ فرعون کے دربار میں جس طرح حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں اسی طرح انھوں نے یہ بھی کہا کہ موسیٰ جادوگر ہیں (۱۰۹) وہ زمین میں فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں (۱۲۷) مصری قوم پر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے آرہی ہیں (۱۳۱) تو کیا یہ سب باتیں بھی محض فرعون اور اس کے درباریوں کے کہنے کی وجہ سے درست مان لی جائیں گی۔

۳۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے جو مطالبہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس کی طرف سے اپنی پیغمبری کی نشانیاں لے کر آیا ہوں لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے (۱۰۵) قرآن کی اس واضح نص کے مطابق حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ ملک مصر سے باہر چلے جانا چاہتے تھے۔ پھر جب وہ خود ہی فرعون کے ملک سے نکل رہے تھے تو فرعون کو اس کے ملک سے نکالنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوگیا۔

۴۔ فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں (ان یخرجکم من ارضکم۔ ۱۱۰) اس کے بعد جب جادوگر تائب ہو کر حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تو فرعون جادوگروں کے بارے میں بھی یہی الفاظ کہتا ہے کہ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس شہر میں کی تاکہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو (لتخرجوا منھا اھلھا ۱۲۳) اب کیا اس تفسیر کے حامی یہ دعویٰ کریں گے کہ جادوگروں سے مقابلہ پیش آنے سے پہلے حضرت موسیٰ اور جادوگروں نے مل کر یہ خفیہ منصوبہ بنایا تھا کہ "مصر کے دارالسلطنت میں اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا جائے"

۵۔ قرآن کی اگلی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے مذکورہ بات محض شرارت میں کہی تھی۔ وہ آپ کی دعوت کو سیاسی معنی پہنا کر اپنے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ہر حکمراں اپنے مخالفین کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چنانچہ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے جب آفتوں میں ڈالا تو اس وقت وہ اپنا شرارت کا کلمہ بھول گئے اور کہہ اٹھے: اے موسیٰ اپنے رب سے دعا کرو۔ اگر وہ ہم پر سے یہ بلائیں ٹال دے تو ہم تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ مصر کے باہر بھیج دیں گے (لنومنن لک و لنرسلن معک بنی اسرائیل ۱۳۴)

سورہ اعراف کی مذکورہ آیات میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہی جائے (۱۰۵) مگر عجیب بات ہے کہ انھیں آیتوں کو اللہ کا نام لے کر حق کے سوا بات کہنے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

عملِ باطل

شریعت میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں " اکل اموال الناس بالباطل " کہا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں قرآن میں چار واضح آیتیں آئی ہیں۔ سورہ نسار (آیت ۲۹) میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ اِلّایہ کہ کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے کی جائے۔ سورہ نسار (آیت ۱۶۱) میں ارشاد ہوا ہے کہ یہود کو اس لیے سخت سزا میں مبتلا کیا گیا کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے۔ سورہ توبہ (آیت ۳۴) میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، یہودیوں کے اکثر علمار اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق طور پر کھاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے سخت عذاب ہے۔ (اس لیے تم ایسا مت کرنا)

اسی عمل باطل کی ایک صورت وہ ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ (آیت ۱۸۸) میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۔ سورہ بقرہ کی اس آیت کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ اور ان کے جھوٹے مقدمہ کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ یعنی ظلم کے کھا جاؤ۔ اور تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو۔

اقوالِ مفسرین

اس آیت کی نہایت واضح تشریح حدیث اور آثار میں موجود ہے۔ تفسیروں میں اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ مفسر ابن کثیر نے اس آیت کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا پورا ترجمہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

علی بن ابی طلحہ نے کہا اور عبداللہ بن عباس نے بھی کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں ہے جس کے پاس کسی کا مال ہو اور اس مال کو لینے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو پھر بھی وہ

مال کی ادائیگی سے انکار کرے۔ اور وہ حاکموں کی طرف مقدمہ لے جائے حالاں کہ وہ جانتا ہو کہ حق اس کے خلاف ہے اور وہ جانتا ہو کہ وہ گنہ گار ہے اور وہ حرام کو کھانے والا ہے۔ اور ایسا ہی قول مروی ہے مجاہد سے اور سعید بن جبیر سے اور عکرمہ سے اور حسن سے اور قتادہ سے اور سُدی سے اور مُقاتل بن حیان سے اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم سے، انھوں نے کہا کہ تم کسی سے جھگڑا نہ کرو جب کہ تم جانتے ہو کہ تم ظالم ہو۔ اور صحیحین میں ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سنو، بے شک میں ایک انسان ہوں اور میرے پاس جھگڑا آتا ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ زبان آور ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو میں جس شخص کو کسی مسلمان کا حق دے دوں تو بے شک وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، تو وہ چاہے اس کو لے جائے یا وہ اس کو چھوڑ دے۔

اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم کا فیصلہ کسی چیز کو حقیقت میں نہیں بدلتا۔ وہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ جب کہ وہ حقیقۃً حرام ہو اور وہ کسی حلال کو حرام نہیں کر سکتا جب کہ وہ حقیقۃً حلال ہو۔ اور قاضی ظاہر کا پابند ہوتا ہے۔ اگر اس کا فیصلہ حقیقت کے مطابق ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ حاکم کے لیے اس کا اجر ہے اور حیلہ ساز کے اوپر اس کا بوجھ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام تک نہ لے جاؤ تاکہ تم لوگوں کے مال کا ایک حصہ بہ طریق گناہ کھاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو) یعنی تم اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کو جانتے ہو مگر اپنے کلام میں اس کو گڈمڈ کرتے ہو۔

قتادہ نے کہا اے انسان جان لے کہ قاضی کا فیصلہ تمہارے لیے کسی حرام کو حلال نہیں کرتا۔ اور تم کو باطل کا حقدار نہیں بناتا۔ اور قاضی تو اس پر فیصلہ کرتا ہے جو اس نے دیکھا اور جو اس کے سامنے گواہی دی گئی۔ قاضی ایک انسان ہے، وہ صحیح بھی ہوتا ہے اور غلطی بھی کرتا ہے اور جان لو کہ جس شخص کے حق میں باطل کا فیصلہ کیا جائے اس کا مقدمہ ختم نہ ہو گا یہاں تک کہ اللہ دونوں فریقوں کو قیامت میں جمع کرے۔ پھر اللہ حق دار کے لیے بے حق والے کے اوپر اس سے بہتر فیصلہ کرے گا جو فیصلہ قاضی نے حق دار کے خلاف بے حق والے کے لیے دنیا میں کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۵)

تشریح

مذکورہ آیت میں لاتأکلوا (نہ کھاؤ) کا لفظ ہے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اُکل یہاں لفظی معنی میں نہیں ہے۔ یعنی اس سے مراد صرف کھانا نہیں، بلکہ یہ ایک تعبیر ہے اور اس سے مراد کسی بھی چیز کو اپنے قبضہ اور تصرف میں لے آنا ہے (عبّر بہ الاخذ والاستیلاء، البحر المحیط) اسی طرح باطل کی تشریح صاحبِ روح المعانی نے ان الفاظ میں کی ہے: والمراد بالباطل الحرام وکل مالم یأذن باخذہ الشرع۔ (باطل کا مطلب حرام ہے اور ہر وہ چیز جس کے لینے کی اجازت شریعت نے نہ دی ہو)

انسان کو جو چیز جائز طور پر نہ ملے اس کو وہ ناجائز طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی ذہنیت کو غلط اور حرام قرار دیا گیا ہے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ جو مال شرعی طور پر اس کا حق نہ ہو اس کو وہ غیر شرعی کارروائیوں کے ذریعہ اپنے قبضہ میں لینا چاہتا ہے۔ جو چیز اس کو انصاف کے ذریعہ نہ ملے اس کو وہ دھاندلی کے ذریعہ حاصل کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔ جس چیز کے متعلق اس کو اندیشہ ہو کہ وہ سچ بول کر اس کو نہیں پائے گا اس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ جھوٹ بول کر اس کا مالک بن جائے۔

انسان کا یہ مزاج اس کی زندگی کے ہر معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس عہدہ پر وہ پرامن طور پر قابض نہ ہو سکا اس پر وہ تخریب کاری کے ذریعہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جو چیز شرافت کا طریقہ اختیار کر کے نہ ملے اس کو وہ کیننگی کا طریقہ اختیار کر کے حاصل کرتا ہے۔ جہاں حقیقی اشو پر قیادت نہ مل رہی ہو وہاں وہ جھوٹے اشو کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح قوم کے اوپر قائد بن جائے۔ جو چیز روایات کے دائرہ میں ملتی ہوئی نظر نہ آئے اس کو وہ روایات کو توڑ کر حاصل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے خواہ اس کے نتیجہ میں ساری انسانی زندگی فساد کی شکار ہو کر رہ جائے۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے اور جو شخص اللہ کی پکڑ سے بچنا چاہتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے۔ وہ وہی لے جو شریعت کے مطابق اس کا حق ہے اور وہ نہ لے جو شریعت کے اس کا حق نہیں۔

ایک تجربہ

میری والدہ (زیب النساء) کا انتقال ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو ہوا۔ ان کے انتقال پر دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ کی رات کو ساڑھے دس بجے میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک پاس کے کمرے سے والدہ کی آواز آنے لگی۔ آواز ہو بہو والدہ مرحومہ کی تھی۔ میں حیران ہو کر اٹھا اور کمرہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں والدہ مرحومہ کا ٹیپ بجایا جا رہا ہے۔ میرے بچوں نے ایک سال پہلے والدہ مرحومہ کی ۴۵ منٹ کی ایک گفتگو ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کر لی تھی۔ اس میں والدہ میرے بچوں کے ساتھ بات کرتی ہوئی اور ہنستی بولتی ہوئی سنائی دے رہی ہیں۔

میں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر والدہ کا ٹیپ سننے لگا۔ میں سنتا جا رہا تھا اور میرے اوپر عجیب حالت طاری ہو رہی تھی۔ جس شخصیت کو میں ۸ اکتوبر کو خود اپنے ہاتھ سے قبر میں دفن کر چکا تھا، عین اسی شخصیت کی آواز ۲۵ اکتوبر کو بجنسہ اسی شکل میں سُن رہا تھا۔ وہی لہجہ، وہی زبان، وہی انداز، غرض سب کچھ اس قدر مطابق اصل تھا جیسے کہ مرحومہ کمرہ میں بیٹھی ہوئی ہیں اور میں پہلے کی طرح ان کی اپنی آواز کو سُن رہا ہوں جیسا کہ ان کی زندگی میں سنتا تھا۔

اس تجربہ نے ایک آیت کا مطلب میرے ذہن پر کھول دیا۔ سورہ الذاریات میں ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو بعث بعد الموت کے بارہ میں شبہ ظاہر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ بے شک وہ یقینی ہے، اسی طرح جس طرح تم بولتے ہو۔ یہاں آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا اَنَّکُمْ تَنْطِقُونَ (الذاریات ۲۲-۲۳)

اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، بے شک وہ برحق ہے اسی طرح جیسے کہ تم بولتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین بس اتنا کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ وہ تمہارے نطق کی طرح برحق اور یقینی ہے (ای حق مثل نطقکم، تفسیر النسفی) میں نے اکثر تفسیروں میں اس آیت کا مطلب تلاش کیا مگر اس کی تشریح میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ مل سکا۔ مگر ۲۵ اکتوبر کی رات کو والدہ مرحومہ

کا ٹیپ سننا میرے لیے اس آیت کی تفسیر بن گیا۔ سچ ہے کہ قرآن کے عجائب اور معانی کبھی ختم نہ ہوں گے (لا تنقضی عجائبہ)

والدہ مرحومہ کا ٹیپ نطق کی شکل میں گویا ان کی زندگی کا اعادہ تھا۔ اس کو سنتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں زندگی بعد موت کے امکان کا عملی تجربہ کر رہا ہوں۔ جیسے ایک شخصیت کے وفات پانے کے بعد میرے سامنے اس کو دہرایا جا رہا ہو۔ جیسے ایک زندگی پر موت واقع ہونے کے بعد اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو Replay کیا جا رہا ہو۔

نطق (بولنا) انسانی شخصیت کا سب سے زیادہ نمائندہ وصف ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ انسان کی موت کے بعد اس کے نطق کا اس طرح کامل طور پر محفوظ رہنا اور اس کا نہایت صحیح اعادہ ممکن ہونا بتاتا ہے کہ موت کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے یا کم از کم اس کو دہرایا جا سکتا ہے میری والدہ مرحوم ہو چکی تھیں مگر وہ اپنی آواز کے روپ میں بدستور پوری طرح زندہ تھیں۔

جب میں والدہ مرحومہ کی ٹیپ کی ہوئی آواز سن رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مرحومہ دوبارہ اٹھ کر پہلے کی طرح بولنے لگی ہوں۔ اگر میں آنکھ بند کر کے سنوں تو مجھے کچھ بھی فرق معلوم نہ ہوگا۔ میرے لیے یہ ٹیپ بعث بعد الموت کا ایک مشینی نمونہ بن گیا —— یہ واقعہ جو آج مشینی طور پر ہو رہا ہے۔ یہی کل حقیقی طور پر ہوگا۔ آواز کا یہ واقعہ آخرت کے واقعہ کا ابتدائی مظاہرہ ہے۔ انسانی ٹیپ خدائی ٹیپ کی پیشگی اطلاع ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور تمہاری وہ حیاتِ ثانی بھی جس کی تم کو خبر دی جا رہی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد کے بعد یہ بات محض خبر نہیں رہی بلکہ ایک معلوم واقعہ بن چکی ہے۔ انسانی ساخت کا ٹیپ ریکارڈر چھوٹی سطح پر اسی حقیقت کا مظاہرہ کر رہا ہے جو زیادہ بڑی سطح پر کائنات میں موجود ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ خدا کی کائنات ایک عظیم ریکارڈر ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی مشین کسی انسان کے صرف جزئی پہلو کو ریکارڈ کر پاتی ہے۔ کائناتی ریکارڈر انسان کی پوری زندگی کو انتہائی کامل شکل میں ریکارڈ کر رہا ہے۔ اور جب قیامت برپا ہوگی تو کائنات خدا کے حکم سے ہر انسان کا اسی طرح اعادہ کر دے گی جس طرح آج ٹیپ ریکارڈر انسان کی آواز کا اعادہ کر رہا ہے۔

نجات

قرآن جس زمانہ میں آیا، ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا۔ کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو۔ مگر ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ایک مقدس جگہ پر جمع ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجانے کا نام عبادت تھا (انفال۔ ۳۵) کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ عبادت خانوں کی عمارتیں بنا کر اور لوگوں کو کھانا کھلا کر اپنے خدا کو خوش کر لیں گے (توبہ۔ ۱۹) کچھ لوگ خدا پرستی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہنگاموں سے الگ ہو کر اپنے لئے تنہائی کا ایک گوشہ بنا لیا جائے اور وہاں بیٹھ کر خدا کے نام کی جپ کی جاتی رہے (حدید۔ ۲۷) کچھ اور لوگ تھے جو خدا پرستی کا کمال یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جن افکار و نظریات کا رواج ہو جائے، اسی کے رنگ میں رنگ کر مذہب کو بھی پیش کر دیا جائے (توبہ۔ ۳۰)

قرآن نے اعلان کیا کہ ان میں سے کوئی بھی چیز وہ نہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو، اور جس کے کرنے والے کو وہ آخرت کے انعامات سے سرفراز کرے۔ اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اس کے بندے اپنے خالق کو "کبیر" مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنا لیں۔

یہ اصلا ایک قلبی کیفیت ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف، دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو اصلا خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کے دل میں جو کیفیت ہو، وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی عملی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ہم کو اپنے بیٹے سے پیار ہو تو ہمارے عمل سے بھی اس پیار کا اظہار ہوگا۔ اگر ہم سانپ سے ڈر رہے ہوں تو ہماری حرکات بھی ضرور اس جذبہ کی گواہی دیں گی۔ اسی طرح خدا کے آگے اپنے آپ کو "صغیر" بنانا اگرچہ باعتبار حقیقت ایک قلبی کیفیت ہے، مگر جب وہ کسی دل کے اندر حقیقی معنوں میں پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کے حرکات و اعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح پوری زندگی اس کے دائرہ میں آجاتی ہے۔

حقیقی خدا پرستی، جو آدمی کے لئے آخرت کی نجات کا ذریعہ ہوگی، یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب و مجازی تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی معاملہ میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ پھر دل و دماغ میں اسی کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کا اندرونی وجود اس کی احسان مندی کے جذبہ سے سرشار ہو اور اسی کی طاقت و قوت کے خوف سے کانپتا رہے۔ پھر اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی آنکھ، اس کی زبان، اور اس کے سارے اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں جو خدا نے اپنی شریعت میں ان کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ پھر دوسرے انسانوں سے تعلقات اور دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اسی رویہ کو اپنائے جو خدا نے بتایا ہے۔ اور اس رویہ سے پوری طرح بچتا رہے جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے اپنی پوری زندگی لگا دے۔ اسی طرح آخرت کی نجات کا حق دار بھی وہی ہوگا جس نے اپنی زندگی کو اس کے لئے کھپایا ہو۔

امتحان غیر معمولی حالات میں

قرآن میں کہا گیا ہے: کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ جانچے نہ جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو پہلے تھے۔ پس ضرور ہے کہ اللہ جان لے کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں (عنکبوت) اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا مومن ہونا یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کو مومن کہے یا اپنے کو مومن سمجھے۔ مومن حقیقۃً وہ ہے جس کے مومن ہونے کی تصدیق خدا کے یہاں ہو جائے۔ کسی کے ایمان کو اگر خدا جھوٹا ایمان کہہ دے تو اس کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں خواہ دنیا میں وہ مومن اعظم کے نام سے پکارا جاتا ہو۔

کسی کے ایمان کے بارے میں خدا کا فیصلہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے جس طرح دنیا کی زندگی میں کسی ساتھی یا رشتہ دار کے تعلق کا صحیح پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ کسی قسم کے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں۔ عام حالات میں کسی ساتھی یا رشتہ دار کی جانچ نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ آخرت کا ہے۔ آخرت کی دنیا میں جن لوگوں کو اس قابل سمجھا جائے گا کہ ان کو اللہ کا پسندیدہ بندہ قرار دیا جائے اور ان کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں وہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے غیر معمولی حالات میں اپنی خدا پرستی اور تقویٰ کا ثبوت دیا ہوگا۔ یہ غیر معمولی حالات کیا ہیں، اس سلسلہ میں یہاں چند صورتیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ ایک صورت وہ ہے جو داعی حق کے اعتراف کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی حق کی دعوت اٹھتی ہے، پردہ داری کی سنت کے تحت اٹھتی ہے۔ یعنی حق کی آواز بلند کرنے کے لئے اللہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتا ہے جو دیکھنے میں لوگوں کو محض ایک "آدمی" معلوم ہوتا ہو۔ خدا کا داعی ہمیشہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جس کی زندگی میں دو چیزیں اپنی انتہائی صورت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ دلائل کا زور اس کے یہاں کامل صورت میں موجود ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مادی زور کے اعتبار سے اس کو بالکل ناقابل لحاظ بنا دیا جاتا ہے۔ اس طرح مدعو گروہ کو اس امتحان میں ڈالا جاتا ہے کہ اہمیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ دلائل کے وزن کو پا سکے۔ وہ داعی کی "ظاہری حیثیت" سے گزر کر اس کو اس کی "چھپی ہوئی حیثیت" میں دیکھے۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہوتی ہے اور جو اس غیر معمولی صورت حال میں حق کو پہچان لے وہی خدا کے یہاں ماننے والا اور تسلیم کرنے والا قرار پائے گا۔ ایک طرف وہ پکارنے والے ہیں جن کے گرد دبیش دنیا کی رونقیں جمع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف وہ خدا کا بندہ ہے جو ظاہری رونقوں سے خالی ہو کر خالص حق کے لئے آواز دیتا ہے۔ جو لوگ پہلی قسم کی آوازوں پر دوڑیں وہ گویا ظاہری رونقوں پر دوڑے۔ اور جنھوں نے دوسری آواز کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی پکار پر لبیک کہا۔

۲۔ دنیوی تعلقات میں ہم کو دو طرح کے آدمیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک وہ شخص جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ دوسرا وہ شخص جس سے کسی نہ کسی سبب سے ہم کو شکایت ہو جاتی ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ لوگوں

کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہم انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کریں، بے انصافی اور بد خواہی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ مگر اس معاملہ میں اللہ ہم کو جہاں جانچ رہا ہے وہ حقیقۃً وہ لوگ نہیں ہیں جن سے ہم کو شکایت کا موقع پیش نہیں آیا۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف کسی وجہ سے ہمارے اندر شکایت اور تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ جب ہم شکایت اور ان بن کے باوجود کسی کے ساتھ معاملہ کرنے میں انصاف سے نہ ہٹیں اس وقت ہم اللہ کے یہاں انصاف کرنے والے قرار پاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو آدمی ان بن پیدا ہونے والے شخص کے ساتھ انصاف نہ کرے وہ اسی مقام پر ناکام ہو گیا جہاں خدا اس کی خدا پرستی کا امتحان لے رہا تھا۔

اسی طرح دنیا کی زندگی میں ہمیں دو طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک وہ جو کمزور اور ناقابلِ ذکر ہوں، اور دوسرے وہ جو طاقت ور ہوں یا کسی وجہ سے وہ قابل ذکر بن جائیں، پہلی قسم کا ایک آدمی جب ہمارے سامنے آتا ہے اور ہم سے مدد چاہتا ہے تو اس کے پاس اپنی مدد کی طرف مائل کرنے کے لئے کوئی اضافی کشش نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس کی مدد نہ کریں تو ہم کو نہ کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور نہ بدنامی کا۔ اس کے برعکس طاقت ور کا ساتھ دینے میں بہت سے پہلوؤں سے امید ہوتی ہے کہ اس کا ساتھ بالآخر خود ہمارے لئے مفید بنے گا۔ اسی طرح مثلاً کوئی قومی مصیبت کا معاملہ پیش آجائے تو وہاں یہ کشش موجود ہوتی ہے کہ اس میں شرکت کرنے سے ہماری عزت و شہرت میں اضافہ ہوگا، ہماری قیادت زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔ مگر خدا ہماری انسانیت یا مسلم دوستی کو جہاں جانچ رہا ہے وہ حقیقۃً وہ مواقع نہیں ہیں جہاں طاقت اور عزت کی ترغیبات موجود ہوتی ہیں۔ بلکہ خدا کے جانچنے کے مواقع وہ ہیں جہاں ایک کمزور اور ناقابل لحاظ آدمی آپ کے سامنے کھڑا ہو اور اس کی مدد کرنے کے لئے اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور محرک موجود نہ ہو۔ اگر آپ طاقت اور شہرت کے مواقع پر تعاون کرنے میں پرجوش ہوں اور ایک کمزور اور معمولی آدمی کا ساتھ دینے میں آپ کو دلچسپی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کے امتحان میں پورے نہیں اترے۔

۴۔ اللہ کے لئے عمل کرنے کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنی زندگی میں کوئی خلل پیدا کئے بغیر دین دار بنا ہوا ہو۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ اپنی بنی بنائی زندگی کو اجاڑ کر دین دار بنتا ہو اور جان و مال کو قربان کر کے اللہ کی طرف بڑھنا پڑے۔ اللہ کے مقبول بندوں میں شامل ہونے کے لئے پہلی قسم کی دین داری کافی نہیں۔ اللہ کے یہاں صرف اس کا ایمان و اسلام مقبول ہوتا ہے جو فائدوں اور مصلحتوں کے گھروندے کو توڑ کر اللہ والا بنے۔ اللہ کا دین جب اس سے اس کے جان اور اس کے مال کا تقاضا کرے تو وہ جان و مال کو دے کر اللہ کی طرف بڑھے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر اللہ کے دین کو اپنی زندگی کا دین بنالے۔ اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ وہ بغیر قربانی والے دین کا اہتمام کرے اور قربانی والے دین سے اپنے کو بچا کر رکھے تو ایسے شخص کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ قربانی والے دین سے اپنے کو دور رکھنا گویا اپنے آپ کو اس امتحان ہال میں داخل نہ کرنا ہے جہاں لوگوں کی لیاقتوں کو جانچا جا رہا ہے اور جہاں کی جانچ کے مطابق ہی کسی کے مستقبل کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم نہیں ہو سکتی

وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینہما لٰعبین ما خلقنٰہما الا بالحق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون۔ ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین یوم لا یغنی مولیً عن مولیً شیئا ولا ھم ینصرون الا من رحم اللہ انہ ھو العزیز الرحیم

(دخان ۴۲ - ۳۸)

اور ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے کھیل کے لئے نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے حق کے ساتھ بنایا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ فیصلہ کا دن سب کا مقرر ہے جس دن کوئی دوست کام نہ آئے گا اور نہ ان کو کچھ مدد پہنچے گی۔ ہاں جس پر اللہ رحم کرے۔ اللہ زبردست ہے اور مہربان

یہی بات قرآن میں دوسرے مقام پر ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ زمین و آسمان کو ہم نے باطل اور عبث نہیں بنایا (مومنون، ص) ایک عام آدمی جب دنیا کے منظر کو دیکھتا ہے تو اس کو عجیب نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سچے اپنی سچائی کا انعام نہیں پاتے اور بروں کو ان کی برائی کی سزا نہیں ملتی۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں کہیں پتھر عظمت پائے ہوئے ہیں اور انسان ذلیل ہو رہا ہے۔ کہیں شریر لوگوں کو اونچا درجہ مل رہا ہے اور نیک لوگ روندے جا رہے ہیں۔ کوئی مفاد اور مصلحت پر چل کر کامیابیاں سمیٹ رہا ہے اور کوئی اصولوں کی خاطر اپنی زندگی کو تباہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کو نعروں اور تقریروں پر لیڈریاں مل رہی ہیں اور کسی کو اپنے آپ کو مٹا دینے کے بعد بھی کوئی کریڈٹ نہیں ملتا۔ کہیں انسانوں کو آپس میں لڑانے والے مصلح کا خطاب پا رہے ہیں اور کہیں لڑائی سے بچنے کی کوشش کرنے والوں کو سزا مل رہی ہے۔ کہیں ایک شخص کھلی غلطی کر کے بھی الفاظ کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ پا لیتا ہے جس سے وہ اپنے کو حق بجانب ثابت کر سکے اور کہیں غلطی کر کے آدمی پر ایسی چپ لگتی ہے گویا اس کے پاس بولنے کے لئے الفاظ ہی نہیں۔ کہیں خدا کے نام پر کسی کو شاندار کاروبار مل رہا ہے اور کہیں خدا کا نام لینا آدمی کے لئے اپنے کو مٹانے کے ہم معنی بن رہا ہے۔ کوئی شخص ہے جو ایک انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے اوپر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور کوئی ہے جو دوسرے پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ کہیں ایک شخص حق پسندی کی خاطر اپنے آپ کو دوسرے کے مسئلہ میں الجھا دیتا ہے اور کہیں آدمی حق کی پامالی دیکھتا ہے اور یہ سوچ کر چپ رہ جاتا ہے کہ جب میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے تو میں دوسرے کے مسئلہ میں اپنے کو کیوں پھنساؤں۔ کہیں سچائی ظاہر ہونے کے بعد بھی آدمی اپنی عزت کو بچانے کے لئے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور کہیں ایک آدمی اپنی عزت کے سوال کو بھول کر اس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ کہیں ایک آدمی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پورے ملک اور قوم کی قسمت کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور کہیں آدمی اپنی قوم کو بچانے کی کوشش میں اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔ کوئی اپنے دل میں دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ لئے ہوئے ہے اور کوئی حسد اور عداوت کا۔ کوئی دوسرے کی اصلاح کے لئے دعائیں کر رہا ہے اور کوئی دوسرے کی بربادی کی سازشیں کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی جہنم کے شعلے بکھیر رہا ہے اور پھر بھی وہ پھولوں کے باغ میں ہے اور

کوئی جنت کے دروازے کھولنا چاہتا ہے مگر وہ کانٹوں اور آگ کے شعلوں میں پڑا ہوا ہے

کیا یہ دونوں قسم کے لوگ اپنی اپنی کارگزاری دکھا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دونوں کا کوئی فیصلہ نہیں ہونا ہے۔ کیا کوئی ایسی دنیا نہیں جہاں دونوں کا فرق ظاہر ہو۔ کیا یہ دنیا عیاروں اور باطل پرستوں کی تماشا گاہ ہے۔ کیا خدا نے یہ عظیم اہتمام اس لئے کیا ہے کہ یہاں حق پرستوں کے اوپر کتے بھونکیں اور چوکڑ رہیں، بھیڑیے ان کا خون پئیں۔ کیا دنیا کا اسٹیج اس لئے ہے کہ کچھ لوگ یہاں اپنی شیطانی ہوس کی تسکین حاصل کریں اور کچھ لوگ ان کی ہوس کا شکار ہوتے رہیں۔ اور اس کے بعد یہ سارا ڈرامہ یوں ہی ختم ہو جائے۔ ایسا ناممکن ہے۔ کائنات کی بے پناہ معنویت اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ اس کا خاتمہ ایسے بے معنی انجام پر نہیں ہو سکتا۔ بامعنی کائنات صرف بامعنی انجام پر ہی ختم ہو سکتی ہے۔ موجودہ دنیا اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ یہ نامکمل ہے اور اس کا نامکمل ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے بعد ایک آخرت ہو جہاں ہر ایک کو جانچا جائے اور اس کے عمل کے مطابق اس کو اچھا یا برا مقام عطا کیا جائے۔

درخت میں غلط کھاد ڈالئے تو وہ سوکھ کر ختم ہو جائے گا اور جب آپ اس کو صحیح کھاد اور پانی پہنچاتے ہیں تو وہ ایک ہری بھری کائنات کی صورت میں زمین کے اوپر ابھرتا ہے۔ وہ رنگ اور خوشبو اور مذائقہ دیتا ہے۔ وہ تازہ ہوا بکھیرتا ہے اور زمین کی خوش نمائی میں اضافہ کرتا ہے۔ اور بے شمار دوسرے فائدے پہنچاتا ہے۔ یہی حال اس درخت کا ہے جس کو انسان کہتے ہیں، جو شخص خدا کے قانون کے مطابق اپنے وجود کی صحیح نگہداشت کرے گا، جو اپنی ہستی کو صالح خوراک پہنچائے گا وہ خدا کی زمین میں پھلے پھولے گا اور آخرت میں ایک عالی شان باغ کی صورت میں نمایاں ہو گا۔ وہ خوشیوں اور لذتوں کی ایک ایسی کائنات کی شکل اختیار کرے گا جس کی بہاریں کبھی ختم نہ ہوں، جس کے امکانات کی کوئی حد نہ ہو۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اپنی ہستی کے درخت کو غلط پانی دیں اور اس کی جڑوں میں وہ کھاد ڈالیں جو خدا نے اس کے لئے مقرر نہیں کی ہے۔ ایسے لوگ اپنے درخت کو ٹھنٹھ بنا رہے ہیں۔ وہ اس کے ایجاد کی صلاحیت کو فنا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ آخرت کی دنیا میں اس حال میں پہنچیں گے کہ ان کے پاس درختِ حیات کے نام سے سوکھی لکڑیوں کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ جو جہنم میں جلنے کے لئے ڈال دی جائیں۔ اس قسم کے لوگ موجودہ دنیا میں اگر بظاہر تر و تازہ دکھائی دیتے ہوں تو یہ بھی ان کے اوپر خدا کے غضب کی ایک صورت ہے۔ خدا ان کو مہلت دے کر چاہتا ہے کہ وہ اپنی ظاہری سرسبزی سے دھوکے میں پڑ جائیں اور مزید سرکشی کر کے اپنے جرم کو اور زیادہ ثابت کر دیں۔

دنیا میں آدمی اپنے گرد و پیش اعوان و انصار کو دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح دنیا کی زندگی میں اپنے مددگاروں کے ذریعہ میں اپنے کام بنا رہا ہوں اسی طرح آخرت میں بھی بنا لوں گا۔ مگر یہ زبردست بھول ہے۔ آخرت میں آدمی اس حال میں پہنچے گا کہ ہر قسم کا سہارا اس سے دور ہو چکا ہو گا، وہاں وہی شخص سہارے والا ہو گا جس کا خدا سہارا بنے۔ آخرت میں وہ تمام الفاظ بے معنی ہو جائیں گے جو دنیا میں لوگوں کو بامعنی نظر آتے ہیں اور وہ تمام طاقتیں بالکل بے زور ثابت ہوں گی جن کے بل پر آدمی آج اپنے کو طاقت ور سمجھے ہوئے ہیں۔

دنیا پرستی اُن کا دین بھی ہے اور اِن کا بھی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان دنیوی چیزوں (عرض دنیا) کا حریص ہے۔ جب کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ آخرت کو اپنا مقصود بنائے (انفال ۶۷) دنیا کی چیزوں کا شوق کرنا اور ان کی طرف دوڑنا انسان کا عام مرض ہے۔ تمام خرابیوں کی اصل جڑ یہی ہے۔ خدا فراموشی اور بے انصافی کی تمام قسمیں اسی سے وجود میں آتی ہیں۔ جو لوگ خدا کے دین کو نہیں مانتے، وہ یہ کہہ کر دنیا طلبی میں مشغول ہوتے ہیں کہ "زندگی بس یہی موجودہ دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں جینا اور یہیں مرجانا ہے۔ گردش ایام کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے اوپر حکمراں ہو (جاثیہ ۲۴) ان کے سوا وہ لوگ جو دین خدا کے قائل ہیں، ان کے درمیان دنیا طلبی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ ہم خدا کے خاص بندے ہیں اور ہماری مغفرت ضرور ہو جائے گی (سیغفر لنا) یہ عقیدہ ان کو خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بے خوف کر دیتا ہے۔ وہ اسی دنیا میں غرق ہو جاتے ہیں جس کی بابت ان کی آسمانی کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ جو اس میں غرق ہوا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (بقرہ ۲۰۰) دین کے منکر جس دنیا پرستی کو آخرت کا انکار کر کے لئے ہوئے ہیں، اسی دنیا پرستی کو وہ اس احساس کے تحت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم آگ سے محفوظ لوگ ہیں، ہم جن نبیوں اور بزرگوں کو مانتے ہیں وہ بہر حال ہم کو خدا کے یہاں بخشوا لیں گے خواہ ہم جو کچھ کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ کی دنیا پرستی پہلے گروہ سے زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ دوسروں کی طرح صرف دنیا حاصل کرنے پر نہیں رکتے بلکہ اپنی مخصوص نفسیات کے تحت یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی دنیا پرستانہ زندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کی دینی توجیہات شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح خود اللہ کے دین کو ایک دنیوی سودا بنا دیتے ہیں، وہ اپنی خلاف حق کارروائیوں میں اللہ کو بھی ایک فریق بنا لیتے ہیں

وہ دنیا کے مال و دولت پر فریفتہ ہو کر اس کے اوپر ٹوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ رسمی قسم کی دینداری کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم ہیں۔ وہ عہدہ اور شہرت اور لیڈری کے لئے اٹھتے ہیں اور کتاب آسمانی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ عین خدا کے دین کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف سے یہ مشن سپرد کیا جاتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو آنے والے ہولناک دن سے باخبر کریں مگر وہ سماجی امن، معاشی انصاف اور سیاسی اصلاح کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کا طوفان مچاتے ہیں اور خدائی تعلیمات کی خود ساختہ تشریح کر کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ عین اسی کام کے لئے اٹھے ہیں جس کے لئے خدا نے اپنے نبیوں کو بھیجا تھا۔

مگر جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں، جو اپنے آپ کو اس اصلاحی نقشہ پر ڈھالنا چاہتے ہوں جو اللہ کو پسند ہے، وہ موجودہ عارضی دنیا کی چیزوں میں گم نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کی ابدی دنیا کو اپنا مقصود بنائیں گے۔ وہ نفسانی رجحانات سے آزاد ہو کر خدا کی کتاب کو پکڑیں گے۔ ان کا شعار اللہ کے آگے جھکنا ہوگا نہ کہ دنیوی مصالح کی پرستش کرنا (اعراف ۱۷۰) — دنیا کی جن چیزوں کے پیچھے ایک گروہ دوڑ رہا ہے، انھیں کے پیچھے اگر دوسرا گروہ دوڑنے لگے تو وہ اس لئے نہیں چھوٹ جائے گا کہ اس نے دین کے نام پر ایسا کیا تھا۔

دنیا کی زندگی میں حقیقتوں سے پردہ نہیں ہٹایا گیا ہے۔ یہاں آدمی کے لئے ممکن ہے کہ وہ خوبصورت الفاظ میں اپنی اندرونی بے مائگی کو چھپا سکے۔ زرق برق سواریوں اور شان دار مجالس میں ظاہر ہو کر لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکے کہ جس شخص کے جلو میں اتنی عزتیں اور شوکتیں چل رہی ہیں وہ ضرور حق پر ہوگا۔ تاہم "خصام" کے وقت ایسے شخص کا بھرم کھل جاتا ہے۔ جب کسی سے اس کا جھگڑا پیش آجائے تو خوبصورت باتیں کرنے والا شخص فوراً بد کلامی پر اتر آتا ہے، وہ اپنے لبادہ کو اتار پھینکتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھتے ہیں کہ حسین پردہ کے اندر ایک بدہیئت انسان چھپا ہوا تھا۔ ایسے شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ جہاں صرف باتوں اور تقریروں کا جوہر دکھانا ہو وہاں تو وہ خوب اونچی اونچی باتیں کرتا ہے اس کی زبان سے قومی تعمیر، باہمی امن، بزرگوں کی روایات کا تحفظ اور معیاری انسانی سماج کے قیام کی باتیں نکلتی ہیں ۔ مگر تقریر کے اسٹیج سے اتر کر جب وہ اپنے عملی دائرہ میں آتا ہے جہاں اس کو خود ان اچھی باتوں کے قائم کرنے کا اختیار ہے جو اس نے اپنی تقریر میں کہی تھیں تو اچانک وہ بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ یہاں وہ اپنی کبریائی قائم کرنے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں خاندان برباد ہوں، کسی کی معاشیات تباہ ہو جائیں، ماحول میں اصلاح کے بجائے فساد برپا ہو۔ جب اس کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تمھارا عمل تمھاری بات کے مطابق نہیں تو گھمنڈ کی نفسیات اس کے لئے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہوئے بھی اپنے کو گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

اللہ کے نزدیک ایسے خوش گفتاروں کی کوئی قیمت نہیں، اس کو تو وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی زندگی کی قیمت پر حق کو اختیار کریں۔ جب حق کو قبول کرنے کے لئے اپنے کو بے عزت کرنے کا سوال ہو، جب اپنے مقابلہ میں دوسرے کی بڑائی کا اعتراف کرنا پڑے، جب دنیوی مصلحت سے بے پروا ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہو تو آدمی ہچک کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو حق کی واحد قیمت ہے۔ اور جو شخص حق کی قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو وہ اس کا خریدار کیسے بن سکتا ہے۔

اللہ کو وہ بندے پسند ہیں جو اللہ کی طرف اس طرح بڑھیں کہ اپنی ذات اور اپنے قلب و دماغ کو انھوں نے ہمہ تن اللہ کے حوالے کر دیا ہو۔ اس کے سوا کسی اور کی وفاداری ان کے دل میں باقی نہ رہے۔ شیطان مختلف طریقوں سے آدمی کی وفاداری کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ کبھی مصلحتوں کو سامنے لاتا ہے، کبھی کسی فائدے کا لالچ دیتا ہے۔ کبھی کسی نقصان سے ڈراتا ہے۔ کبھی عزت کے سوال کو سامنے کھڑا کرتا ہے۔ اس قسم کے وساوس ڈال کر شیطان چاہتا ہے کہ آدمی خدا سے بس رسمی تعلق رکھے اور اپنے حقیقی معاملات اور اپنی روز و شب کی زندگی میں اپنی دل پسند راہوں پر چلتا رہے۔ "اسلام میں پورا داخل نہ ہونا" یہ ہے کہ آدمی عبادتی آداب میں خدا کے سامنے سر جھکائے مگر جب خدا کا کوئی بندہ اس کے سامنے خدا کی ایک دلیل پیش کرے تو وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ نماز میں صف بندی کا اہتمام کرے مگر جب راہ خدا میں متحدہ جدوجہد کا سوال ہو تو اتحاد میں شامل نہ ہو۔ وہ قرآن کے الفاظ کو ادا کرنے میں مخارج کی درستگی پر خوب زور دے مگر قرآن میں اپنی زندگی کی رہنمائی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے۔ روزہ میں وہ کھانا پینا ترک کرنے میں کوتاہ نہ ہو مگر جھوٹ بولنے اور جھوٹے کام کرنے سے روزہ نہ رکھے۔

غیر دینی کام پر دینی کام کا کریڈٹ لینا

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۚ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ○ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (آل عمران ۸۸-۱۸۷)

اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہ چھپاؤ گے۔ پھر انھوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلہ میں مول لے لیا تھوڑا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اس کام پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ بن کئے پر ان کی تعریف ہو، ان کو مت سمجھو کہ وہ عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

"بن کئے پر تعریف چاہنا" سے مراد ہے غیر دینی کام پر دینی کام کا کریڈٹ لینا۔ قومی اور دنیوی محرکات کے تحت سرگرمی دکھانا اور اس کے حق میں کتاب الٰہی کے حوالے اس طرح پیش کرنا گویا یہ سب کچھ دین خداوندی کے احیار کے لئے کیا جارہا ہے۔ اس طرح کا مظاہرہ کرنے والے اس خوش گمانی میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ خدا کے یہاں دین داری کا انعام پائیں گے اور ان کو بے دینوں کے زمرہ میں شامل نہ کیا جائے گا۔ ان کے نمائشی کام ان کو خدا کی پکڑ سے بچانے والے ثابت نہیں ہوسکتے۔

ان آیتوں میں یہود کے کردار پر تنقید ہے۔ یہود نے اپنی مذہبی کتاب تورات کو ترک نہیں کیا تھا اور نہ اس کے تذکرہ کو چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے یہاں تورات پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ اپنی تقریبات اور رسوم کو وہ مذہبی انداز سے انجام دیتے تھے۔ نبیوں اور بزرگوں کے قصے بے شمار تعداد میں ان کے درمیان پھیلے ہوئے تھے۔ مذہبی علمار کثرت سے ان کے درمیان موجود تھے۔ وہ جو کچھ کر رہے تھے سب دین یہود کے نام پر کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے دنیوی اور قومی کاموں کے ذیل میں بھی کتب مقدسہ کے حوالے دیتے تھے۔ مگر باعتبار حقیقت یہ دین یہود کا استحصال تھا نہ کہ اس پر عمل کرنا۔ تورات کی حیثیت ان کے نزدیک رہنما کتاب کی نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسی کتاب تھی جو ان کے لئے فخر کا نشان ہو اور ان کی قومی سرگرمیوں کو سند جواز عطا کرے۔

انھوں نے عقیدہ بنایا کہ اسرائیلی نسل کے تمام لوگ جنت میں جائیں گے اور اس کے لئے ان کو اپنے دین میں دلیل مل گئی (آل عمران) اپنی جاہلیت کی زندگی کے نتیجہ میں پیش آنے والے مصائب کی خاطر وہ قومی فنڈ قائم کرتے اور اس کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے تورات کا حکم پیش کرتے (بقرہ ۸۵) وہ اپنے علمار اور بزرگوں کے پیچھے چلتے اور اپنی اس شخصیت پرستی کو خدا پرستی کا نام دے دیتے (توبہ ۳۱) حتیٰ کہ انھوں نے نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا اور اپنے کو برسر حق ثابت کرنے کے لئے تورات سے دلیل پیش کی (آل عمران ۱۸۳) یہودیوں کی صہیونی تحریک جو تمام تر قومی احیار کی تحریک ہے، اس کے لئے بھی ان کو دلائل تورات ہی کے صفحات سے مل رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کے

نزدیک یہ اس وعدہ الٰہی کو پانے کی کوشش ہے جو خداوند نے اپنی کتاب میں ان کے لئے لکھ دیا ہے ـــــــ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں آیات اللہ کو دے کر "ثمن قلیل" لینا کہا گیا ہے۔ یعنی دنیوی سرگرمیوں اور قومی تحریکوں کے لئے آسمانی سند پیش کرنا، احیار دین کا نام لینا اور احیار قوم کے کام میں مشغول رہنا، اللہ کی کتاب کو پڑھنا پڑھانا مگر عملاً مقصود یہ ہونا کہ قوم کے اندر مذہبی قیادت حاصل ہو جائے۔

یہود کے سپرد جو مشن کیا گیا، وہ یہ تھا کہ وہ اللہ کی دی ہوئی کتاب کو اس کی اصل صورت میں لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ وہ توحید کی تعلیمات سے دنیا والوں کو باخبر کریں گے۔ یہ وہی چیز تھی جس کو دعوت الی اللہ یا شہادت علی الناس کے نام سے امت محمدی پر فرض کیا گیا ہے۔ یہ ایک خالص اخروی کام ہے اور اس کو اخروی انداز ہی میں انجام دینا ہے۔ مگر یہود نے دعوت آخرت اور پیغام توحید کے مشن کو چھوڑ دیا۔ عام قوموں کی طرح انھوں نے ایک دنیادارانہ زندگی اختیار کرلی۔ البتہ اس کے ساتھ وہ تورات کا درس اس طرح دیتے رہے گویا کتاب اللہ کی رسی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی ہے۔ گویا وہ جو کچھ کر رہے ہیں عین خدا کے حکم کے تحت کر رہے ہیں۔ تورات کی تعلیمات کی انھوں نے ایسی تشریح و تعبیر کی جو ان کی اپنی خود ساختہ زندگی پر چسپاں ہوتی ہو اور اس کی تصدیق کر رہی ہو۔ انھوں نے تعمیل نفس کا کام کیا اور اس پر تعمیل خداوندی کا لیبل لگا دیا۔ انھوں نے قومی احیار کی سرگرمیوں کو دینی احیار کی سرگرمیوں کا مقام دے دیا۔ انھوں نے قیادتی عزائم کے تحت تحریکیں اٹھائیں اور ان کو یہ حیثیت دے دی گویا یہ سب خداوند عالم کا بول بالا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ایسے لوگ گویا ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں جس کو انھوں نے حقیقۃً کیا نہیں۔ اس قسم کا دھوکا خدا کے یہاں نہیں چل سکتا۔ ان کے نمائشی کام ان کو خدا کے یہاں بچانے والے ثابت نہ ہوں گے۔ اپنی تمام خوش فہمیوں کے باوجود وہ اسی آگ کے عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے جس کو وہ صرف دوسروں کے لئے سمجھتے تھے۔

دعوت حق کا کام خالص اخروی کام ہے۔ یہ کام صرف وہی گروہ انجام دے سکتا ہے جو آخرت کی سطح پر جی رہا ہو۔ جو لوگ خود اپنے لئے جنت اور جہنم کو سب سے بڑا مسئلہ بنائے ہوئے ہوں وہی محسوس کر سکتے ہیں کہ سب سے بڑا کام یہ ہے کہ لوگوں کو جنت اور جہنم کے مسئلہ سے آگاہ کیا جائے۔ کتاب آسمانی کے حامل گروہ پر جب زوال آتا ہے تو وہ دنیا کی سطح پر جینے لگتا ہے۔ اب دنیا کی عزت و ذلت اس کے لئے سب سے بڑی چیز بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "انذار آخرت" کے کام کا محرک اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ اب وہ خدا کے دین کو اپنی دنیوی زندگی کی سطح پر اتار لاتا ہے۔ وہ اپنی قومی تحریکوں کو پیغمبرانہ تحریک کا عنوان دیتا ہے۔ وہ اپنے دنیوی مسائل کے لئے اٹھتا ہے اور اس کو آسمانی ہدایت کی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے۔ وہ مادی مقاصد کے لئے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس کو خدا کی راہ میں جہاد کرنا بتاتا ہے۔ وہ اپنی لیڈری کو بچانے کے لئے اٹھتا ہے اور نعرہ یہ لگاتا ہے کہ "ملک و ملت کو بچاؤ" ـــــــ یہ سب گویا بن کئے پر کئے کی تعریف چاہنا ہے۔ مگر اس قسم کی کوشش کسی کو صرف سزا کا مستحق بناتی ہے نہ کہ انعام کا۔ (۱۳ جون ۱۹۷۹)

جب خدا کے عہد کو توڑ دیا جائے

سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ میں بتایا گیا ہے کہ امت محمدی سے پہلے جو لوگ دین خداوندی کے حامل بنائے گئے تھے، ان سے اللہ نے کیا عہد لیا تھا اور کیا ذمہ داریاں ان کے اوپر ڈالی تھیں۔ وہ یہ تھا کہ ——— وہ اپنی زندگی میں نظم و اتحاد قائم کریں گے۔ وہ نماز کی ادائگی کریں گے۔ اپنے مالوں میں زکوٰۃ دیں گے۔ دعوت حق کے ساتھ تعاون کریں گے اور اپنی جان و مال کو اس سے بچا کر نہ رکھیں گے۔

آیت نمبر ۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس عہد پر قائم نہ رہے۔ انھوں نے اس کو توڑ دیا۔ خدا کے مقرر کئے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر وہ خود ساختہ راہوں پر چلنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ان کو جو سزا ملی وہ ——— لعنت تھی۔ وہ خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گئے۔

لعنت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں :

ابعدنا ھم عن الحق وطرد ناھم عن الھدیٰ

یعنی خدا نے ان کو ہدایت کے راستے سے ہٹا دیا اور حق سے دور کر دیا۔ اس "لعنت" کے بہت سے درجے ہیں۔ جب بھی خدا پرستی کا کوئی دعوے دار گروہ اپنے دعوے کے تقاضے پورے کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے اوپر اس عمل کی ابتدا ہو جاتی ہے اور مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ یہ عمل جب تک درمیانی مرحلوں میں ہوتا ہے واپسی کا امکان باقی رہتا ہے۔ مگر جب لوگ اپنے انحراف میں اس انتہائی درجے تک پہنچ جائیں جس درجے تک یہود پہنچ گئے تو خدا کی طرف سے ان کے اوپر لعنت کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کا حق کی طرف واپس آنا ممکن نہیں رہتا۔

لعنت کا یہ عمل کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، اس کے پانچ خاص مظاہر قرآن میں بتائے گئے ہیں۔

۱۔ دل کا سخت ہو جانا ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو مسلسل نظر انداز کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر کُند ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر سے وہ لطیف احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو آدمی کو باطل کے خلاف بے چین رکھتے ہیں اور حق کی طرف اسے کھینچتے رہتے ہیں۔ حق پرستی کی قوی ترین دلیلیں اس کو بے وزن معلوم ہوتی ہیں، خدا اور رسول کے صریح ارشادات سامنے آنے کے باوجود اس کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ دے۔

۲۔ کلام الٰہی میں تحریف ——— یعنی ان کے اندر اتنی ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے خدا کے کلام کو بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ کلام الٰہی کی حیثیت ان کے نزدیک یہ نہیں رہتی کہ وہ انھیں راستہ بتائے بلکہ اس کا کام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے غلط اعمال کی تصدیق کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کی غلط تاویلیں کرتے ہیں، وہ خدا کے قانون کے ساتھ اس قسم کا عمل کرنے لگتے ہیں جو وکالت خانوں میں انسانی قانون کے ساتھ ہوتا ہے، وہ خدا کے کلام کو اس کی صحیح جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

۳۔ تعلیمات الٰہی کے بڑے حصے کو بھلا دینا۔ یہاں بھلا دینے سے مراد ترک کر دینا ہے۔ یعنی دین کی بعض شکلیں تو ضرور اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر اس کے بڑے حصے یا دوسرے لفظوں میں اس کی روح کو وہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ کسی صاحبِ کتاب گروہ کی یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب دین مقصدِ زندگی کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہیں رہتا۔ جب ایمان ایک زندہ شعور کے بجائے ایک روایتی عقیدے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت ان لوگوں کی زندگی کے حقیقی مسائل کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے ذہن اور ان کے جذبات کسی اور سمت میں کام کرنے لگتے ہیں۔ البتہ دین کا اقرار اور دین کی بعض خارجی شکلیں اب بھی ان کے یہاں موجود رہتی ہیں، مگر وہ محض ایک نسلی اور روایتی چیز کی حیثیت سے ان کے اوپر چپکی ہوئی ہوتی ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

۴۔ خیانت ــــــ یہ چوتھی چیز ہے جن کو ان لفظوں میں ظاہر فرمایا ہے "اور تم برابر ان کی خیانتوں سے مطلع ہوتے رہتے ہو۔" خیانت کے معنی ہیں۔ کسی شخص سے جس عمل کی توقع کی جائے اس کے خلاف کام کرنا۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں۔ خَانَهٗ سَیْفُهٗ (اس کی تلوار نے خیانت کی) یعنی آدمی نے اپنے دشمن کے مقابلہ میں تلوار پر جو بھروسہ کیا تھا، اس میں تلوار پوری نہیں اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت زدہ گروہ سے اس کا کردار رخصت ہونے لگتا ہے، اس کے قول و فعل میں مطابقت باقی نہیں رہتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے مگر اسے وفا نہیں کرتا۔ دوسروں سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کے جو حقوق وہ اپنے اوپر عائد کرتا ہے ان کو پورا کرنے کی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو ان حقوق کو تسلیم کرتا جو مالک کی طرف سے بندے کے اوپر عائد ہوتے ہیں اور نہ اس اعتماد میں پورا اترتا جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔

۵۔ باہمی عداوت اور بغض ــــــ یعنی جب انھوں نے خدا کی رسی چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص کا قبلہ الگ الگ ہو گیا۔ وہ باہم جڑے رہنے کے بجائے باہم متفرق ہو گئے۔ دینی معاملات میں ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق اور دنیوی معاملات میں ایک دوسرے کی لوٹ کھسوٹ ان کا طریقہ بن گیا۔ ان میں سے ہر شخص کے سامنے صرف ذاتی اغراض ہیں۔ اور جب ذاتی اغراض کسی گروہ کا قبلہ بن جائیں تو اختلافات اور کش مکش کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ذاتی اغراض کی پرستش کے ساتھ اتحاد باقی نہیں رہ سکتا۔ خدا کی رسی سے بندھا رہنا اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور خدا کی رسی کو چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں بغض و عناد پھوٹ پڑے۔

اس تفصیل کے بعد بتایا گیا کہ جو لوگ ایسے کسی گروہ کی اصلاح کے لئے اٹھیں، ان کا اخلاق کس قسم کا ہونا چاہئے۔ فرمایا "ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو، اللہ یقیناً محسنین کو پسند کرتا ہے۔" یعنی ایسے گروہ کی نفسیات اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ جب انھیں کچھ خدا کے بندے ان کے بھولے ہوئے سبق کی طرف بلاتے ہیں تو ان کی طرف سے جو جواب ملتا ہے وہ نہایت اشتعال انگیز اور داعی کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ داعی خود بھی اسی قسم کا جواب نہ دینے لگے جو بگڑے ہوئے گروہ کی طرف سے اس کو مل رہا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنا کام جاری رکھے۔

آخر میں فرمایا "بہت جلد اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کر رہے ہیں" یعنی داعی کو اپنے فرض کی ادائیگی کی فکر ہونی چاہیے، نہ کہ مخاطب کے انجام کی۔ یہ کام اللہ کے ذمہ ہے اور وقت آنے پر وہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

کیا وہ بدکے ہوئے جانور ہیں جو واپس آنا نہیں جانتے ——

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ (مدثر، آخر)

ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے منہ پھیرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شور سن کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے ورق دئے جائیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ ہرگز نہیں، یہ تو یہ ایک نصیحت ہے۔ پھر جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

اللہ اپنے دین کی پیغام بری کے لئے ہمیشہ ایسے شخص کو چنتا ہے جس کے جاننے والے اس کو ایک پسندیدہ شخص کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ جس کی صلاحیت اور صالحیت کی وجہ سے اس کے لوگوں نے اس کے بارے میں اونچی اونچی امیدیں باندھ رکھی ہوں (ہود ۶۲) مگر جب وہ حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو اچانک لوگ اس سے بدک جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت بے آمیز حق کی دعوت ہوتی ہے اور بے آمیز حق انسان کے لئے ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض چیز رہا ہے۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت ان تمام لوگوں کو متوحش کر دیتی ہے جو ملاوٹی دین یا خود ساختہ مذہب کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کئے ہوئے تھے۔

انسان کی گمراہی کبھی یہ نہیں رہی ہے کہ وہ ناحق کا علم بردار بن کر کھڑا ہوا ہو۔ انسان کی گمراہی یہ ہے کہ وہ حق کے ساتھ ناحق کو ملائے ہوئے ہو۔ وہ حق کا نام لے گمراہی کے ساتھ۔ اپنی عقیدتوں اور وفاداریوں کو اس نے ناحق کے لئے خاص کر رکھا ہو۔ پیغمبر کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو ہر ایک کو اس میں اپنا حقیقی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس نازک مقام پر ضرب لگا رہی ہے جہاں وہ حقیقۃً جی رہا تھا ——— کسی کو اپنی شخصیت کا بت گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی کو اپنے دلائل کا غبارہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کو اپنی شان و شوکت بے رونق ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اگر اس نے اس حق کو مان لیا تو اس کو اپنے بنے بنائے ڈھانچہ کو اجاڑ دینا پڑے گا۔ ان وجوہ سے لوگ اس کی آواز سے اس طرح بدک جاتے ہیں جیسے کوئی تصویری شیر اچانک زندہ ہو کر کھڑا ہو جائے اور لوگ اس کے مہیب وجود کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوں۔

تاہم بدکے ہوئے لوگ اپنے کو برسر حق ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی باتیں نکالتے ہیں: سچائی کے اعلان کے لئے کیا اسی معمولی شخص کا انتخاب کیا جانا تھا، اس کے بجائے ان "اکابر" کا انتخاب کیوں نہ کیا گیا

جن کی کبریائی مسلم ہو چکی ہے۔ اگر یہ سچائی ہے تو وہ ایک ہی شخص پر کیوں اتری، ہم میں سے ہر شخص کے پاس خدا کا ایک کھلا خط کیوں نہ آ گیا۔ وغیرہ۔ مگر یہ سب کوئی واقعی مطالبہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ حق اور ناحق کو جاننے کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان کے حالات نے ان کو جس مذہب تک پہنچا دیا ہے، اس کو وہ پکڑے ہوئے ہیں۔ اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے انھوں نے ایک دین گھڑ لیا ہے اور کچھ ہم خیال لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اس کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مفاد اور اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اس لئے اس کے تقاضے وہ خوب سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقی سچائی کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں، اس لئے روشن دلائل اور واضح تصدیقات کے باوجود وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا کے اندیشہ کو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح وہ آخرت کے اندیشے کو محسوس کرتے تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فوراً نہیں بدکتے۔ وہ ابتداءً دعوت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ داعی کے اعلیٰ اسلوب اور اس کے پیغام کی عمومی کشش کی وجہ سے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی نفسیاتی کمزوریوں سے اوپر اٹھے ہوئے نہیں ہوتے۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ کسی چیز کو اپنے خلاف مزاج پاکر بدک جاتے ہیں اور پھر ایسا بھاگتے ہیں کہ واپسی کا نام نہیں لیتے۔ جب کبھی ان کے ان تعصبات پر زد پڑتی ہے جن کو انھوں نے عرصہ سے پال رکھا ہے۔ جب ان کی چھپی ہوئی وفاداریوں میں سے کسی وفاداری کو ٹھیس پہنچ جاتی ہے۔ جب دعوت ان کی اس "انا" کو چھو دیتی ہے جس کو وہ خدا پرستی کے ظاہری پردہ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے تو اچانک وہ متوحش ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر نظر ثانی کرنے کے بجائے خود دعوت کو قابل نظر ثانی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ کسی شخص کی زندگی میں بہت نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی فطرت زندہ ہے تو وہ زور کرے گی اور ابتدائی توحش کے بعد دوبارہ وہ حق کی رسی کو پہلے کی طرح مضبوطی سے پکڑ لے گا اور اگر فطرت کی چنگاری بجھ چکی ہے تو وہ ایک بار بدکنے کے بعد بدکتا ہی جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں ہوگا۔

اللہ نے یہ دنیا امتحان کے لئے بنائی ہے۔ اس لئے حق کو یہاں بالکل عریاں شکل میں پیش نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر شبہ کا پردہ رکھ کر اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ایسے شخص کی زبان سے بلند ہوتا ہے جو خود انھیں جیسا ایک انسان ہوتا ہے۔ پیغام کو انسانی زبان میں بیان کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ آدمی اس کو رد کرنے کے لئے کچھ خوبصورت الفاظ تراش لے۔ اس آواز کو ہمیشہ ظاہری حیثیت سے غیر اہم حلقوں سے اٹھایا جاتا ہے تاکہ یہ جانچا جاسکے کہ آدمی معنوی حقیقتوں کو اہمیت دیتا ہے یا ظاہری تماشوں کو۔ حق کا پیغام ایک نصیحت ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ نصیحت ہی کی زبان میں سامنے لایا جاتا ہے نہ کہ کسی مجبور کر دینے والے اسلوب میں۔ بہت سے دلائل محض غافل قلب سے نکلے ہوئے بے معنی الفاظ ہوتے ہیں نہ کہ حقیقتہً دلائل۔ جو آخرت سے ڈرنے والے ہیں وہ اس احساس کے تحت بولتے ہیں کہ ان کی ہر بات کا سننے والا سب سے پہلے خدا ہے۔ وہ الفاظ رکھتے ہوئے بھی بے الفاظ ہو جاتے ہیں۔ بجائے کہ اپنی ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لئے الفاظ کا قاموس دہرانے لگیں۔

ذہنی خول : سب سے بڑی رکاوٹ

وقال الذین کفروا للذین آمنوا لوکان خیرا ماسبقونا الیه ط واذلم یهتدوا به فسیقولون هٰذا إفك قدیم (احقاف ۱۱)

انکار کرنے والے لوگ ماننے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس کو قبول کرنے میں یہ لوگ ہم سے آگے نہ نکل جاتے۔ جب وہ اس کے بتانے سے راہ پر نہیں آئے تو اب وہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔

کسی معاشرہ میں جب حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو عام طور پر وہ لوگ اس کی طرف کھنچتے ہیں جو کسی نہ کسی قسم کی کمی سے دوچار ہوں اور اپنے اندر خلا محسوس کرتے ہوں۔ ان کا اندرونی خلا کا احساس ان کے لئے ایک مددگار قوت بن جاتا ہے اور وہ کسی حجاب یا رکاوٹ کے بغیر حق کو پالیتے ہیں اور اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ لوگ جن کی عزت و شہرت کے کھونٹے گڑے ہوئے ہوں، جو فتح و کامرانی کے احساس میں گم ہوں جن کی تمام ضرورتیں بافراط پوری ہو رہی ہوں، جن کو ہر طرف اپنے لئے میدان کھلے ہوئے نظر آتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے اندر ایک قسم کی قناعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنے سے باہر کسی آواز کو اپنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

حق کی آواز کو قبول کرنے میں سب سے زیادہ پیچھے وہ لوگ رہتے ہیں جن کو روایتی مذہبی نظام میں بڑی بڑی گدیاں حاصل ہوگئی ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اسلاف کا جانشین کہا جاتا ہے۔ مذہب کی نمائندگی کے اسٹیج پر وہ تقریری کمال دکھا رہے ہوتے ہیں، صدارت اور استقبال کے اعزازات ہر جگہ ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ہدیے اور نذرانے کی رقمیں ان کے پاس اس طرح آنے لگتی ہیں گویا وہ مذہبی شہزادے ہیں اور ساری قوم ان کی باج گزار ہے۔ یہ صورت حال ان کے اور ان کے پیروؤں کے اندر یہ جھوٹا یقین پیدا کر دیتی ہے کہ وہی حق پر ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ حق کی آواز کی طرف نسبتاً کمتر درجہ کے لوگ بڑھ رہے ہیں، اور وہ اپنے اندر اس کے لئے کشش نہیں پاتے، تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ حق نہیں ہے۔ اگر وہ حق ہوتا تو لازم تھا کہ وہ سب سے پہلے ان کو اپنی طرف کھینچتا۔

خدا کو پانے کی واحد قیمت اپنی ذات کی نفی ہے۔ اپنی نفی کے بعد ہی خدا کا اثبات ہوتا ہے۔ خدا ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ان سینوں میں اترتا ہے جنھوں نے غیر خدائی چیزوں سے اپنے کو پوری طرح خالی کر لیا ہو۔ جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ خدا کا ہم صحبت بن سکے تو یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ ان دنیوی زخارف سے خالی ہو چکا ہوتا ہے جو انسانوں کی نظر میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کی نظریں دنیا کی چمک دمک سے اوپر نہ اٹھی ہوں وہ ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے انسان کو وہ حق کا علمبردار سمجھنے کے بجائے ایک سرپھرا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی "گدیوں" پر بیٹھے ہوئے نہایت اطمینان سے کہہ دیتے ہیں: برخود غلط قسم کے لوگ ہمیشہ اس قسم کا ڈھونگ کھڑا کرتے رہتے ہیں، یہ بھی اسی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

آخرت میں اللہ عیاناً سامنے آجائے گا۔ مگر موجودہ دنیا میں اللہ پر اس حال میں ایمان لانا ہے کہ وہ حالت غیب میں ہے۔ یہاں خدا کی نشانیوں سے خدا کو پہچاننا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس دنیا میں خدا دلیل اور برہان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ آیات اللہ پر غور کرو۔ اللہ کی آیتوں کو ماننا خدا کو ماننا ہے۔ اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا خدا کا انکار کرنا ہے۔ آیات کیا ہیں۔ یہ خدا کو پہچاننے کے دلائل ہیں جو کبھی فطرت کے اشاروں میں اور کبھی داعی کے الفاظ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

صحیح دلیل خدا کی طرف سے آئی ہوئی بات ہوتی ہے۔ اس کی صحت کو پالینا خدا کو پالینا ہے اور اس کے آگے جھکنا خدا کے آگے جھک جانا۔ صحیح دلیل سامنے آنے کے بعد جو شخص جدال کرے، جو اپنی دولت اور وجاہت کے گھمنڈ میں اس کو نظر انداز کردے، وہ گویا خدا کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جس کے پاس خدا خود آیا مگر اس نے خدا کا استقبال نہ کیا۔

پیغمبروں نے خدا کی طرف سے حق کی آواز بلند کی۔ مگر وقت کے غالب لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی بڑی وجہ ان کی خود فریبی تھی۔ چوں کہ وہ وقت کی معاشیات پر قابض تھے۔ اقتدار کے اداروں میں ان کو رتبہ حاصل تھا۔ اعوان و انصار کی بھیڑ ان کے گرد جمع تھی۔ اس بنا پر ان کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جس چیز کو حق کہا جاتا ہے اس کا انکار کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کا دبدبہ بدستور قائم ہے۔ ان کے مواقع پھر بھی کھلے ہوئے ہیں اور ان کے دنیوی کام اس کے باوجود بن رہے ہیں تو وہ ایک قسم کے نفسیاتی فریب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ داعی حق کے مقابلہ میں اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ "جب میں کامیاب ہوں تو یقیناً میں ہی حق پر ہوں"۔

ظاہری کامیابی کسی کے برسرحق ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ مگر ظاہری کامیابی اکثر آدمی کو خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آدمی کا رب بعض اوقات اس کو وقتی اور ظاہری کامیابی اس لئے دے دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اس کو آزمائے۔ وہ دیکھے کہ کیا وہ اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتا ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذہنی خول میں اپنا ایک گھروندا بنا لیتا ہے اور اسی کے اندر جینے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے خیالی گھروندے کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے خود ساختہ گھروندے کے خانہ میں چوں کہ اس کو اپنی ذات درست نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ فی الواقع بھی وہ درست اور صحیح ہے۔

خدا زمین و آسمان کی خاموش زبان میں بولتا ہے۔ وہ اپنے چنے ہوئے بندوں کے ذریعہ اپنی بات کا اعلان کرتا ہے وہ انسان کے ضمیر میں داخل ہو کر حقیقت کا آئینہ اس کے سامنے کر دیتا ہے۔ مگر انسان اپنی جھوٹی خوش گمانیوں کی وجہ سے ان پر دھیان نہیں دیتا۔ خدا اس کو سچائی کی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر وہ اپنے نفسیاتی بندھنوں کو توڑ کر اس کی طرف نہیں دوڑتا۔ خدا کا حسین روپ اس کے سامنے کھولا جاتا ہے۔ مگر وہ اس کی قدر دانی کا حق ادا نہیں کرتا۔ موت ان جھوٹی خوش گمانیوں کے طلسم کو توڑ دے گی۔ اس وقت آدمی کو معلوم ہوگا کہ وہ جہنم کے کنارے کھڑا ہوا تھا اگرچہ وہ اپنے آپ کو جنت کا مالک سمجھ رہا تھا۔ ■

ایسا کیوں؟

انجیل کے مطابق، فلسطین کے یہودیوں نے جب حضرت مسیح کی پیغمبری کو ماننے سے انکار کردیا تو آخر میں انھوں نے آپ کو کافر قرار دے کر مار ڈالنے کی سازش کی۔ ان کے مذہبی سردار نے کہا: وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اس کے منھ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے۔ جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں۔ وہ اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔ رومی حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام کا ان کا ایک مشہور ڈاکو قیدی تھا۔ پس جب وہ اکھٹے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا: تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمھاری خاطر چھوڑ دوں۔ برابا ڈاکو کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ انھوں نے اس کو حسد سے پکڑوایا ہے۔ انھوں نے کہا برابا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں۔ سب نے کہا وہ مصلوب ہو۔ اس نے کہا کیوں۔ اس نے کیا برائی کی ہے۔ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر کہنے لگے وہ مصلوب ہو۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا بلکہ الٹا بلوا ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا: میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب میں کہا: اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا کہ مصلوب ہو۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغہ کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور مصلوب کرنے کو لے گئے۔ (متی باب ۲۸)

یہود نے اپنی تاریخ کے مطابق، یسعیاہ نبی، یرمیاہ نبی، زکریا نبی، یحییٰ نبی کو قتل کیا۔ عیسیٰ مسیح کو بھی اپنے خیال کے مطابق قتل کر ڈالا۔ تاہم اللہ نے آنجناب کو بچالیا۔ اسی طرح انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں اپنی قوم کے صالحین کو قتل کیا۔ یہ غیر معمولی سنگ دلی ان سے کیوں ظاہر ہوئی۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی: تنقید کو برداشت نہ کرنا۔ انبیاء اور ان کے سچے پیرو یہود کی برائیوں پر ٹوکتے تھے اور ان کو انصاف کی تلقین کرتے تھے (وَیَقْتُلُونَ الَّذِینَ یَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ، آل عمران ۲۱) یہود نے اپنی بے دین زندگی پر دین کا لیبل لگا رکھا تھا۔ داعیان حق جب اس کی حقیقت کھولتے تو وہ بگڑ جاتے۔ یہی صورت حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت پیش آئی۔ یہود اپنے کو اس حیثیت سے پیش کرتے تھے کہ وہ آسمانی ہدایت کے حامل ہیں۔ وہ نبیوں کی اولاد ہیں۔ وہ دین خداوندی کے نمائندے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو محسوس ہوا کہ قرآن کی دعوت ان کی دینی حیثیت کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ وہ ان کو دینی پیشوائی کی گدی سے

اتار رہی ہے۔ وہ آپ کی دعوت کے سخت مخالف ہوگئے۔ حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ (مائدہ۔ ۸۲) مکہ کے مشرکین نے یہودی علماء سے پوچھا: دیننا خیر ام دین محمد (ہمارا دین اچھا ہے یا محمد کا دین) یہودیوں نے جواب دیا بل دینکم خیر من دینہ (تمھارا دین محمد کے دین سے اچھا ہے) انھوں نے آپ کو اور آپ کی دعوت کو ختم کرنے کے لئے ہر ناجائز کو اپنے لئے جائز کرلیا۔ سازش، ظلم، عہد شکنی، بے انصافی، قتل یہ سب چیزیں ان کی شریعت میں حرام تھیں مگر اسلام کی دعوت کو مٹانے کے لیے یہ سب چیزیں ان کے لئے حلال بن گئیں۔

آسمانی کتاب کے حامل گروہ میں یہ قساوت (سخت دلی) کیسے آتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کو گوارا کرے اور ایک بے ضرر بندۂ خدا کو عدالت میں گھسیٹے۔ وہ کفار و مشرکین کا استقبال کرے اور اللہ کی طرف بلانے والے شخص کا بدترین دشمن بن جائے۔ وہ خدائی ہدایت کے نام پر قیادت حاصل کرے اور جب خدائی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے کہا جائے تو وہ کہنے والے کے لئے بھیڑیے سے زیادہ بے رحم ثابت ہو۔ وہ دین خداوندی کو دنیوی کاروبار بنائے اور جب اس بیا سے ٹوکا جائے تو وہ اس کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے سامنے کھلے کھلے دلائل اور نشانیاں آئیں مگر وہ بے پروائی کے ساتھ ان کو نظر انداز کردے۔ اس بدترین قساوت کی وجہ، قرآن کے مطابق، وہ خود ساختہ عقیدہ ہے جو اس کو خدا کی پکڑ سے بے خوف بنا دیتا ہے:

ذلك بانهم قالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات وغرهم فی دینهم ما کانوا یفترون (آل عمران۔ ۲۴)

یہ اس سبب سے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو آگ نہیں چھوئے گی بجز چند گنے ہوئے دنوں کے۔ جو کچھ یہ گھڑتے رہتے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

دینی تعلیمات کا خود ساختہ مطلب نکال کر یہود نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ جنت ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ ان کے انبیاء اور بزرگ اس وقت تک جنت میں نہ جائیں گے جب تک تمام اسرائیلیوں کو جنت میں داخل نہ کرلیں۔ ان کا کہنا تھا کہ "جہنم کی آگ اسرائیلی گنہ گاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی" اور بالفرض کسی بداعمالی کی وجہ سے دوزخ میں جانا ہوا تو وہ صرف چند دن (زیادہ سے زیادہ چالیس دن) کے لئے ہوگا۔ اس قسم کا عقیدہ جب کسی گروہ میں پیدا ہو جائے تو اس کے اندر سے عذاب آخرت کا کھٹکا نکل جاتا ہے۔ وہ ظلم اور سرکشی کے لئے بے حد جری ہو جاتا ہے۔ اس کو جب کسی سے عداوت ہوتی ہے تو اس کو ذلیل اور ناکام کرنے کے لئے وہ کسی حد پر نہیں رکتا۔ کیوں کہ آدمی کو روکنے والی چیز جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کا اندیشہ ہے اور اس سے وہ پہلے ہی محفوظ ہو چکا ہے۔

آدمی ہمیشہ ایسی آواز کا دشمن ہو جاتا ہے جس میں اس کو اپنی حیثیت کی نفی ہوتی ہوئی دکھائی دے۔ اور جب معاملہ دینی حیثیت کی نفی کا ہو تو آدمی کا ردعمل اور بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں نہ صرف دنیوی حیثیت مجروح ہوتی بلکہ آخرت کا انعام بھی مشتبہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

جب دلیل، دلیل نظر نہ آئے

ایک گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، اس کی گمراہی یہ نہیں ہوتی کہ وہ دین سے بالکل بے تعلق ہوجائے۔ اس کی گمراہی تحریف (نساء ۴۶) ہے۔ یعنی خود ساختہ دین پر چلنا اور لفظی تاویلوں اور تشریحوں کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا کہ یہی عین خدا اور رسول کا دین ہے۔ بالفاظ دیگر، دین کا نام لیتے ہوئے بے دینی اختیار کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جو دین مقرر کیا ہے، اس کی ایک سیدھی شاہراہ (صراط مستقیم) ہے۔ یہ شاہراہ ہے —— اللہ پر یقین، آخرت کا خوف، خشوع اور انابت، بندوں کے ساتھ خیر خواہی، معاملات میں انصاف، بے لاگ حق پرستی، دعوت الی اللہ وغیرہ۔ یہی وہ اصل چیزیں ہیں جو اللہ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہیں سارا قرآن ان کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ ان کیفیات و اعمال کے ساتھ جو زندگی بنتی ہے اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی کہہ سکتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے بعد جب قوموں میں قساوت (حدید ۱۶) آجاتی ہے اور دھیرے دھیرے آخرت کا فکر کمزور پڑ جاتا ہے تو دنیا پرستی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اب لوگوں کے اندر ایک اور دین ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ یہ ہے دنیا رخی دین جس کو قرآن میں آخرت کے بدلے دنیا خریدنا (بقرہ - ۸۶) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی دنیا پرستانہ زندگی پر دین کا لیبل لگانا، خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ دنیوی اعمال کو آخرت کی کامیابی کا سبب بتانا۔ اسلام حقیقۃً یہ ہے کہ اپنی زندگی کو خدائی مرضیات کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ مگر اب ایک ایسا اسلام وجود میں آتا ہے جس میں آدمی خود اسلام کو اپنے اوپر ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ اسلام کے پیچھے چلنے کے بجائے اسلام کو اپنے پیچھے چلانا شروع کر دیتا ہے۔

لوگ اصل دینی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے اپنے ذوق کے تحت مختلف سمتوں میں منحرف ہونے لگتے ہیں۔ کسی کا منطقی مزاج غیر ضروری قسم کی مذہبی بحثیں ایجاد کرتا ہے اور وہ ان مباحث کا پہلوان بن کر ابھرتا ہے۔ کوئی دنیوی مسائل اور سیاسی جھگڑوں کو اسلامی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے اور ان کا علم بردار بن کر مجاہد اسلام کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی جھوٹے قصے کہانیاں گھڑ کر اسلام کا ایک طلسماتی مجموعہ تیار کرتا ہے اور ان کو سنا سنا کر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ کوئی اسلام کا ایک برکتی ایڈیشن وضع کرتا ہے اور بہت سے لوگ اس کو ایک پُر اسرار دنیوی نسخہ سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ کوئی انسان کے بنائے ہوئے "ازموں" کے ساتھ اسلام کا لفظ شامل کر کے ان تمام لوگوں کی قیادت حاصل کر لیتا ہے جو ان ازموں (نظاموں) کے فریب میں ہیں اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ کچھ لوگ سارا معاملہ اس خوش عقیدگی پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ محبوب خدا کی امت ہیں اور قیامت کے دن وہ بہر حال بخش دیئے جائیں گے۔ غرض اصل شاہراہ دین کے دائیں بائیں بہت سی خود ساختہ راہیں نکال لی جاتی ہیں اور لفظی تاویلات یا گھڑے ہوئے افسانوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ عین دینی ہیں۔ بلکہ یہی وہ دین ہے جس کے لئے تمام انبیاء اس دنیا میں بھیجے گئے۔

کوئی اہل کتاب گروہ جب دین کی اصل شاہراہ کو چھوڑ کر اس طرح منحرف راستوں پر چل پڑتا ہے تو وہ اللہ کی نظر میں سخت مبغوض ہو جاتا ہے۔ اس کا جرم عام انسانوں کے مقابلہ میں دگنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ بے دینی کو دین کے نام پر کر رہا ہے۔ وہ دین خداوندی کا نمائندہ ہو کر لوگوں کے سامنے غلط دین کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہود کا جرم یہی تھا جس کے نتیجہ میں ان کو یہ سخت انتباہ دیا گیا :

یاایھاالذین اوتوا لکتٰب آمنوا بمانزلنا مصدقا لمامعکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علیٰ ادبارھا او نلعنھم کمالعنا اصحٰب السبت و کان امر اللہ مفعولا (نساء ۴۷)

اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ وہ سچا کرنے والی ہے اس چیز کو جو تمھارے پاس ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مٹا ڈالیں چہروں کو۔ پھر ان کو پیٹھ کی طرف الٹ دیں یا ان کو لعنت کریں جیسے لعنت کی ہم نے اصحاب سبت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔

"چہرہ کو بگاڑ کر پیچھے پھیر دینے" کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی جائے گی۔ چہرہ آدمی کی باطنی قوتوں کا مظہر ہے۔ وہ سمع وبصر وفواد کا آئینہ ہے۔ اس لئے چہرہ کو الٹ دینے کا مطلب دیکھنے اور سننے اور سمجھنے کی صلاحیت کو الٹ دینا ہے۔ کتاب آسمانی کے حاملین کی گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ حقائق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ ان کو چھوڑ کر منحرف راستوں پر دوڑتے ہیں۔ عام لوگوں کی گمراہی اگر غفلت ہے تو ان کی گمراہی سرکشی۔ اس لئے اس اعراض کی سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ ان کی قوتوں کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔

سخت سزا کی وجہ ان کے معاملہ کی خصوصی نوعیت ہے۔ اللہ کی کتاب ان کے سامنے موجود ہے۔ رسول کی سنت ان کو راستہ دکھا رہی ہے۔ خدا کی نشانیاں ان کے سامنے کھلی ہوئی ہیں اس کے باوجود وہ جھوٹے الفاظ بول بول کر اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں والے ہو کر اندھے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے جرم کی شناعت کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔ اللہ کا غضب ان پر بھڑکتا ہے۔ ان کو یہ سخت ترین سزا دی جاتی ہے کہ ان کی عقل کو الٹ دیا جاتا ہے۔ ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ چیزوں کی حقیقت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سیدھی بات ان کو الٹی نظر آتی ہے اور الٹی بات سیدھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت ان کے لئے روشنی کا کام دے سکے۔

آدمی کی عقل ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی نیک و بد کو سمجھتا ہے۔ ایک راہ کو چھوڑنے اور دوسری راہ کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب عقل کو الٹ دیا جائے تو پھر وہ کسی معاملہ کی حقیقت کو کس طرح سمجھے گا۔ اس کے بعد آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ گمراہیوں میں بھٹکتا رہتا ہے، حق کی کوئی آواز اس کی اصلاح کے لئے کارگر ثابت نہیں ہوتی —— وہ تعمیر ملت کے نام پر بے معنی چیخ پکار میں مشغول ہوتا ہے اور ساری تاریخ اس کو یہ سبق دینے سے عاجز رہتی ہے کہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار سے کبھی کسی قوم کی تعمیر نہیں ہوتی۔ وہ سیاسی مظاہروں کو حق کی شہادت کا نام دیتا ہے اور تمام انبیاء کا اسوہ اس کو یہ بتانے کے لئے ناکافی ثابت ہوتا ہے کہ شہادت کا کام آخرت

کی گواہی دینا ہے نہ کہ سیاسیات اور معاشیات کی گواہی دینا۔ وہ لفظوں کے ورد سے جنت کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے اور خدا کی کتاب اپنی تمام وضاحتوں کے باوجود اس کو بتا نہیں پاتی کہ جنت کسی آدمی کو جنت والے عمل سے ملتی ہے نہ کہ صرف لسانی اوراد سے۔

یہی حال رفتہ رفتہ اس کی تمام دینی دلی سرگرمیوں کا ہو جاتا ہے — وہ خود ساختہ موشگافیوں کو دینی تعلیم قرار دیتا ہے اور رسول اور اصحاب رسول کی پوری زندگی اس کو یہ بتانے میں ناکام رہتی ہے کہ دینی تعلیم کتاب اللہ کے حقائق و معارف کو ذہن میں اتارنے کا نام ہے نہ کہ ایسے مسائل میں لامتناہی بحث جاری رکھنے کا جن سے کتاب و سنت ناآشنا ہوں۔ وہ خود ساختہ عملیات اور وظائف پر روحانی ترقی کی عمارت کھڑی کرتا ہے اور یہ واقعہ اس کی آنکھ کھولنے والا ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کے رسول نے اپنے اصحاب کو روحانی ترقی کا جو طریقہ بتایا اس میں اس قسم کے عملیات و وظائف کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ دنیوی حقوق و مطالبات پر ملی سیاست کا بازار گرم کرتا ہے اور یہ عظیم حقیقت اس کے قدموں کو نہیں روکتی کہ اللہ کے پیغمبروں کا اسوہ جو اللہ کی کتاب میں بیان ہوا ہے اس کے یہ سراسر خلاف ہے کہ داعی گروہ اپنی مدعو قوم سے دنیوی مفادات کے جھگڑے چھیڑ دے۔ وہ سیاسی اقتدار قائم کرنے کو امت مسلمہ کا اصل مشن بتاتا ہے اور یہ واقعہ اس کے یقین میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کرتا کہ آسمانی کتاب کے پورے متن میں کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جس کے عبارت النص سے یہ حکم نکلتا ہو کہ "اے مسلمانو تمہارا نصب العین یہ مقرر کیا گیا ہے کہ تم دنیا بھر میں اپنی سیاست کا جھنڈا گاڑ دو"۔ وہ "نظام اسلام" کا نام لے کر مسلم آبادیوں میں توڑ پھوڑ مچاتا ہے اور یہ حقیقت اس کے جوش تخریب میں کمی کرنے والی ثابت نہیں ہوتی کہ خدا کا پیغمبر سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس بات کو اس نے مطلق حرام قرار دیا تھا کہ کوئی بھائی اپنے دوسرے بھائی کی جان و مال پر دست درازی کرے۔

جب کسی گروہ کی عقل الٹ جائے تو اس کو نہ حق حق کی صورت میں دکھائی دے گا اور نہ باطل باطل کی صورت میں۔ دلائل اس کو بے وزن معلوم ہوں گے کھلی ہوئی نشانیاں اس کے سامنے آئیں گی مگر وہ اس کو دکھائی نہ دیں گی۔ الٹی باتیں اس کو سیدھی نظر آئیں گی اور جو سیدھی بات ہے وہ اس کو الٹی دکھائی دے گی۔ اس کا حال ان لوگوں جیسا ہو جائے گا جن کی نشاندہی قرآن میں ان لفظوں میں کی گئی ہے:

وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بہا۔ وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا۔ وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا۔ ذلک بانہم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنہا غفلین (اعراف ۱۴۶)	اور اگر وہ دیکھیں ساری نشانیاں یقین نہ کریں ان کو۔ اور اگر دیکھیں راہ سنوار کی وہ نہ ٹھیرائیں اس کو راہ۔ اور اگر دیکھیں راہ الٹی اس کو ٹھیرائیں راہ۔ یہ اس واسطے کہ انھوں نے جھوٹ جانیں ہماری نشانیاں اور ہو رہے وہ ان سے غافل۔

ایک آیت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ کے آخر میں خدا کی رحمتوں کا ذکر ہے۔ خدا نے زمین کو انتہائی محکم قانون کے تحت گھمار کھاہے جس سے رات دن اور موسم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز انتظام کے تحت بارش برسا تا رہتا ہے۔ وہ زمین پر انسان کے لئے طرح طرح کا رزق پیدا کرتا ہے۔ وہ سمندر کے کھاری پانی کو میٹھا بنا کر ہماری ضروریات پوری کرتا ہے۔ ایک عجیب وغریب حیاتیاتی نظام کے تحت وہ ہم کو اولاد عطا کرتا ہے۔ اس نے زمین و آسمان کی وسیع کائنات کو حیرت انگیز طور پر ہمارے موافق بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

الرحمٰن فسئل بہ خبیرا	وہ بڑی رحمت والا ہے، اس کی شان (رحمت) کسی جاننے والے سے پوچھو۔
(الفرقان ۵۹)	

قرآن کی یہ آیتیں توحید اور آخرت کے اثبات میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس کائنات میں اتنے کامل طور پر رحمت و قدرت کا نظام قائم ہو اس کے بارے میں یہ گمان کرنا بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا خدا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ یا اس کا خاتمہ عدل پر نہ ہو گا، اور وہ یوں ہی بے انجام طور پر ختم ہو جائے گی۔

اس ذیل میں فرمایا کہ کائنات میں خدا کی رحمت و قدرت کے نظام کا حال کسی جاننے والے سے پوچھو۔ یعنی جو شخص کائنات میں غور و مشاہدہ کر رہا ہو، جس نے کائنات کے نظام میں جھانک کر دیکھا ہو اس سے اس کی تفصیلات پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ یہ کائنات کیسی کائنات ہے۔ اور اس میں انسان کے لئے کیسے کیسے قیمتی انتظامات کئے گئے ہیں۔

اس کا مصداق موجودہ زمانہ میں سائنس داں بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سائنس داں جنھوں نے زمین و آسمان کے نظام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کی حکمت و معنویت کو اس قدر حیران کن انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان کو سن کر اور پڑھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوں اور اس کے ایمان میں اضافہ ہو جائے (ملاحظہ ہو، مذہب اور جدید چیلنج صفحہ ۸۲ - ۱۸۰)

واضح ہو کہ اس آیت میں سوال کا تعلق اللہ کی "رحمانیت" کو پوچھنے سے ہے نہ کہ دین حق کی بابت

پوچھنے سے۔ اللہ کی رحمانیت کے واقعات آپ کسی بھی عالم کائنات سے پوچھ سکتے ہیں۔ مگر اللہ کا دین تو صرف پیغمبر ہی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اب قیامت تک کے لئے اللہ کے مستند پیغمبر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

"جاننے والے سے پوچھو" ایک عام لفظ ہے۔ جب بھی کسی کلام میں یہ لفظ آئے تو دیکھنا ہوگا کہ کس چیز کے بارے میں پوچھنا مراد ہے۔ جس چیز کی بابت پوچھنا مطلوب ہے اسی چیز کے جاننے والے سے پوچھنا مراد ہوگا نہ کہ کسی دوسری چیز کے جاننے والے سے۔

اس قسم کا سوالیہ اسلوب قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورہ انبیاء میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین یہ کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں (ھل ھٰذا الا بشر مثلکم) پھر وہ خدا کے پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ نبی عربی سے پہلے جس کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا انسانوں ہی میں سے بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ پس سابق اہل کتاب سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے (فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون)

اس آیت میں اہل ذکر سے مراد یہود ہیں۔ قریش سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم کو یہ شبہ ہے کہ رسول انسان کیسے ہو سکتا ہے تو یہود سے پوچھ لو۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ ان کے یہاں کثرت سے پیغمبر آتے رہے ہیں۔ وہ تم کو بتائیں گے کہ ان کے یہاں جتنے پیغمبر آئے سب انسان ہی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی فرشتہ یا اور کوئی غیر انسانی مخلوق نہ تھا۔

یکساں برتاؤ

ویل للمطففین۔ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون۔ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ الا یظن اولئك انھم مبعوثون۔ لیوم عظیم۔ یوم یقوم الناس لرب العلمین۔ (المطففین)

خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ وہ لوگ کہ جب دوسروں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں۔ اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں، اس دن جب کہ تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے

دوسروں کو ان کے حق سے کم کر کے دینا برا ہے۔ مگر دوسروں سے لیتے وقت پورا پورا لینا اور اپنے پاس سے دوسروں کو دینا ہو تو کمی کر کے دینا اور بھی زیادہ برا ہے۔ جو آدمی ایسا کرے وہ خدا کی نظر میں سخت گنہ گار ہے۔ ایسا آدمی گویا خود ہی اپنے جرم کو ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کا عمل بتا رہا ہے کہ وہ انصاف اور ناانصافی کے فرق کو جانتا ہے۔ ظلم کا ظلم ہونا اس پر بخوبی واضح ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ذات کے لئے کم ملنے کے بارہ میں اتنا حساس کیوں ہوتا۔ جو دکان دار خریدتے ہوئے پورا تول کر لے اور بیچتے ہوئے کم تول کر دے، اس کے بدترین مجرم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ظاہر الفاظ کے مطابق اس آیت میں لین دین کو صحیح رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں انسان کی ایک نفسیاتی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور وہ ہے اپنے لئے کچھ پسند کرنا اور دوسروں کے لئے کچھ۔

وہ سارے لوگ اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں جن کا حال یہ ہو کہ وہ دوسروں کی عزت نہ کریں اور خود یہ چاہیں کہ ان کی عزت کی جائے۔ جو خود کسی کو سلام نہ کریں مگر یہ چاہیں کہ لوگ انہیں سلام کریں۔ جو دوسروں کے ساتھ کبھی انصاف نہ کریں مگر اپنے لئے یہ چاہیں کہ لوگ ان کے ساتھ مکمل انصاف کریں۔ خود وعدہ خلافی کریں تو انہیں کوئی احساس نہ ہو مگر جب دوسرا ان کے ساتھ وعدہ خلافی کرے تو بپھر اٹھیں۔ وہ دوسروں سے خدمت لینے کو اپنا حق سمجھیں مگر دوسرے کی خدمت کرنا انھیں بالکل یاد نہ رہے۔ مزدور سے کام لیتے ہوئے یہ چاہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرے مگر اجرت دیتے وقت یہ چاہیں کہ کم سے کم اجرت دینی پڑے۔ وہ دوسروں کو بے فکری کے ساتھ ستائیں مگر جب انھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو چیخ اٹھیں۔

انسانی زندگی کے لئے خدا کا پسندیدہ اصول یہ ہے کہ آدمی کا جو برتاؤ لینے میں ہو۔ وہی اس کا برتاؤ دینے میں ہو۔ جو آدمی اس کے خلاف عمل کرے وہ خدا کے نقشے کے خلاف چل رہا ہے۔ اور خدا کے نقشے کے خلاف چلنے والے کے لئے خدا کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

تحریکیں ناکام کیوں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے جو تحریکیں اٹھائیں۔ وہ سب کی سب اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اس کا سبب مذکورہ آیت کی روشنی میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ان تحریکوں کے لیڈر دوسروں سے اپنے خلاف جس ظلم کی شکایت کر رہے تھے وہ خود دوسروں کے خلاف وہی ظلم کر رہے تھے۔ قرآن کے مطابق ایسے لوگوں کے لئے اس دنیا میں خدا کا غضب ہے نہ کہ خدا کی نصرت۔

الرسالہ مارچ ۱۹۸۳ صفحہ ۴۴ پر ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اگرچہ کسی کا نام نہیں لیا گیا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے کچھ لیڈر جو اپنے اعلان کے مطابق، قوم کے خلاف ظالموں کے ظلم کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں، انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی زد ان کے اوپر پڑ رہی ہے ان کے آدمی ہمارے دفتر میں آئے۔ وہ بے حد مشتعل تھے۔ انہوں نے ہم کو برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں۔ ہم تمہارے اوپر مقدمات چلائیں گے، ہم تم کو نکال باہر کریں گے۔ ہم تمہارا خاتمہ کر دیں گے، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ میرے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ تو بعد کی بات ہے۔ آپ دیکھئے کہ اپنے اس طرز عمل سے آپ خود اپنے کو کس خانہ میں ڈال رہے ہیں۔ آپ ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کا معیار اپنے لئے کچھ ہے اور دوسروں کے لئے کچھ۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کو ہمارے ایک مضمون سے شکایت پیدا ہو گئی حالانکہ اس میں آپ کا نام شامل نہ تھا۔ ایسے صرف ایک مضمون کی بنا پر آپ ہم سے اتنا بگڑے ہوئے ہیں کہ ہم کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔ پھر جن لوگوں کو آپ ظالم کہتے ہیں ان کے پاس تو آپ کے خلاف اس سے بہت زیادہ بڑی بڑی شکایتیں موجود ہیں۔ یہ لوگ جو ظلم کر رہے ہیں وہ بھی یوں ہی بلا سبب نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ مختلف قسم کی شکایتوں اور ناراضگیوں کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ پھر آپ کے لئے معمولی شکایت کی بنا پر کسی کو برباد کرنے کا منصوبہ بنانا اگر جائز ہے تو وہی دوسرے لوگوں کے لئے ناجائز کیوں ہو۔ یہ تضاد موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈروں میں موجود ہے اور یہی تضاد ان کی تمام تحریکوں کو بے نتیجہ بنائے ہوئے ہے۔

دور جدید کا شرک

مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۲ - ۱۹۵۶) نے لکھا ہے: پہلوں کی عقلوں کو سورج کی شعاعوں اور آگ کے شعلوں نے اگر چندھیایا تھا تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، ایٹم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے۔ بزرگوں کے کارنامے، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر میں کھدی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا تو کیا پچھلوں کے لیڈروں نے اور قائدوں کے کارناموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے (النبی الخاتم صفحہ ۱۵۶)

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ نہیں مانتے۔ مگر جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ بھی اکثر مشرکانہ انداز میں اس کو مانتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جس طرح دوسرے معاملات میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح شرک کی صورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ قدیم شرک کی بنیاد اگر توہمات پر تھی تو جدید شرک کی بنیاد علم اور تہذیب پر ہے۔ بہت سے لوگ صورتوں کی تبدیلی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شرک میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیجئے تو وہ بھی معروف مشرکوں سے کم مشرک نظر نہیں آئیں گے۔

خدا کو ماننے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک فطری سطح اور دوسرے شعوری سطح۔ خدا انسان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ وہ فطرت انسانی میں ہر دوسری چیز سے زیادہ پیوست ہے۔ اس لئے آدمی ہر حال میں خدا کو ماننے پر مجبور ہے۔ حتیٰ کہ غافل اور ملحد انسان بھی نازک لمحات میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ مگر یہ سب فطری سطح پر خدا کا اقرار ہے۔ اور فطری سطح پر خدا کا اقرار معتبر نہیں۔ خدا کا اقرار صرف وہ معتبر ہے جو شعور کی سطح پر پیدا ہوا ہو۔

مشرک انسان کا معاملہ یہی ہے۔ وہ فطرت کی سطح پر خدا کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ مگر وہ شعور کی سطح پر خدا کا یقین نہیں کر پاتا۔ اس لئے خدا کے رسمی اقرار کے ساتھ وہ کچھ اور ہستیاں بنا لیتا ہے جن سے وہ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وابستہ کر سکے۔ خدا کو اگرچہ وہ مانتا ہے۔ مگر خدا صرف اس کے رسمی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے، وہ اس کے شعور کا جزء نہیں ہوتا۔ وہ بظاہر خدا کو مانتا ہے مگر وہ اس کے شعور اور احساس میں ایک زندہ حقیقت کے طور پر شامل نہیں ہوتا۔ وہ اس کے فکر و عمل میں روح بن کر نہیں دوڑتا۔ اس کے شعور کو زندہ یقین اس کے مفروضہ خداؤں سے ملتا ہے۔ اس کے احساس کو تر و تازہ تڑپ ان ہستیوں سے ملتی ہے جن کو اس نے محسوس طور پر اپنے سامنے بٹھا رکھا ہے۔ خدا اس کے روایتی عقیدہ کا جزء ہوتا ہے اور شرکاء

اس کے جیتے جاگتے ذہن کا جزء ہوتے ہیں۔

شرک کسی صورت کا نام نہیں بلکہ حقیقت کا نام ہے۔ اور انسان اتنا ظاہر پسند ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی محسوس خدا گھڑ لیتا ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہوئے بھی عملاً دوسروں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اتنا ہی مشرک ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ اگرچہ آج کے دیوتاؤں کے نام کچھ اور ہیں اور پہلے کے کچھ اور۔

توحید یہ ہے کہ آدمی اپنی عقیدت اور اپنے اعتماد کے جذبات کو صرف ایک خدا کے ساتھ وابستہ کر دے۔ اور شرک یہ ہے کہ وہ زبان سے تو خدا کو خدا کہے۔ مگر اس کی حقیقی توجہ اور دلچسپیاں خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ لگی ہوئی ہوں۔

موجودہ زمانہ میں بت کی پرستش بہت سے لوگوں نے چھوڑ دی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شرک ختم ہو گیا ہے۔ شرک اب بھی پوری شان کے ساتھ لوگوں کے یہاں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج پتھر کے بت کے بجائے دوسری چیزیں پوجی جاتی ہیں۔ بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اعلیٰ ترین جذبات کا مرکز اپنے قائدوں اور رہنماؤں کو بنا رکھا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے اداروں اور اپنی جماعتوں کے ساتھ وہی قلبی وابستگی رکھتے ہیں جو خدا کے ساتھ ہونی چاہئے۔ بہت سے لوگ اپنے ملک اور اپنی قوم کو خدا کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لئے معیار زندگی اور مادی ترقیاں وہی برتر مقام حاصل کئے ہوئے ہیں جو خدا کا مقام ہونا چاہئے۔

موجودہ زمانہ میں بت پرستی کا شرک زیادہ تر عوام میں باقی رہ گیا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کا شرک شخصیت پرستی اور مادہ پرستی ہے۔ لوگ خدا کو مانتے ہوئے اپنی محبوب شخصیتوں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ وہ زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں مگر عملاً ان کی ساری گرویدگی صرف مادی مصلحتوں اور دنیوی مفادات سے ہے۔

توحید کا پرستار وہ ہے جس کے جذبات خدا سے اتنا زیادہ وابستہ ہو جائیں کہ اس کی تنہائیاں خدا کی یاد میں بسر ہوتی ہوں۔ اس کو خدا کے تذکرہ سے لذت ملتی ہو۔ وہ اپنی صبح و شام کی زندگی میں خدا کو سب سے اونچا مقام دئے ہوئے ہو۔ اس کی نظر میں خدا کے سوا ہر دوسری چیز ہیچ بن گئی ہو۔ وہ سب کچھ خدا کے حوالے کر کے اپنے آپ کو اس کے لئے خالی کر لے۔

موحد صرف اللہ والا ہوتا ہے اور مشرک اللہ کے ساتھ دوسروں والا بھی۔

شرک خفی

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوش ہو جاتے ہیں" زمر۔ ۴۵

آلوسی بغدادی نے اس آیت کی تفسیر میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک مرے ہوئے بزرگ کو پکار رہا ہے۔ انھوں نے کہا، اے شخص! خدا کو پکار۔ وہ خود فرماتا ہے کہ واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (بقرہ) ان کی یہ بات سن کر آدمی سخت غصہ میں آگیا۔ بعد کو لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ کہتا تھا کہ "آلوسی اولیاء کے منکر ہیں"۔ کچھ لوگوں نے اس کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلد سن لیتے ہیں۔

یہ ذہنیت کبھی کھلی کھلی غیر اللہ پر اعتماد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کو شرک جلی کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ ذہنیت شرک خفی کی صورت میں ہوتی ہے جس کو آج کل کی زبان میں شخصیت پرستی کہا جا سکتا ہے۔ آپ کثرت سے ایسے مذہبی حلقے پائیں گے جہاں بظاہر "اللہ اللہ" کا ورد ہوتا ہے اور قرآن پڑھا پڑھایا جاتا ہے، لیکن اگر وہاں کی مجلسوں میں خدا کی باتوں کا چرچا کیجئے تو لوگوں کو کوئی خاص دل چسپی نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے چرچے رات دن ہوتے رہتے ہیں اور اس سے ان کی دل چسپی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اکثر حالات میں شرک خفی، شرک جلی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بظاہر برا نہ دکھائی دینے کی وجہ سے اکثر لوگ اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو شرک جلی کے خلاف لسانی اور قلمی جہاد ہی کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں (البقرہ ۱۶۵) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے (التوبہ ۱۸) اس سے معلوم ہوا کہ توحید یہ ہے کہ شدید محبت اور شدید خوف کا تعلق صرف ایک اللہ سے ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ آدمی اپنی شدید محبت اور اپنے شدید خوف کا مرکز اللہ کے سوا کسی اور کو بنائے، خواہ وہ کوئی زندہ ہو یا مردہ۔

اس معیار پر جانچئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لوگ جو اپنے کو شرک سے محفوظ سمجھتے ہیں وہ دراصل کچھ علامات شرک سے محفوظ ہیں نہ کہ فی الواقع حقیقت شرک سے۔

نسئ اور کبیسہ کا فرق

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک اعتراض کرتا ہے۔ بظاہر دیکھنے والوں کو اس کا اعتراض درست نظر آتا ہے۔ مگر جب گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اعتراض محض ایک سرسری رائے زنی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی واقعی اعتراض۔ وہ الفاظ کا ایک مجموعہ تھا نہ کہ معانی کا اظہار۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرًا فی کتاب اللہ یوم خلق اللہ السموات و الارض منھا اربعۃ حرم ذلک الدین القیم فلا تظلموا فیھن انفسکم وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ انما النسئ زیادۃ فی الکفر یُضَلُّ بہ الذین کفروا یحلونہ عاما ویحرمونہ عاماً لیواطئوا عدۃ ماحرم اللہ فیُحِلّوا ماحرم اللہ زین لھم سوء اعمالھم واللہ لا یھدی القوم الکافرین (التوبہ ۳۷-۳۶)

مہینوں کا شمار کتاب الٰہی میں اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس روز اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں۔ یہی دین قیم ہے۔ پس تم ان میں اپنا نقصان نہ کرو۔ اور مشرکین سے سب سے لڑو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑ رہے ہیں۔ اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ مہینوں کو ہٹانا کفر کی بڑھائی ہوئی بات ہے جس سے اہل کفر گمراہ کئے جاتے ہیں کہ وہ حرام مہینہ کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام رکھتے ہیں تاکہ اللہ نے جو مہینے حرام کئے ہیں ان کی گنتی پوری کر لیں۔ پھر وہ اللہ کے حرام کئے ہوئے کو حلال کر لیتے ہیں۔ اور اللہ منکروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت میں نسیئ (مہینوں کو ہٹانے) کا جو ذکر ہے اس پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ ایک فلکیاتی مسئلہ کو غیر ضروری طور پر کفر و اسلام کا مسئلہ بنانا ہے۔ انھوں نے اسے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق بنانے کے معنی میں لیا۔ اور پھر کہا کہ اس معاملہ کا اسلام اور کفر سے کیا تعلق۔ مگر یہ اعتراض نسئ اور کبیسہ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں نسئ کو زیادۃ فی الکفر کہا گیا ہے نہ کہ کبیسہ کو۔ اگرچہ نسئ میں بھی مہینوں کو ہٹانے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور کبیسہ میں بھی مہینوں کو ہٹانے کا۔ مگر دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نسئ سے مراد حرام مہینہ کو اس کی جگہ سے ہٹا کر غیر حرام مہینہ کو وہاں رکھنا ہے۔ جب کہ کبیسہ کا مطلب یہ ہے کہ قمری مہینوں کے دنوں میں اضافہ کر کے یا اس کو ہٹا کر شمسی مہینوں کے برابر کر لیا جائے۔ اول الذکر ایک مذہبی معاملہ ہے۔ اور دوسرا

خالص شماریاتی معاملہ۔

ابراہیمی شریعت میں سال کے چار مہینے (ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب) حرام مہینے قرار دیے گئے تھے۔ ان مہینوں میں لڑائی اور خوں ریزی مطلق طور پر ممنوع تھی۔ بعد کے زمانہ میں جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے نسئی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نسئی کے لفظی معنی ہیں ہٹانا، چنانچہ جب کوئی قبیلہ کسی وجہ سے دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرنا چاہتا اور وہ حرام مہینہ ہوتا تو قبیلہ کا سردار یہ اعلان کر دیتا کہ امسال ہم نے فلاں مہینہ کو ہٹا دیا ہے۔ مثلاً محرم کو حرام مہینوں سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا ہے اور صفر کو اس کی جگہ سے ہٹا کر وہاں محرم کا مہینہ رکھ دیا ہے۔ یہ نسئی ہے اور اسی کو قرآن میں زیادۃٌ فی الکفر کہا گیا ہے۔

۱۔ کبیسہ اس کے برعکس ایک خالص کلینڈر کا معاملہ ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ شمسی گردش کے مطابق سال ¼ ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارا سال ۳۶۵ دن کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ¼ دن جمع ہو کر چوتھے سال ۳۶۶ دن بن جاتے ہیں۔ سال کبیسہ اس سال کو کہتے ہیں جو ۳۶۶ دن کا ہو۔ اس بنا پر ہر چوتھے سال شمسی کلنڈر میں فروری کا مہینہ ۲۹ دن کا کر دیا جاتا ہے تاکہ سال کے ایام برابر کئے جا سکیں۔

سال کبیسہ چونکہ ہمیشہ چار سال پر پیش آتا ہے، اس لئے اس کی سادہ پہچان یہ ہے کہ اس کا عدد ٹھیک چار پر برابر برابر تقسیم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۰، ۱۹۸۴ وغیرہ۔ یہ وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں لوند کا سال (Leap Year) کہا جاتا ہے۔

۲۔ کبیسہ کی دوسری صورت وہ ہے جو قمری مہینوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ۳۵۴ دنوں کا قمری سال شمسی سال سے ۱۱ دن کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ہر ۳۳ سال میں ایک سال کا اور ہر ایک صدی میں ۳ سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس فرق کو ختم کرنے کے لئے کچھ قوموں نے دنوں کے اضافہ (Intercalation) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ ہر سال قمری مہینوں میں ایک ایک دن کا اضافہ کر کے سال میں گیارہ دن بڑھا لیتے ہیں اور اس طرح قمری کلنڈر کو شمسی کلینڈر کے مطابق کر لیتے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں جو چیز منع کی گئی ہے وہ سادہ طور پر صرف مہینوں کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ خدا کے حرام کو حلال کرنے کے لئے مہینوں میں تبدیلی ہے۔ گویا اصل برائی حرام و حلال کے قوانین کو بدلنا ہے نہ کہ محض مہینوں کو (کیلنڈر کی درستگی کے لئے) بدلنا۔

اختلافات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات میں اپنے رب کو دیکھا یا نہیں دیکھا، اس کے بارے میں صحابہ کے درمیان دو رائیں ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور اکثر صحابہ رویت کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معراج کی رات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو اسی طرح دیکھا جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دیکھتا ہے۔

مگر حضرت عائشہ کا خیال اس کے برعکس تھا۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا نے معراج میں اپنے رب کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ تم نے ایسی بات اپنے منہ سے نکالی ہے کہ میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں ایسی ہیں کہ جو بھی ان کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو تم سے کہے کہ محمد نے اپنے رب کو دیکھا اس نے جھوٹ کہا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (الانعام ۱۰۳)

اتنے نازک معاملہ میں اتنے بڑے اختلاف کے باوجود صحابہ کے درمیان نہ جھگڑے پیدا ہوئے اور نہ فرقے بنے۔ ان کا اختلاف اظہار رائے کے دائرے میں رہا، اس سے آگے نہ جا سکا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسی رویت باری کے مسئلے پر زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں اور مسلمان مستقل طور پر دو فرقوں میں بٹ گئے۔ جن میں سے ایک معتزلہ کہلائے اور دوسرا وہ جس کو اہل سنت کہا جاتا ہے۔ اہل سنت نے اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اگرچہ معتزلہ کو ختم کر دیا تاہم تاریخ اور دینیات میں ان کا غلغلہ ابھی تک جاری ہے۔

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی (النساء ۹۳) اس آیت کی بنیاد پر حضرت عبد اللہ ابن عباس حضرت زید ابن ثابت اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا خیال تھا کہ جو شخص بالارادہ کسی مومن کو قتل کر دے اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ سعید ابن جبیر تابعی کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ ابن عباس سے پوچھا کہ جو شخص کسی مومن کو بالقصد قتل کر دے اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ عبد اللہ ابن عباس نے جواب دیا کہ نہیں۔ سعید ابن جبیر نے سورہ فرقان کی آیت نمبر ۷۰ ۔ ۶۸ سے استدلال کرتے ہوئے اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عبد اللہ ابن عباس نے کہا، یہ آیت مکی ہے جس کو مدنی آیت نے منسوخ کر دیا۔

تاہم صحابہ کی اکثریت کا یہ خیال تھا کہ قاتل کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے کیوں کہ قتل بہر حال

کفر سے زیادہ سخت جرم نہیں۔ پھر جب کفر معاف ہو سکتا ہے تو قتل کیوں نہیں معاف ہو سکتا۔ جب کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، کہو جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر وہ باز آجائیں تو ان کا پچھلا سب کچھ معاف کر دیا جائے گا۔ (انفال ۳۷)

انسانوں کے درمیان اختلافات ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ لوگ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت کیوں نہ ہوں، ان کے درمیان اختلافات ہوں گے۔ اختلافات کو ختم کرنا مطلوب نہیں ہے۔ البتہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ اختلافات کا اثر آدمی کے اخلاق اور برتاؤ پر نہ پڑے۔

صحابہ کے درمیان بہت سے بڑے بڑے اختلافات تھے جس کی چند مثال اوپر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان آپس میں کدورت پیدا نہیں ہوئی۔ مگر یہی وہ اختلافات تھے جن کی بنیاد پر بعد کے زمانہ میں ایسے فرقے بنے جو کبھی ختم نہ ہو سکے۔

ایک اختلاف اور دوسرے اختلاف میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے اور ان کے بعد ان کا نام لینے والے مردہ لوگ۔ صحابہ کرام کا ایمان شعوری ایمان تھا اور بعد کے لوگوں کا ایمان صرف وراثتی ایمان۔ صحابہ کرام اختلاف اور اتفاق کے حدود کو جانتے تھے۔ اور بعد کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اختلاف کے حدود سے بھی ناواقف ہیں اور اتفاق کے حدود سے بھی ناواقف۔

ایک انسان اور دوسرے انسان میں مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ اب ایک طرف یہ مسئلہ ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں اجتماعیت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ پھر اختلاف کے باوجود اجتماعی اتحاد کے مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔

اس کی ایک ہی قابل عمل صورت ہے۔ وہ یہ کہ ہر آدمی اختلاف کے باوجود متحد ہونے پر راضی ہو جائے۔ ہر آدمی شعوری طور پر یہ طے کرلے کہ وہ اختلاف کو صرف ذہنی اختلاف کے درجہ میں رکھے گا۔ اس کو عملی رکاوٹ یا قلبی بدمزگی تک نہیں جانے دے گا۔

یہ وہ اصول ہے جس پر ہر آدمی اپنے گھر اور خاندان کے اندر روزانہ رہتا ہے۔ اسی فطری اصول کو گھر سے باہر کی زندگی میں اختیار کر لینے کا نام اتحاد ہے۔ آدمی اپنے گھر کے نظم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ گھر کے اندر "اختلاف کے باوجود اتحاد" کے اصول پر کاربند رہتا ہے۔ یہی جذبہ گھر کے باہر کے لئے پیدا ہو جائے تو یہاں بھی وہ اختلاف کے باوجود اتحاد پر قائم رہے گا۔

غیر مشرکین کا شرک

قدیم زمانہ میں اللہ کے جو پیغمبر اٹھے ان سب کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ہر ایک کو ان کے مخاطبین نے رد کر دیا۔ ان کو حقیر جانا، ان کی مخالفت میں ہر وہ جارحانہ کارروائی کی جو وہ کر سکتے تھے۔

یہ مخالفت اس قسم کی نہیں تھی جو موجودہ زمانہ میں ان ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے جہاں کوئی ڈکٹیٹر حکومت کے تخت پر قابض ہو۔ اس مخالفت کی وجہ سیاسی نہیں بلکہ تمام تر نفسیاتی تھی۔ لوگوں نے غیر خدا کے ساتھ اپنے قلبی جذبات کو وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کسی غیر خدا کو عظمت اور تقدس کا مقام دیے ہوئے تھے۔ جب پیغمبر ایک خدا کی معبودیت کا اعلان کرتا اور دوسرے تمام معبودوں کو بے حقیقت قرار دیتا تو اس سے لوگوں کے دل پر چوٹ پڑتی، وہ اپنے بت کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

قرآن سے یہ ثابت ہے کہ خدا کے جتنے پیغمبر آئے سب کا مشترک پیغام یہ تھا کہ اے لوگو، ایک خدا کو اپنا الٰہ بناؤ اور اسی کی عبادت کرو (اعبدوا اللّٰہ مالکم من الٰہ غیرہ) یہ واضح طور پر ایک غیر سیاسی تعلیم تھی۔ اس سے مراد یہ تھا کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے اور اسی سے محبت کرے۔ صرف ایک خدا کو وہ اپنی عقیدت اور توجہ کا مرکز بنا لے۔

کسی انسان کی زندگی میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوچ اور جذبات کا مرکز کس کو بناتا ہے۔ جس ہستی کو آدمی اس طرح اپنا مرکز توجہ بنائے وہی اس کا معبود ہے۔ پیغمبر یہ بتانے کے لئے آئے کہ موجودہ دنیا میں جو شخص اپنی توجہات کا مرکز خدا کو بناتا ہے وہی ہدایت پر ہے اور موت کے بعد کی زندگی میں وہی کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی توجہات کا مرکز کسی اور کو بنائے وہی وہ شخص ہے جو راہ سے بے راہ ہو گیا۔ اس کے لئے آخرت میں خدا کا انعام پانا مقدر نہیں۔

خدا کے سوا جن چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنایا جاتا ہے وہ عام طور پر چند ہیں۔

۱۔ فطرت کے نمایاں مظاہر، مثلاً سورج، چاند، ستارے وغیرہ

۲۔ قوم کے اکابر۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو تاریخی اسباب کے تحت "بڑا" سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کے گرد عظمت و تقدس کی فرضی داستانیں جمع ہونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی ایک افسانوی تصویر بن جاتی ہے، جس کا ابتدائی حقیقی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۲ ۔ یہی معاملہ کبھی قومی تاریخ کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جن لوگوں کا ماضی شاندار رہا ہو، وہ بعد کے دور میں عام طور پر اپنی تاریخ کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے ان کی قومی تاریخ حرکت کا سرچشمہ (Source of inspiration) بن جاتی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے سچے مومن کے لئے اس کا عقیدۂ خدا اس کے لئے حرکت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اس قسم کی تمام صورتیں شرک کی صورتیں ہیں۔ پیغمبر چونکہ غیر خدا کی پرستش کے تمام طریقوں کو غلط قرار دیتے ہیں اور ان کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں، اس لئے لوگ ان سے بگڑ جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی مخالفت حقیقۃً اسی قسم کے جھوٹے معبودوں پر تنقید کی بنا پر ہوتی تھی نہ کہ کسی سیاسی وجہ سے۔ آج بھی یہ منظر ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ آج اگرچہ مظاہر فطرت کی پرستش کم ہو گئی ہے تاہم بقیہ دونوں پرستشیں پورے عروج پر ہیں۔ کہیں اپنے اکابر کی اور کہیں قومی تاریخ کی۔ آج بھی بے شمار لوگ مشرکانہ نفسیات میں مبتلا ہیں۔ خواہ بظاہر وہ اپنے آپ کو مشرک نہ مانتے ہوں۔

کسی شخص کا معبود کیا ہے، اس کی خاص پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ سب سے زیادہ کس کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایک شخص سب سے زیادہ جس چیز کا تذکرہ کرتا ہو، جس کو بڑھا کر کے اسے لذت ملتی ہو، جس کی یاد سے اس کی روح غذا پاتی ہو، وہی اس کا معبود ہے۔ جس شخص کی زندگی میں یہ مقام خدا کو حاصل ہو وہ موحد ہے اور جس کی زندگی میں خدا کے سوا کوئی اور یہ مقام حاصل کر لے وہ مشرک۔

لوگ خدا کے سوا جس کو اپنا معبود بنا لیں اس کے خلاف وہ کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے۔ وہ اس وقت تک بالکل ٹھیک دکھائی دیتے ہیں جب تک ان کے مفروضہ معبودوں کو کچھ نہ کہا گیا ہو مگر جیسے ہی ان کی محبوب شخصیت پر تنقید کی جائے یا ان کی پر فخر تاریخ پر کوئی اظہار رائے کیا جائے، وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں پتھر کے بت ہوا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں نے نفسیاتی بت بنا لئے ہیں۔ آج کا انسان اپنے نفسیاتی بت کے ٹوٹنے پر اسی طرح شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ جس طرح قدیم زمانہ کے مشرک اپنے پتھر کے بتوں کے ٹوٹنے پر شدید ردعمل ظاہر کرتے تھے۔

جب آدمی دوسری چیزوں سے اس طرح محبت کرے جس طرح خدا سے محبت کرنا چاہئے، جب دوسری شخصیتوں سے اس کو وہ قلبی وابستگی ہو جائے جس کا حقدار صرف اس کا خدا ہے تو یہی غیر خدا کو اپنا خدا بنانا ہے۔ ایسے تمام لوگ خدا کے نزدیک شرک کے مجرم ہیں، خواہ دنیا میں بظاہر وہ دین اور توحید کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں۔

قال الرسول

فہم قرآن

فی صحیح البخاری من روایة ابی جحیفة وهب بن عبد الله السوائی۔ قال قلت لعلی بن ابی طالب رضی الله عنه۔ هل عندکم شئ من الوحی مما لیس فی القرآن۔ فقال لا والذی فلق الحبة وبرأ النسمة الا فهماً یعطیه الله رجلاً فی القرآن (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۷۷)

وہب بن عبد اللہ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالب سے پوچھا۔ کیا آپ کے پاس وحی الٰہی میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو پھاڑا اور جاندار کو وجود بخشا، ہمارے پاس کوئی مزید چیز نہیں سوا اس فہم کے جو اللہ ایک شخص کو قرآن میں عطا کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں ظاہری الفاظ کے سوا بھی ایک چیز ہے اور وہ اس کی گہری معنویت کا ادراک ہے، گویا ایک الفاظ قرآن ہے اور دوسرا فہم قرآن۔ قرآن کا لفظی حصہ اس کے ظاہری مطالعہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے معنوی حصہ کو پانے کے لئے غور وفکر ضروری ہے۔ گہرے تدبر کے بغیر کوئی شخص قرآن کے گہرے معانی کو نہیں جان سکتا۔

قرآن کے ظاہری پہلو کو جاننے کے لئے عربی دانی کی ضرورت ہے اور قرآن کے معنوی پہلو کو جاننے کے لئے خدادانی کی۔ اگر آدمی کو عربی زبان سے واقفیت ہو تو وہ قرآن کو پڑھ کر اس کے ظاہری مفہوم کو سمجھ لے گا۔ مگر قرآن کی معنوی گہرائیوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو خدا کی چھپی ہوئی تجلیات سے اپنی آنکھوں کو روشن کر چکا ہو۔

دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک قرآن وہ ہے جو آدمی کو لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں مل جاتا ہے۔ اور دوسرا قرآن وہ ہے جس کو اسے خود دریافت کرنا ہے۔ ایک قرآن وہ ہے جو آیتوں کا ترجمہ جاننے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا قرآن وہ ہے جس کو خود اپنی کوششوں سے پانا پڑتا ہے۔

آدمی اگر صرف "پہلے قرآن" کو پائے تو قرآن سے اس کا تعلق اوپری انداز کا ہوگا۔ وہ بے روح طور پر اس کو مانتا رہے گا۔ مگر جو شخص "دوسرے قرآن" کو پالے اس کو قرآن سے زندہ تعلق ہو جاتا ہے۔ قرآن اس کے لئے حرکت اور یقین کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ قرآن اس کے لئے ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جس میں وہ جئے، جس سے وہ اپنے لئے غذا حاصل کرے۔

ایمان بندے اور خدا کے درمیان اس اتصال کا قائم ہونا ہے جس کی ایک مادی مثال بلب اور پاور ہاؤس کے اتصال کی صورت میں ملتی ہے۔ بلب کا تعلق جب پاور ہاؤس سے قائم ہوتا ہے تو وہ اچانک چمک اٹھتا ہے، وہ وہ ہو جاتا ہے جو وہ پہلے نہیں تھا۔ اس کا اندھیرا اُجالے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بندہ جب اپنے رب کو حقیقی معنوں میں پاتا ہے تو اس کی ہستی خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ اس کے اندر ایسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو اس کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتے ہیں۔

صحابہ کرام کے لیے ایمان کا مطلب یہی تھا۔ صحابہ کرام کا ایمان ان کے لیے ایک زندگی سے نکل کر دوسری زندگی میں داخل ہونا تھا۔ یہ ان کے لیے تاریکی کے مقابلے میں روشنی کی دریافت تھی۔ حضرت حذیفہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: یارسول اللہ کنا فی جاھلیۃ وشر فجاءنا اللہ بھذا الخیر (اے اللہ کے رسول، ہم جاہلیت اور شر میں تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس خیر کو لے آیا)

اس طرح جو ایمان ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو روایتی یا تقلیدی طور پر کسی آدمی کو مل جائے۔ تقلیدی ایمان آدمی کو متحرک نہیں کرتا جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کو دائمی طور پر متحرک کر دیتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے آدمی کے اندر کوئی ذاتی نگاہ پیدا نہیں ہوتی۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر ذاتی نگاہ پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ چیزوں کو دیکھے اور خود اپنی بصیرت سے فیصلہ کر سکے۔

تقلیدی ایمان سے صرف جامد عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر انقلاب بن کر داخل ہوتا ہے، وہ آدمی کے فکر وعمل کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے بے جان افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ معرفت والے ایمان سے جاندار افراد ظہور میں آتے ہیں۔ اور جاندار افراد ہی وہ لوگ ہیں جو کہ تاریخ بناتے ہیں۔ جو انسانیت کے لیے کوئی نیا مستقبل ظہور میں لاتے ہیں۔

تقلیدی ایمان آدمی کو اپنی قوم سے ملتا ہے اور معرفت والا ایمان براہ راست اللہ تعالیٰ سے۔

معیاری دنیا

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند (Idealist) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ آئیڈیل دنیا کی تلاش میں رہتا ہے۔ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک تمام انسان اسی کھوج میں مبتلا رہے ہیں، کوئی ذہنی اور فکری طور پر اور کوئی عملی اور واقعاتی طور پر۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی مفکرین نے جب دیکھا کہ انسان آئیڈیل زندگی کی تلاش میں ہے تو انھوں نے اسلام کو آئیڈیل نظام کے روپ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آئیڈیل نظام بن ہی نہیں سکتا۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اگر نیک لوگوں کو آزادی ہے تو یہاں برے لوگوں کی رسی بھی دراز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کامل کے لائے ہوئے انقلاب کے فوراً بعد عرب میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا۔ حضرت عمر فاروق جیسے عادل حکمراں کو بھی قتل کرنے والے پیدا ہو گئے۔ وغیرہ۔ انسان کو دراصل یہی یہ بتانا تھا کہ جس معیاری زندگی کی تمھیں تلاش ہے وہ تم کو کل آخرت میں مل سکتی ہے۔ اس کے برعکس مسلم مفکروں نے یہ کیا کہ اسی آج کی دنیا میں لوگوں کو آئیڈیل زندگی کا نقشہ تقسیم کرنے لگے۔

انسان کے اندر معیاری دنیا کی تلاش اس لئے رکھی گئی ہے کہ وہ موجودہ غیر معیاری دنیا پر قانع نہ ہو۔ وہ اپنی خوابوں کی دنیا کو اس سے آگے کی دنیا میں حاصل کرنا چاہے۔ یہ دعوتِ آخرت کی طرف سے ایک نفسیاتی محرک ہے۔ انسان کے اندر معیار پسندی کا جذبہ اس لئے تھا کہ اس کو استعمال کر کے ہم دعوتِ آخرت کو اس کے لئے قابل قبول بنائیں۔ مگر مسلم مفکرین نے یہ نادانی کی کہ آدمی کو ایک لفظی کھلونا دے کر دوبارہ اسی آج کی دنیا میں اسے مشغول کر دیا۔ ایک ایسا دین جو آخرت کی طرف پکارنے والا تھا۔ اس کو دنیا کی پکار بنا کر رکھ دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ———— اللھم لاعیش الا عیش الاخرۃ (خدایا، زندگی نہیں ہے مگر آخرت کی زندگی) مطلب یہ ہے کہ اپنی پسند کی زندگی جو آدمی بنانا چاہتا ہے وہ موجودہ دنیا میں نہیں بنتی۔ وہ تو صرف آخرت میں بنے گی۔ موجودہ دنیا معیار کے احساس کے لئے ہے نہ کہ معیار کے حصول کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ نہ غریب کو اور نہ امیر کو۔ نہ عام آدمی کو اور نہ کسی بادشاہ کو۔

تین قسم

مستدرک حاکم (کتاب الجہاد) میں حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے:

کل شئ من لھو الدنیا باطل الا ثلاثۃ انتضالک بقوسک وتادیبک لفرسک وملاعبتک لاھلک فانھن من الحق۔

دنیا کا ہر کھیل باطل ہے سوا تین چیزوں کے۔ تمہارا تیر کمان سے کھیلنا۔ اور تمہارا اپنے گھوڑے کو سدھانا اور تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ تفریح کرنا۔ یہ تین کھیل ہیں جو درست ہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کو جو لوگ مطلق معنوں میں لے لیتے ہیں وہ ان کو سمجھ نہیں پاتے اور مختلف قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل شریعت میں ممنوع ہے۔ حتی کہ ہاکی اور فٹ بال کھیلنا بھی شیطانی فعل ہے۔

دوسرا گروہ جس کو یہ ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ خدا مذکورہ تین چیزوں کے سوا ہر کھیل کو قابل ترک قرار دے وہ جھنجھلا کر خود حدیث ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں حدیث میں پیغمبر کے اقوال صحیح طور پر نقل نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم قرآن کو مانیں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں گے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی حدیثیں مطلق معنوں میں نہیں ہوتیں۔ وہ کسی مخصوص صورت حال میں دین کی روح کو بتانے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذکورہ حدیث میں تین کھیل سے مراد تین قسم کے کھیل ہیں۔ وہ حقیقۃً کھیل کی نوعیت کو بتاتے ہیں نہ کہ کھیل کی صورت کو۔ مفہوم کے اعتبار سے اگر اس حدیث کی تشریح کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ ـــــــ دنیا کا ہر کھیل باطل ہے الا یہ کہ وہ بامقصد کھیل ہو۔ مثلاً مقابلہ کی تیاری والا کھیل جیسے کہ قدیم زمانہ میں تیر کمان تھا۔ گھوڑا دوڑانا جس میں جسمانی ورزش بھی ہے اور گھوڑے کو سواری کے لئے تیار کرنا بھی۔ اسی طرح بیوی سے تفریح جو در اصل ناجائز تفریح سے اپنے کو بچانے کا ذریعہ ہے۔

مذکورہ حدیث کو "تین کھیل" کے مفہوم میں لیا جائے تو وہ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کو "تین قسم کے کھیل" کے مفہوم میں لیں تو وہ نہایت بامعنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک چیز ظاہر میں کچھ نظر آتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ کچھ اور بن جاتی ہے۔

اللہ کی یاد

حضرت عبد اللہ بن عباس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو چیز بھی فرض کی ہے اس کی کوئی معلوم حد ہے۔ پھر عذر کی حالت میں آدمی کے لئے رخصت ہے۔ مگر ذکر (یاد) کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اور نہ اس کے چھوڑنے کے لئے کوئی عذر قابل قبول ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، تحت سورۃ الاحزاب) یہاں، ہم ذکر کے بارہ میں دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

أخرج الامام أحمد عن معاذ بن جبل مرفوعا قال : ألا أخبركم بخير أعمالكم و أزكاها عند مليككم و أرفعها فى درجاتكم ، و خير لكم من تعاطى الذهب والفضة، و من أن تلقوا عدوكم غداً فتضربوا أعناقهم و يضربوا أعناقكم ، قالوا بلى يارسول الله ، قال ﷺ : ذكر الله عز و جل ۔ وروى أن رجلا سأل النبى ﷺ فقال : أى المجاهدين أعظم أجراً يا رسول الله ؟ قال ﷺ : أكثرهم لله تعالى ذكراً ، قال فأى الصائمين أكثر أجراً ، قال ﷺ : أكثرهم لله عز و جل ذكراً ، ثم ذكر الصلاة و الزكاة و الحج و الصدقة ، كل ذلك يقول رسول الله ﷺ : أكثرهم لله ذكراً ، فقال أبو بكر لعمر رضى الله عنهما : ذهب الذاكرون بكل خير ، فقال رسول الله ﷺ : أجل . (أخرجه الامام أحمد فى المسند)

رسول اللہ صلی اللہ نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ تمہارے اعمال میں سب سے اچھا عمل کیا ہے۔ اور تمہارے مالک کے یہاں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمہارے رتبہ کو سب سے زیادہ بڑھانے والا ہے اور تمہارے لئے سونا چاندی دینے سے بھی زیادہ بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم کل اپنے دشمن سے ملو، تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ صحابہ نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ اسی طرح روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، مجاہدوں میں سب سے زیادہ اجر کس مجاہد کا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہو۔ پھر آدمی نے پوچھا کہ روزہ داروں میں سب سے زیادہ اجر کس روزہ دار کا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ اسی طرح آدمی نے نماز اور زکوٰۃ اور حج اور صدقہ کے بارہ میں سوال کیا۔ ہر بار آپ یہی جواب دیتے رہے کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا: ذکر کرنے والے نیکی میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔

ذکر تمام عبادتوں سے افضل کیوں ہے۔ اس لئے کہ ذکر تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے۔ تمام عبادات و اعمال سے بالآخر جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ آدمی خدا کا ذکر کرنے والا بن جائے۔

ذکر دراصل معرفت خداوندی کا دوسرا نام ہے جب آدمی کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے جب اس کا تصور ظاہر کے پردہ کو پھاڑ کر غیب کی حقیقتوں کو دیکھ لیتا ہے تو اس وقت اس کے عین قدرتی نتیجہ کے طور پر، جو کیفیت آدمی پر گزرتی ہے اسی کا نام ذکر ہے۔ ذکر دراصل ایک اعلیٰ ترین تجربہ ہے نہ کہ کسی قسم کی لفظی تکرار۔

ذکر کا تعلق کسی لفظ سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہے۔ ذکر دراصل کسی انسان کا وہ قیمتی لمحہ ہے جب کہ وہ خدا کی عظمتوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ پالے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی کا بھونچال آجائے اور اس کی زبان سے اس کے اعتراف و اظہار کا فوارہ پھوٹ نکلے۔

ذکر کسی بندۂ خدا کی اس حالت کا نام ہے جب کہ وہ خدا کے احسانات اور اس کے کمالات کو سوچتا ہے۔ اس سے اس کے قلب و دماغ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس کی روح یاد خدا میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ خدا کی خدائی کے اعتراف میں ملکوتی الفاظ نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو موت اور آخرت کی یاد آتی ہے۔ وہ زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرتا ہے۔ یہ چیزیں اس کو تڑپا دیتی ہیں۔ وہ بیتابانہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جس میں جہنم کا خوف لپٹا ہوا ہو اور جس میں جنت کی خوشبو شامل ہوگئی ہو۔

جس آدمی کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے تو اس پر ایسے خصوصی لمحات آتے ہیں جب کہ اس کے رب سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ جب بندگی اور خدائی ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جب بندہ اپنے رب کو دیکھنے لگتا ہے۔ ان خصوصی لمحات میں روح انسانی کے اندر جو تموج پیدا ہوتا ہے اور احساس بندگی اور اعتراف خداوندی کے دو طرفہ احساس کے تحت جو کلمات نکل پڑتے ہیں انہیں کو دین کی اصطلاح میں ذکر کہا جاتا ہے۔

ہم کسی ایسے سورج کو نہیں جانتے جس میں روشنی نہ ہو۔ ہم کسی ایسے کارخانہ سے واقف نہیں جس کا کوئی انجنیئر نہ ہو۔ مگر دنیا کو دیکھئے تو یہاں بڑا عجیب منظر سامنے آتا ہے۔ یہاں آرٹ ہے مگر آرٹسٹ نہیں یہاں کارکردگی ہے مگر کارپرداز نہیں۔ یہاں حکمت ہے مگر حکیم نہیں۔ یہاں سرگرمیاں ہیں مگر کوئی محرک نہیں۔ یہاں زندگی ہے مگر کوئی زندگی بخش نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہاں خدائی ہے مگر کوئی خدا نہیں۔

ذکر وہ ربانی لمحہ ہے جب کہ آدمی اس خلا کو عبور کر لیتا ہے۔ جب وہ "نہیں" سے گزر کر "ہاں" تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ وہ مخلوقات کے پردہ میں اس کے خالق کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین

دریافت ہوتی ہے۔ اس دریافت کے وقت دریافت کرنے والے کے دل اور زبان پر جو تجربہ گزرتا ہے اسی کا دوسرا نام ذکر ہے۔

۱۶ جولائی ۱۹۶۹ کی رات تمام اخباروں کے دفتروں میں زبردست سرگرمیوں کی رات تھی۔ اسی روز پہلا انسان (آرم اسٹرانگ) چاند پر اترا تھا اور اخباروں کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر پر مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ جن کو اخبارات کا اسٹاف کل صبح کے اخبار کے لئے تیزی سے لے رہا تھا۔

اس روز رات کو میں ایک اخبار کے دفتر میں گیا۔ اخبار کے نیوز اڈیٹر اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے تازہ واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تو ان کی زبان سے نکلا:

"بڑی تھرلنگ نیوز آرہی ہیں"

میں نے سوچا کہ انسان زمین سے سفر کرکے آسمان تک پہنچ گیا تو اس خبر کو سن کر لوگوں کے اندر Thrill پیدا ہورہا ہے۔ مگر زمین اور چاند کو دیکھ کر اور ان کے درمیان حیرت انگیز نظام کا مشاہدہ کرکے آدمی کے اندر تھرل پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی واقعات پر تھرل مگر خدائی واقعات پر کوئی تھرل نہیں۔

انسانی کرشمہ کو دیکھ کر اڈیٹر کی زبان سے جو جملہ نکلا، اسی قسم کے الفاظ جب خدائی کرشمہ کو دیکھ کر نکلنے لگیں تو اسی کا نام دین کی اصطلاح میں ذکر ہے۔

آپس کی لڑائیاں ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

إني لستُ أخشى عليكم أن تُشركوا ولكن أخشى عليكم الدنيا أن تنافسوا فيها وتقتتلوا فتهلكوا كما هلك من كان قبلكم (متفق علیہ)

مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگوگے۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم دنیا چاہنے لگوگے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑوگے۔ یہاں تک کہ اسی طرح ہلاک ہوگے جس طرح پچھلی امتیں ہلاک ہوگئیں۔

موضوع حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار) یہ اور اس طرح کی دوسری روایات سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ کہی ہو سراسر حرام ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ جو شخص کسی روایت کے بارہ میں جانے کہ وہ موضوع ہے یا اس کے موضوع ہونے کا گمان ہو اس کو ایسی حدیث کا بیان کرنا حرام ہے... ایسی حدیث خواہ احکام سے متعلق ہو یا ترغیب وترہیب سے یا رقاق سے، ہر حال میں اس کو بیان کرنا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات (جلد اول) میں لکھا ہے:

قوم وضعوا الاحادیث فی الترغیب والترھیب لیحثوا الناس فی زعمھم علی الخیر ویزجروھم عن الشر وھذا تعاط علی الشریعۃ ومضمون فعلھم ان الشریعۃ ناقصۃ تحتاج الی تتمۃ فقد اتممنا

ایک گروہ نے ترغیب وترہیب میں حدیثیں گھڑی ہیں تاکہ اپنے گمان کے مطابق وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف لائیں اور برائی سے انھیں روکیں۔ مگر یہ شریعت پر زیادتی ہے۔ ان کے اس عمل کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، وہ تکمیل کی محتاج ہے پس ہم نے اس کو مکمل کیا ہے۔

ماضی میں جن لوگوں نے حدیثیں گھڑیں وہ عام طور پر دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو دل سے اسلام کے مخالف تھے۔ اور اسلام کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے مضحکہ خیز قسم کے قصے بنائے اور ان کو صحابۂ کرام اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے عوام کے اندر پھیلا دیا۔

دوسرے وہ لوگ جو بذات خود مخلص تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ثابت شدہ احادیث عام طور پر سیدھی سادی ہیں اور عوام کے لئے زیادہ اثر انگیز ثابت نہیں ہوتیں۔ چنانچہ انھوں نے عوام کے اندر ڈر اور شوق پیدا کرنے کے لئے طلسماتی قسم کی حدیثیں بنائیں۔ ان حدیثوں میں چھوٹے چھوٹے اعمال پر بہت بڑے بڑے ثواب کی امید دلائی گئی تھی یا بہت بڑے بڑے عذاب سے ڈرایا گیا تھا ___ مذکورہ دونوں گروہوں میں ایک مخلص تھا اور دوسرا غیر مخلص۔ مگر دونوں نے دین میں ایسی خرابیاں پیدا کیں جن کی تلافی اب کسی طرح ممکن نہیں۔

ذرہ برابر نیکی

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ شعیرۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ وزن برۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ وزن ذرۃ من خیر (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں گیہوں کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ کے برابر خیر ہو۔

لا الہ الا اللہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کے مجرد تلفظ سے معجزاتی واقعات برآمد ہوتے ہوں۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ کائنات کی ساری طاقتیں صرف ایک خدا کے پاس ہیں، انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسی ایک خدا سے تمام امیدیں وابستہ کرے اور اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے۔ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف جب آدمی کے دل ودماغ میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ خدا کے سامنے جھک جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ بندوں کے ساتھ تعلقات میں اس کے اندر گھمنڈ اور سرکشی کا انداز ختم ہو جاتا ہے۔ خدا کے سامنے اس کا جھکنا بندوں کے معاملہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کے اقرار کے نتیجہ میں پیدا شدہ اسی صالحیت کا نام خیر ہے۔ آدمی کا اقرار و اعتراف جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے اندر اس "خیر" کا ظہور ہوگا۔

انسانوں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے نہ تو خدا کے معاملہ میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کیا اور نہ ان کی زندگی میں خیر اور صالحیت کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم ہو کر ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں پوری طرح حقیقت واقعہ کا اعتراف کیا اور اس اعتراف کے نتیجہ میں ان کی زندگی میں پوری طرح خیر کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگوں

کے کم اچھے اعمال کو ان کے زیادہ اچھے اعمال کے تابع کر دیا جائے گا اور ان کا جو بہتر سے بہتر عمل ہوگا اس کے مطابق ان کو انعام دیا جائے گا۔ (نحل ۹۷) دوسرے لوگ وہ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں حقیقت واقعہ کا اعتراف تو کیا مگر ان کا اعتراف اتنا گہرا نہ تھا جو ان کی عملی زندگی پر چھا جاتا۔

انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے اور اسی کے ساتھ بہت سے برے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے۔ ایسے لوگوں کے اچھے عمل میں اگر اللہ تعالیٰ واقعی "خیر" دیکھے گا تو امید ہے کہ ان کے برے اعمال کو ان کے اچھے اعمال کے تابع کر دے۔ وہ ان کے برے اعمال کو نظر انداز کر دے۔ اور ان کو وہ بدلہ دیدے جس کے وہ اپنے بعض اچھے اعمال کے اعتبار سے مستحق تھے (توبہ ۱۰۲)

اللہ کے معاملہ میں کسی شخص کے اندر خیر کا ذرہ پایا جانا یہ ہے کہ وہ چیز اس کے اندر کم مقدار میں پائی جا رہی ہو جس کی زیادہ مقدار کسی کو حقیقی معنوں میں صالح العمل بناتی ہے۔

وہ ذرہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت کو سوچ کر کبھی اس کا دل تڑپ اٹھا ہو۔ خدا کی کبریائی کے تصور سے کبھی اس کے اوپر کپکپی طاری ہوئی ہو۔ اس پر کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جب کہ خدا کی بڑائی کے خیال نے اس سے اپنی بڑائی کے تمام احساسات چھین لئے ہوں۔

زندگی کے کسی موڑ پر اس نے اس ربانی کیفیت کا تجربہ کیا ہو جو خدا کو اپنا خدا بنا کر اور اپنے آپ کو عبد کا مقام دے کر آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے

اسی طرح بندوں کے معاملہ میں خیر کا ذرہ وہ ہے جس کو حدیث میں عمل کا آخری درجہ کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا۔ آدمی اگر دوسروں کو فائدہ نہ پہنچائے تو کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔ اگر آدمی نے دوسروں کو اپنے شر سے بچایا ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں خیر کا ذرہ شمار ہوگا اور وہ اس کو جہنم کی آگ سے بچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔

کائناتی نشانیاں

عن ابن عباس قال اتت قریش الیهود فقالوا بم جاء کم موسیٰ قالوا عصاہ و یدہ بیضاء للنظرین واتوا النصاریٰ فقالوا کیف کان عیسیٰ۔ قالوا کان یبرئ الاکمہ والابرص ویحیی الموتیٰ فاتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا ادع اللہ ان یجعل لنا الصفا ذھباً فدعا ربہ فنزلت ھذہ الآیۃ (ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب) فلیتفکروا فیھا۔

تفسیر ابن کثیر الجز الاول، صفحہ ۴۳۸

حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش یہود کے پاس آئے اور پوچھا کہ موسیٰ تمھارے پاس کیا معجزہ لے کر آئے انھوں نے کہا کہ اپنا عصا اور اپنا ہاتھ جو دیکھنے والوں کو چمکدار نظر آتا تھا۔ پھر قریش نصاریٰ کے پاس آئے اور پوچھا کہ عیسیٰ کا معاملہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے اور مردہ کو زندہ کرتے تھے۔ پھر قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے۔ پھر آپ نے اپنے رب سے دعا کی تو یہ آیت اتری: "بے شک آسمانوں اور زمینوں کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔ پس سوال کرنے والوں کو چاہئے کہ اس میں غور کریں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد نزلت علیّ اللیلۃ آیۃ ویل لمن قرأھا ولم یتفکر فیھا (ان فی خلق السماوات والارض الخ)

البقرہ ۱۶۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کی رات میرے اوپر ایک ایسی آیت اتری ہے کہ خرابی ہے اس کی جو اس کو پڑھے اور اس میں غور نہ کرے۔ وہ آیت یہ ہے: بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ نے اوپر سے اتارا پھر اس سے زمین کو موت کے بعد زندہ کر دیا اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید

رہتا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

عن ابی ذر قال ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکرنا منہ علما
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۴۰۴)

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور آپ کا حال یہ تھا کہ اگر ایک چڑیا بھی فضا میں اپنے پر ہلاتی تھی تو اس سے آپ ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کراتے تھے۔

قال الدارانی انی لاخرج من منزلی فما یقع بصری علی شیٔ الا رأیت للہ علی فیہ نعمۃ ولی فیہ عبرۃ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت دارانی کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے۔ مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور اس میں میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال، یا ایھا الناس ان للہ سرایا من الملائکۃ تحل وتقف علی مجالس الذکر فی الارض فارتعوا فی ریاض الجنۃ۔ قالوا واین ریاض الجنۃ، قال مجالس الذکر۔ فاغدوا او روحوا فی ذکر اللہ واذکروہ بانفسکم۔ من کان یحب ان یعلم منزلتہ عند اللہ فلینظر کیف منزلۃ اللہ عندہ فان اللہ ینزل العبد منہ حیث انزلہ من نفسہ (البیہقی)

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کے لئے فرشتوں کی جماعت ہے جو زمین پر ہونے والی ذکر کی مجلسوں میں آتی ہے اور ٹھہرتی ہے۔ لہٰذا تم جنت کے باغوں میں چرو۔ لوگوں نے کہا کہ جنت کے باغ کہاں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ذکر کی مجلسیں ہیں لہٰذا تم اللہ کی یاد میں صبح کرو یا اللہ کی یاد میں شام کرو۔ اور اللہ کو اپنے جی میں یاد کرو۔ جس آدمی کو پسند ہو کہ اللہ کے پاس اپنے مرتبہ کو جانے اس کو چاہئے کہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مرتبہ اس کے پاس کیا ہے۔ کیونکہ اللہ بندہ کو اپنے یہاں وہی درجہ دیتا ہے جو درجہ بندہ نے اپنے یہاں اللہ کو دیا ہے۔

مظلوم قوم کی حمایت، مظلوم فرد سے بے اعتنائی

مسلم کی ایک روایت کے مطابق آخرت میں ایسے لوگ لائے جائیں گے جنھوں نے اسلام کے نام پر جہاد کیا ہوگا۔ قرآن کے علم کو لوگوں کے درمیان پھیلایا ہوگا۔ مال و دولت کو خوب اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ لوگ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ سب کچھ شہرت کے لئے کیا ہوگا (۴۰۲) دوسری طرف مسلم ہی کی ایک روایت ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں سے کہے گا کہ تم نے میری عیادت نہیں کی۔ تم نے مجھ کو کھانا نہیں کھلایا۔ تم نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ وہ لوگ کہیں گے کہ خدایا تو سارے جہان کا مالک ہے، تجھ کو ان چیزوں کی کیا ضرورت۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا فلاں شخص بیمار تھا، تم نے اس کی عیادت نہیں کی۔ فلاں شخص بھوکا تمھارے پاس آیا تم نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ فلاں شخص نے تم سے پانی مانگا تم نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ اگر تم ایسا کرتے تو مجھ کو تم وہاں پاتے (۲۴۵)

عمل کرنے کی ایک جگہ وہ ہے جہاں دیکھنے والے اس کو دیکھتے ہیں اور چرچا کرنے والے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ جہاں وہ فوراً اخبار کی خبر بنتا ہے۔ عمل کرنے کی دوسری جگہ وہ ہے جہاں یا تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا یا اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ایسا واقعہ ہوتا جس کو لوگ چرچا کے قابل نہیں سمجھتے۔ اخبار میں اس کی شان دار سرخی نہیں بنائی جاتی۔ بالفاظ دیگر ایک عمل مجمع عام کی سطح پر کیا جاتا ہے اور دوسرا عمل فرد کی سطح پر۔ پہلے عمل کو "لوگ" دیکھتے ہیں۔ دوسرا عمل وہ ہے جس کو خدا دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ہمارے اسلام کا امتحان جہاں مطلوب ہے وہ "فرد" ہے نہ کہ مجمع عام۔ فرد کی سطح پر جو شخص تقویٰ اور اسلامیت کا ثبوت دے رہا ہے وہی اللہ کی نظر میں مسلم اور متقی ہے۔ عوامی سطح پر اسلامیت کا اظہار شہرت طلبی کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی کے سامنے جب ایک تنہا شخص آتا ہے اور وہ اس کی مدد کرتا ہے تو اس میں شہرت کا کوئی محرک نہیں ہوتا۔

آج مظلوم قوم کی حمایت میں ہر شخص بول رہا ہے مگر مظلوم فرد کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں۔ وہی آدمی جو اسٹیج پر ملت کی مظلومی کے بارے میں تقریر کا دریا بہا رہا ہے جب اس کے سامنے ملت کا ایک فرد اپنی مصیبت لے کر آتا ہے تو اس کو فرد کا مسئلہ حل کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ ملت پر کوئی افتاد پڑے تو وہ تار اور ٹیلی فون اور ہوائی جہاز کی سی تیزی کے ساتھ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔ مگر اسی ملت کا ایک فرد اپنے مسئلہ کے حل کے لئے اس کو پکارتا ہے تو وہ اس کے سینہ میں پتھر کا سا دل پاتا ہے۔ دور کے مقام پر اخلاق اور انسانیت یا اسلامی قانون پر سیمینار ہو تو ہر آدمی چاہتا ہے کہ ہوائی جہاز میں اڑ کر جائے اور "بین اقوامی" سیمینار میں ایک شاندار تقریر پیش کرے۔ مگر پڑوس کا ایک آدمی جو اس سے اسلامی سلوک کی بھیک مانگے، جو اس کے سامنے اخلاق اور انسانیت کی دہائی دے رہا ہو، اس کی درخواست کو سننے کے لئے اسے فرصت نہ ہوگی۔

مردار سے زیادہ متعفن

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعۃ حتی یبعث اللہ امراء کذبۃ ووزراء فجرۃ واعوانا خونۃ وعرفاء ظلمۃ وقراء فسقۃ سیماھم سیمی الرھبان وقلوبھم انتن من الجیفۃ اھواؤھم مختلفۃ فیتیح اللہ لھم فتنۃ غبراء مظلمۃ فیتھاوکون فیھا

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک وہ دور نہ آجائے جس میں جھوٹے حکمراں، بُرے وزراء، بد دیانت ملازمین حکومت، ظالم قائدین ظہور میں نہ آجائیں۔ اس زمانہ میں ایسے فاسق علماء ہوں گے جن کا ظاہر پارساؤں جیسا ہوگا اور ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔ اس زمانہ میں اللہ ایک ایسا اندھا فتنہ برپا کرے گا جس میں لوگ حیران و سرگرداں ہو کر رہ جائیں گے۔

اس حدیث میں جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ کافروں اور مشرکوں کی نہیں ہے۔ کافر اور مشرک تو ہمیشہ ہی ایسے ہوتے ہیں۔ یہ خود مسلمانوں کے بگاڑ کے زمانہ کی حالت ہے۔ یہ ان لوگوں کی تصویر ہے جو اپنے کو مسلمان کہیں گے اور اس پر فخر کریں گے کہ وہ افضل الانبیاء کے امتی ہیں۔

یہ زمانہ کب آئے گا۔ اس کی ایک قطعی اور کھلی ہوئی پہچان ہے۔ اور وہ ہے — لوگوں کی خواہشات کا ایک دوسرے سے مختلف ہو جانا۔ اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کے اندر باہمی ٹکراؤ کا پیدا ہونا۔ غور سے دیکھئے تو یہ علامت آج پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ آج مسلم افراد، مسلم اداروں اور مسلم قوموں کا سب سے نمایاں وصف باہمی اختلاف ہے۔ شخصی آرزوئیں اور گروہی مصلحتیں لوگوں کے اوپر اتنا چھا چکی ہیں کہ ہر ایک اپنے خول میں بند ہے، کوئی دوسرے سے ملنے کے لئے تیار نہیں۔ علماء کے لئے دین ایک سستی تجارت بن چکا ہے۔ ان کے سینہ میں ذاتی مفاد اور ذاتی نمائش کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم وہ پارسائی کا جھوٹا لبادہ اپنے اوپر ڈالے ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں مقدس بنے رہیں، تاکہ وہ دین کے نام پر عوام کا استغلال کر سکیں۔

جب امت پر یہ وقت آتا ہے تو ہر ایک اپنی خواہش کے مطابق دین کی تشریح کرنے لگتا ہے۔ فکری اختلافات بے پناہ حد تک بڑھ جاتے ہیں۔ حق، اپنی تمام تابانیوں کے باوجود، انسانی آوازوں میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔

آپ کا حصہ آپ کو مل کر رہے گا

عبد اللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا أَلَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ

(مشکوٰۃ، باب التوکل والصبر)

اے لوگو! جنت سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور دوزخ سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب کا میں تمھیں حکم دے چکا ہوں۔ اسی طرح دوزخ سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور جنت سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب سے تمھیں منع کر چکا ہوں۔ اور جبریل امین نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا ہے کہ کوئی شخص ہرگز مر نہیں سکتا جب تک وہ اپنے حصے کا رزق نہ پالے۔ تو آگاہ۔ تم لوگ خدا سے ڈرو اور تلاشِ رزق میں جمیل طریقوں سے کام لو اور اگر رزق آنے میں کچھ دیر لگے تو اس کی وجہ سے تم معصیت کی راہ سے اس کو حاصل کرنے کی طرف مائل نہ ہو جاؤ کیونکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس کو اس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صحیح زندگی چھوڑ کر غلط زندگی اختیار کرنے کا محرک اکثر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی دنیا میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے۔ اس لئے فرمایا کہ دنیا میں جو کچھ تم حاصل کرتے ہو وہ محض تمھاری اپنی کوششوں کا حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ دراصل تمھارا وہ حصہ ہوتا ہے جو پہلے سے تمھارے لئے مقدر ہو چکا ہے، اس لئے حصولِ معاش کی جدوجہد میں دوسرے فرائض کو نہ بھولو اور اس کے لئے اتنا بدحواس نہ ہو جاؤ کہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنے لگو۔ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھو کہ دنیا کے لئے آدمی کی بے قراری یا حرام ذریعوں سے حاصل کرنے کی کوشش اس کو مزید کچھ نہیں دے سکتی۔ وہ صرف اس کی بدبختی میں اضافہ کرے گی۔

حصولِ معاش کی جدوجہد میں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ ہماری کوششیں ہمارے لئے استحقاق پیدا کرتی ہیں نہ کہ وہی بذاتِ خود نتیجہ پیدا کرنے والی ہیں۔

اس معاملہ کو تعلیمی امتحان کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کی امتحان میں داخلہ کی درخواست کو قبول کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ امتحان ہال میں اس کو ایک نشست دی جائے گی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے لئے وہ تمام سامان فراہم کئے جائیں گے جو امتحان دینے کے لئے ضروری ہیں۔ اس مثال سے موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور ہمارا یہاں پیدا ہونا گویا اپنے آپ کو امتحان میں شامل کرنا ہے۔

شہادت کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے

شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد اصلاً وہ لوگ ہیں جو دنیا میں لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے باخبر کریں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کی عدالت میں حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ جو لوگ دنیا میں جنیادنی دینے کا یہ کام کریں گے وہ آخرت کی عدالت میں خدا کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گے۔ ان کی گواہی کی بنیاد پر ان لوگوں کے اخروی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا جن کے اوپر انھوں نے دنیا کی زندگی میں گواہی دی تھی۔ تاہم شہید کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑکر جان دینے والوں کی فضیلت میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے:

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللهُ عَنهُ أَنَّ رَسولَ اللهِ صلّى الله عليه وسلم قام فيهم فَذَكَرَ أَنَّ الجهادَ في سبيل الله وَالإِيمَانَ بِاللهِ أَفْضَلُ الأَعْمَالِ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ أَرَأَيت إن قتلت في سبيل اللهِ تكفر عنى خطاياى؟ فقال رسولُ الله صَلّى الله عليه وسلم: نَعَمْ إن قُتِلتَ في سبيل الله وَ انت صابر محتسب مقبل غير مدبر" ثمّ قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "كيف قلت؟" قال: أرأيتَ إن قتلت في سبيل الله أتكفر عنّي خطاياى؟ فقال له رسول الله صلّى الله عليه وسلم: "نعم وانت صابرٌ محتسب مقبل غير مدبر، إلا الدين فإنّ جبريل قال لى ذٰلك" رواه مسلم

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا بہترین اعمال ہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا: اے خدا کے رسول اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: "ہاں، اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ اور تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو۔ پیچھے مڑنے والے نہ ہو"۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے کس طرح کہا تھا، اس نے کہا: اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں تو کیا میری خطائیں معاف ہو جائیں گی۔ آپ نے فرمایا: ہاں، جب کہ تم صابر ہو، اجر کے طلب گار ہو، آگے بڑھنے والے ہو، پیچھے مڑنے والے نہیں ہو۔ سوا قرض کے کیونکہ جبرئیل نے مجھ کو یہی بتایا ہے۔

صحابہ کرام کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت یا اللہ کی راہ میں قتل ہونے کو وہ جنت کا مختصر راستہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے رب کی جنت میں پہنچ جائیں۔ اللہ کی ناراضی سے بچنا اور اس کی رضا کو حاصل کرنا وہ چیز تھی جس کے لئے وہ سب سے زیادہ بے چین رہتے تھے۔ ہجرت کے بعد دشمنان اسلام سے مقابلہ چھڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اللہ کی راہ میں جان دے دینا اللہ کی رضا اور اس کی جنت حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ ہے۔ یہ سن کر وہ بیتابانہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی خاطر مرجانا ان کے لئے محبوب بن گیا۔ کیونکہ یہ اللہ تک پہنچنے کا یقینی راستہ تھا اور اسی کے ساتھ قریبی بھی۔ شہادت ان کے لئے اللہ سے ملنے کا عنوان تھا نہ کہ حقیقۃً میدان جنگ کے لوگوں سے ملنے کا۔

ابن جریر نے شعبی کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کے نام خط روانہ کیا، وہ ان دنوں ایران کی سرحد پر متعین تھا۔ انھوں نے لکھا:

اما بعد فاسلم تسلم او اعتقد لنفسك وقومك الذمة واقرر بالجزية والا فلا تلومن الا نفسك فقد جئتك بقوم يحبون الموت كما تحبون الحياة (تاریخ طبری، جلد ۲)

اما بعد۔ اسلام لاؤ نجات پاؤ گے۔ اسلام منظور نہیں ہے تو اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے جزیہ ادا کرو۔ ورنہ اپنے سوا کسی اور کو ملامت نہ کرنا۔ کیوں کہ میں تمھارے اوپر ایک ایسی قوم لے کر آیا ہوں جس کو موت اسی طرح محبوب ہے جس طرح تم کو زندگی۔

صحابہ کرام اللہ کی راہ میں لڑکر شہید ہونے کو نہ صرف نجات آخرت کا یقینی ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ یہ وہ عمل ہے جو جنت کے سفر کو مختصر کر دیتا ہے۔ ابوبکر بن ابوموسیٰ اشعری رضی کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے سنا۔ جنگ کا موقع تھا۔ دشمن سامنے تھے۔ انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ان ابواب الجنة تحت ظلال السيوف (جنت کے دروازے تلواروں کی چھاؤں میں ہیں) ایک شخص نے جو پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھا، کہا: اے ابوموسیٰ! کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، وہ آدمی اسی وقت اپنے ساتھیوں میں آیا۔ ان کو سلام کیا۔ پھر اپنی تلوار کی میان توڑ ڈالی اور تلوار لے کر دشمنوں کی صف میں گھس گیا۔ وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ مارا گیا (مسلم) جنگ بدر کے موقع پر جب دشمن بالکل قریب آگئے تو آپ نے فرمایا: قوموا الى جنة عرضها السموات والارض (ایسی جنت کی طرف چلو جس کی چوڑائی آسمان وزمین کے برابر ہے) عمیر بن حمام انصاری رض نے کہا "آسمان وزمین جیسی چوڑی" آپ نے فرمایا ہاں۔ ان کی زبان سے نکلا بخ بخ (واہ واہ) آپ نے فرمایا تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا: خدا کی قسم اس امید میں کہ شاید میں بھی جنت والوں میں ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہو۔ انھوں نے کھجور نکالی اور کھانے لگے۔ پھر بولے: لئن انا حييت حتى آكل تمراتي هذه انها لحياة طويلة (اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہوگی) انھوں نے کھجوریں پھینک دیں دشمنوں میں گھس گئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے (مسلم) انس بن مالک رض کہتے ہیں کہ حرام بن ملحان رض کو جبار بن سلمیٰ کلابی نے نیزہ مارا۔ زخم کاری تھا۔ جسم سے خون ابل پڑا۔ حضرت حرام کی زبان سے نکلا: الله اكبر! فزت ورب الكعبة (کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا) یعنی جنت کو پاتے ہیں (بخاری) عروہ بن زبیر رض کہتے ہیں کہ ذی الحجہ ۸ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار آدمی موتہ کی طرف روانہ کئے۔ یہ لوگ سرحد شام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہرقل ایک لاکھ یا دو لاکھ رومی لشکر کے ساتھ بلقار میں ٹھہرا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ مقابلہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی تعداد سے مطلع کیا جائے۔ عبداللہ بن رواحہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا:

يا قوم! والله ان التي تكرهون للتي خرجتم تطلبون الشهادة (البدایہ والنہایہ جلد ۴)

لوگو! خدا کی قسم جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو، وہ وہی ہے جس کے لئے تم نکلے ہو۔ یعنی شہادت

آخرت والے عمل سے دنیا کا فائدہ چاہنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور فتنہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا

وَقَلَّتْ فُقَهَاءُكُمْ وَكَثُرَتْ قُرَّاءُكُمْ وَتُفُقِّهَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ وَالْتُمِسَتِ الدُّنْيَا بِعَمَلِ الْآخِرَةِ (ترغیب و ترہیب)

اس وقت دین کی سمجھ رکھنے والے کم ہو جائیں گے اور دین کے پڑھنے والے بہت ہوں گے۔ دین کو دنیا کے لئے پڑھا جائے گا آخرت کے عمل کے ذریعہ دنیا چاہی جائے گی۔

امت مسلمہ کا بگاڑ یہ نہیں ہے کہ وہ دین کا نام لینا چھوڑ دے یا اس کے درمیان سے دینی شکلیں مٹ گئی ہوں۔ ایسا نہ پچھلی امتوں کے ساتھ ہوا اور نہ امت مسلمہ کے ساتھ کبھی ہوگا۔ امت کا بگاڑ یہ ہے کہ دین کو دنیا کے لئے کیا جانے لگے ــــــ دینی کام اس جذبہ کے تحت کئے جائیں کہ اس سے مال و اولاد میں برکت ہوگی۔ دین و ملت کے نام پر چندے وصول کئے جائیں اور ان کو ذاتی مفاد میں استعمال کیا جائے۔ جاہ و اقتدار کے ہنگامے کھڑے کئے جائیں اور اس کے لئے دلیل قرآن و سنت سے پیش کی جائے۔ آدمی خدا کے حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر کمائے اور اس کے بعد جب وہ اپنا ایک مکان بنائے تو اس پر لکھ دے ھٰذا من فضل ربی (یہ میرے رب کا انعام ہے) اس کی عملی زندگی کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو اور جب اس کی خدا فراموش زندگی اس کو ایک کار کی مالک بنا دے تو وہ اپنی گاڑی کے لئے ۷۸۶ نمبر حاصل کرے تاکہ اس کی گاڑی حادثہ سے محفوظ رہے۔ اس بگاڑ کی آخری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا کے دین کی ایسی تشریح و تفسیر کرے کہ وہ دین جو آخرت کی چیتاؤنی کے لئے آیا تھا وہ دنیوی اور سیاسی ہنگاموں کا عنوان بن جائے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں ہر طرف خدا اور مذہب کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر حقیقی زندگیوں میں خدا اور مذہب کا کہیں وجود نہیں۔ مذہب پر تحریری مظاہرے اور تقریری مشاعرے اتنی کثرت سے جاری ہیں کہ پچھلی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مگر زمین و آسمان اس انسان کو دیکھنے کے لئے ترس رہے ہیں جو فی الواقع خدا سے ڈرتا ہو اور جس نے سنجیدگی کے ساتھ مذہب کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کیا ہو۔ لفظی قسم کے مذہبی پہلوانوں کے ہجوم میں حقیقی مذہبی پہلوان اس طرح نایاب ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتا۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ انصاف اور انسانیت کے نعرے بلند کرتے ہیں مگر عملاً صرف ذاتی مفاد کی سطح پر جی رہے ہیں کسی کا ذاتی مفاد پیسہ کمانا ہے اور کسی کا عزت، شہرت، مرتبہ اور اقتدار حاصل کرنا۔ کوئی "نوٹ" جمع کرنے میں لگا ہوا ہے اور کوئی "ووٹ" کے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ کوئی گھر اور کاروبار کے دائرہ میں اپنے مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے، کوئی اسٹیج اور اخبار کی دنیا میں نمایاں ہونے کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ خدا کی زمین ایسے انسانوں سے خالی نظر آتی ہے جو خدا کی یاد میں جیتے ہوں، جو آخرت کی فکر میں تڑپتے ہوں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو انصاف کے ترازو پر کھڑا کر رکھا ہو۔ جن کے لئے دنیا، اپنی تمام سرسبزی کے باوجود سرسبز نہ ہو بلکہ ایک وسیع قید خانہ بن گئی ہو۔

وہ لوگ جو دین کی خاطر دنیا میں بے حیثیت ہو گئے ہوں

عن حارثة بن وهاب قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ الا اخبرکم بملوك اهل الجنة قالوا بلیٰ یا رسول الله۔ قال كل ضعيف مستضعف اغبر اشعث (متفق علیہ)

حارثہ بن وہاب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اہل جنت کے بادشاہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ فرمایا: وہ جو کمزور ہو اور جس کو کمزور سمجھ لیا گیا ہو۔ گرد آلود اور بکھرے ہوئے بال۔

وہ لوگ جو مصلحت پرستی کے بجائے اصول پسندی کو اپنا دین بناتے ہیں۔ جو دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے حق کو اہمیت دیتے ہیں۔ جو بندوں کے بجائے خدا کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں، ایسے لوگ اکثر اوقات دنیا میں بے جگہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ثبوت نہیں دے پاتے جن کی دنیوی اہمیت ہو اور جو دنیا میں آدمی کو باعزت بنانے والی ہوں۔ ان کی اس حالت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ان کو بے حیثیت اور ناکام سمجھ لیتے ہیں۔ دنیوی نقشوں میں ان کو کہیں عزت کے مقام پر نہیں بٹھایا جاتا۔ مگر جب موجودہ دنیا کو توڑ کر آخرت کا عالم بنایا جائے گا تو اس کے اندر یہی لوگ سب سے زیادہ اونچا مقام حاصل کریں گے۔ وہی سب سے زیادہ کامیاب انسان قرار پائیں گے۔ آج کی دنیا کے بے زور کل کی دنیا میں بادشاہوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ڈکٹیٹرانہ نظام میں ایک جمہوری لیڈر ذلت اور گمنامی کے قیدخانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مگر جب جمہوری حالات پیدا ہوتے ہیں اور عوامی رائے سے سیاسی مناصب کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہی شخص اقتدار کی بلند ترین کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے جو کل تک ایک معمولی سپاہی کے آگے بھی بے زور دکھائی دے رہا تھا۔

وسلم یقول الدنیا ملعونة وملعون مافیها الا ذکر الله وما والاه وعالما ومتعلما

دنیا میں ہے وہ بھی۔ مگر اللہ کی یاد اور وہ چیز جو اس کے قریب ہو اور عالم اور طالب علم۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ غور و فکر کو افضل عبادت اس لئے کہا گیا کہ اس میں ذکر (یاد الٰہی) تو موجود ہوتا ہی ہے، اسی کے ساتھ اس میں دو چیزوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک اللہ کی معرفت، کیونکہ غور و فکر معرفت کی کنجی ہے، دوسرے، اللہ کی محبت کہ وہ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں، اگر علم چاہتے ہو تو قرآن کے معانی پر غور کرو کہ اس میں اولین و آخرین کا علم ہے۔

اس قسم کی باتوں سے صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا

عن زید بن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ، قیل وما اخلاصھا قال ان تحجزہ عن محارم اللہ (رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لاالٰہ الااللہ اخلاص کے ساتھ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا کلمہ کا اخلاص کیا ہے۔ فرمایا، وہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اس حدیث کی تشریح میں ایک بزرگ لکھتے ہیں :

"اور یہ ظاہر ہے کہ جب حرام کاموں سے رک جائے گا اور لاالٰہ الااللہ کا قائل ہوگا تو اس کے سیدھا جنت میں جانے میں کیا تردد ہے۔ لیکن اگر حرام کاموں سے نہ بھی رکے تب بھی اس کلمہ پاک کی یہ برکت تو بلا تردد ہے کہ اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنے کے بعد کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ البتہ اگر خدانخواستہ بداعمالیوں کی بدولت اسلام وایمان ہی سے محروم ہو جائے تو دوسری بات ہے۔" (۷۱)

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں یہ نقل کیا گیا کہ خوش خبری سنو اور دوسروں کو بھی بشارت سنا دو کہ جو شخص سچے دل سے لاالٰہ الااللہ کا اقرار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی بہت کچھ رنگ لاتا ہے، اس لئے اخلاص سے جو شخص کلمۂ شہادت پڑھے اس کی ضرور مغفرت ہوگی، وہ ضرور جنت میں داخل ہو کر رہے گا۔ اس میں ذرا بھی تردد نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں سزا بھگت کر داخل ہو لیکن ضروری نہیں۔" (۸۹)

اس عبارت پر خالص "مسئلہ" کی حیثیت سے اعتراض کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ محرمات سے رکنا اور محرمات سے نہ رکنا دونوں میں اگر "بلا تردد" جنت کی خوش خبری دی جانے لگے تو اس سے کبھی صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہود بھی تو یہی کہتے تھے کہ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعدُودۃ (ہم کو آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن) پھر اسی قسم کا عقیدہ اگر ہم بھی بنالیں تو ہمارے یہاں اُس سے مختلف ذہن کیوں پیدا ہوگا جو یہود کے یہاں پیدا ہوا۔ اس قسم کے مسائل وضع کرنے والے شاید کتاب الٰہی کی اس آیت کو بھول گئے ہیں۔

لَیسَ بِاَمَانِیِّکُم وَلَا اَمَانِیِّ اَھلِ الکِتٰبِ مَن یَّعمَل سُوٓءًا یُّجزَ بِہٖ

نہ تمہاری خوش گمانیوں سے کچھ ہوگا نہ اہل کتاب کی خوش گمانیوں سے، جو برا کرے گا وہ ضرور اس کا بدلہ پائے گا۔

سوال و جواب

سوال: بہت سے لوگ جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھتے ہیں اور اس کا بہت ثواب بتاتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ کی تحقیق کیا ہے۔

جواب: متعدد روایتوں میں سورہ کہف کو جمعہ کے دن پڑھنے کی فضیلت بتائی گئی ہے۔ مگر یہ تمام روایتیں ضعیف ہیں۔ قوی روایت صرف وہ ہے جس کو احمد اور مسلم نے قتادہ سے نقل کیا ہے:

من حفظ عشر آیات من اول سورۃ الکہف عصم من الدجال

جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو محفوظ رکھا وہ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اس روایت میں نہ تو "پڑھنے" کا ذکر ہے نہ "جمعہ" کے دن کا۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں میں جو تعلیم دی گئی ہے، جو شخص ان کو ذہن نشین کرے گا اور اس کو اپنی زندگی میں ملحوظ رکھے گا، وہ دجال کے ظہور کے وقت اس کے فتنہ سے بچا رہے گا۔

اب سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کو دیکھئے۔ غور کیا جائے تو ان میں دو اسوہ ملتا ہے۔ ایک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ جو لوگوں کو خدا پرست بنانے کی کوشش میں اپنے کو ہلاک کئے دے رہے تھے۔ (کہف-۶) دوسرے آپ سے قبل کے کچھ صالح نوجوان (اصحاب کہف) کا اسوہ جنھوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ لوگوں کے درمیان اپنے دین کو بچا نہیں سکتے، بستی سے نکل کر غاروں میں جا چھپے (کہف-۱۰)

معلوم ہوا کہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتوں کا سبق یہ ہے کہ جب زمین پر فتنہ کی حالت پیدا ہو جائے اور خدا کی خلاف ورزی ہونے لگے، تو اہل ایمان کے لئے دو ہی راستے ہیں — اول یہ کہ غافل اور سرکش لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ دیکھیں کہ معاملہ اس نوبت کو پہنچ چکا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے بجائے وہ خود اپنے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر لیں گے تو ایسی حالت میں انہیں چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو عوام الناس سے الگ کر لیں اور کسی گوشے میں سمٹ کر زندگی کے بقیہ ایام پورے کر کے مر جائیں — پہلی صورت اقدام کی ہے، دوسری تحفظ کی۔ □

"من قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ" اس قسم کی روایات کی تشریح عام طور پر جس طرح کی جاتی ہے، اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاص کے ساتھ لا الٰہ کہنے کا مطلب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی تھوڑی دیر کے لئے کسی گوشہ میں بیٹھ جائے اور خوب احترام اور قرأت کے ساتھ ان الفاظ کی تکرار کرے۔ اخلاص کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اخلاص قلب کے اندر ایک انقلاب پیدا ہونے کا نام ہے نہ کہ تقدس و احترام کے ظاہری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ الفاظ کو دہرانے کا۔

سوال وجواب

ایک صاحب قاہرہ سے لکھتے ہیں:

"آپ کی کتاب جو یہاں حکمۃ الدین کے نام سے شائع ہوئی ہے اس پر ایک جدال پیدا ہوگیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے سخت موید ہیں اور کچھ لوگ سخت مخالف۔ قاہرہ یونیورسٹی کے طلبا کے درمیان اس کتاب کے بارے میں سیمینار بھی ہوچکا ہے۔ مخالف گروپ کا کہنا ہے کہ آپ نے جہاد ہی کو ختم کر دیا ہے اور دین کو صوم و صلوٰۃ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں کے جرائد میں بعض تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔"

جواب

جہاد بلاشبہ اسلام میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر جہاد کو قتال کے معنی میں لینا اتنا ہی غلط ہے جتنا اس کو دین کی فہرست سے خارج کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ امت محمدی کا جہاد، دعوت ہے۔ قرآن میں شہادت حق کی راہ میں قوت صرف کرنے کو جہاد کہا گیا ہے (حج۔ آخر) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کے اوپر تبلیغی جہاد کرو (فرقان۔ ۵۲) قرآن میں دعوت کا حکم آیا تو خود اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک بھاری حکم (مزمل۔ ۵) قرار دیا۔ دعوت و تبلیغ کو اتنا بڑا کام بتایا گیا کہ اس میں پوری طرح لگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہلکان کرلے (لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ) موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تحریکوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان میں یہ غلطی سرفہرست ہے کہ انھوں نے جہاد کا مطلب قتال یا سیاسی معرکہ آرائی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کا میدان، دعوت کے بجائے سیاست بن گیا اور مومنانہ سرفروشی کے جذبہ کی تسکین کے لئے اس دنیا میں صرف دو کام باقی رہ گئے ــــ اگر موقع ہو تو تلوار زنی ورنہ تقریر بازی۔ مصر، الجزائر اور ہندستان اس کی نمایاں مثال ہیں۔ ان علاقوں میں جب "استعمار" یا "باطل اقتدار" کے خلاف جنگ و پیکار کے مواقع تھے تو لاکھوں مجاہدین اپنے جان و مال کی قربانی دیتے رہے، اور جب اس کا موقع ختم ہوگیا تو اب انھیں اس کے سوا کوئی کام نظر نہیں آتا کہ مفروضہ طاغوتی سیاست کے خلاف تحریر و تقریر کے لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اور جب اس کا موقع بھی باقی نہ رہے تو گوشہ گیر ہوکر "ختم خواجگان" کے ورد شروع کر دیں!

جہاد ہی وہ طاقت ہے جس سے اسلام اس زمین پر قیام و استحکام حاصل کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر جذبہ جہاد کے استعمال کے باوجود اسلام کو اس دور میں قیام و استحکام حاصل نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا جذبہ اپنے نکاس کا صحیح راستہ نہ پاسکا اور غلط سمت میں بہہ کر ضائع ہوگیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ایک بڑے دریا کا پانی بے پناہ مقدار میں بہہ کر سمندر میں جا گرے اور اس کے ساحل کے دونوں طرف کھیتیاں پانی نہ ملنے کے باعث سوکھ کر ختم ہو رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ دریا کے پانی کو ان کھیتوں کی طرف موڑنے کا انتظام نہ ہوسکا تھا۔

دعوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے کان میں کچھ الفاظ ڈال دیئے جائیں یا ان کی غلط روش پر تنقید کر دی جائے ــــ حقیقت یہ ہے کہ دعوت ایک انتہائی قربانی کا عمل ہے۔ اپنا وقت، اپنے جذبات، اپنا مال، غرض اپنا سب کچھ قربان کردینے کے بعد وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو دعوت کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ مدعو کے لئے داعی کے دل میں انتہائی خیر خواہی ہو، جو بات کہی جائے وہ قول بلیغ کی زبان میں اور مخاطب کی

> نفرت کے جواب میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور محبت کے جواب میں محبت۔ اسی لئے اسلام نے یہ طریقہ سکھایا ہے کہ کسی کو غلطی کرتے دیکھو تو اس کو حکمت و محبت کے ساتھ سمجھاؤ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو سمجھاتا ہے

عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں فجر کی جماعت میں اس لئے پیچھے رہ جاتا ہوں کہ فلاں صاحب ہماری مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو بہت لمبا کر دیتے ہیں۔" آپ یہ سن کر غضبناک ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس سے زیادہ غضبناک میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

یا ایہا الناس ان منکم منفرین، فمن ام منکم الناس فلیتجوز، فان خلفه الضعیف والکبیر و ذالحاجة (بخاری)

لوگو، تم میں کچھ ایسے ہیں جو لوگوں کو دین سے دور کر دیتے ہیں۔ تم میں سے جو شخص لوگوں کی امامت کرے، اس کو چاہئے کہ مختصر نماز پڑھائے، کیونکہ اس کے پیچھے کوئی کمزور ہے، کوئی بوڑھا، کوئی ضرورت مند۔

حضرت جابرؓ ایک روایت میں بتاتے ہیں کہ معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ یہاں سے واپس ہو کر جاتے اور اپنے محلہ والوں کی امامت کرتے۔ ایک دن انھوں نے عشاء کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقر پڑھی۔ ایک آدمی لمبی قرأت سے گھبرا کر نماز سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت معاذ اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے اس آدمی کو کچھ نہیں کہا۔ البتہ حضرت معاذ کی بابت فرمایا: فتان، فتان، فتان (فتنہ انگیز، فتنہ انگیز، فتنہ انگیز) بخاری

اس سلسلے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ وہ ہے جب کہ ایک دیہاتی شخص آیا اور مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تو آپ نے لوگوں کو روکا۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہو چکا تو آپ نے گندگی کی صفائی کرائی اور صحابہ سے فرمایا:

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری)

تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

قدیم زمانہ میں کعبہ کی عمارت ایک بار بارش کی زیادتی سے گر گئی تھی۔ قریش نے دوبارہ بنایا تو سامان کی کمی کی وجہ سے اصل بنائے ابراہیمی پر نہیں بنایا، بلکہ چھوٹا کر کے بنایا۔ آپ چاہتے تھے کہ اس کو دوبارہ بنائے ابراہیم کے مطابق بنوا دیں مگر اس اندیشہ سے کہ کعبہ کی عمارت کے ساتھ جو تقدس شامل ہے اس کی وجہ سے لوگ شاید اس کے انہدام کا تحمل نہ کر سکیں، آپ اس سے باز رہے۔ آپ نے ایک بار حضرت عائشہ سے فرمایا:

لولا حداثة قومك بالكفر لنقضت البيت ثم لبنيته على اساس ابراهيم

اگر تمھاری قوم نئی نئی کفر سے نہ نکلی ہوتی تو میں بیت اللہ کو توڑ کر پھر سے ابراہیم کی بنیاد کے مطابق بنا دیتا۔

جس اسلام میں انسان کی رعایت کا یہ حال تھا، اسی اسلام کے علمبردار آج انسان کو متنفر کرنے ہی کا نام اسلام سمجھتے ہیں۔

غلط استدلال

سورہ انفال (آیت ۴۱) میں یہ حکم ہے کہ اموال غنیمت کا خمس ریاست کا حصہ ہے اور بقیہ فوجیوں کا۔ ابتدائی دور میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ مدائن، جلولار، حمص، حلب وغیرہ فتح ہوئے تو ان کے اموال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ ریاست کو بھیج دیا گیا اور بقیہ چار حصے فوجیوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ واضح ہو کہ اس زمانہ میں فوجی با تنخواہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ رضا کارانہ طور پر لڑنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سواد عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو فاتح فوجیوں نے چاہا کہ ان زمینوں کو بھی اسی طرح تقسیم کیا جائے، جس طرح اس سے پہلے اموال تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ زمینیں تم لوگوں کو دے دوں تو دوسرے مسلمانوں کے لئے کیا رہے گا۔ اور حکومت کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ (فما نا تسدّ به الثغور وما یکون للذریۃ والارامل) اس مسئلہ پر کئی روز تک بحث ہوتی رہی۔ فوجیوں کا کہنا تھا کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔ اس لئے ہم کو ملنا چاہیے (انقفت ما افاء اللّٰه علینا باسیافنا علیٰ قوم لم یحضروا) بالآخر فیصلہ حضرت عمرؓ کی رائے پر ہوا۔

جو لوگ اجتماعی ملکیت کے نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، وہ اس واقعہ سے دلیل لاتے ہیں کہ انفرادی ملکیت کو منسوخ کرکے اجتماعی ملکیت قائم کرنا اسلام میں جائز ہے۔ مگر اس واقعہ سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ اور ان کے ہم خیال (عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ وغیرہ) کی جو گفتگوئیں اور تقریریں منقول ہوئی ہیں، ان سے بالکل یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان زمینوں کو فی الواقع فوجیوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور اس کے باوجود ان کو چھین کر ریاستی ملکیت بنانا انھوں نے جائز سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ زمینیں تو ابھی نئی نئی فتح ہوئی تھیں اور ان پر ملکیت کے تحقق کا سوال تھا نہ کہ فرد کی ملکیت سے نکال کر اجتماع کی ملکیت میں دینے کا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی تقریر میں واضح لفظوں میں کہا کہ یہ زمینیں تمھاری ملکیت نہیں ہیں۔ اگر وہ تمھاری ملکیت ہوتیں تو میں ان کو چھیننا اپنے لئے جائز نہ سمجھتا:

قد سمعتم کلام هٰولاء القوم الذین زعموا انی اظلمهم حقوقهم وانی اعوذ باللّٰه ان ارکب ظلما۔ لئن کنت ظلمتهم شیئا هولهم واعطیته غیرهم لقد شقیت

الفاروق عمرؓ از محمد حسنین ہیکل

الجزء الثانی صفحہ ۲۹۶

تم لوگوں نے ان فوجیوں کی گفتگو سنی جن کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق غصب کر رہا ہوں۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ کسی کا حق غصب کروں۔ اگر میں ایسا کروں کہ ایک چیز جو ان کی ہو، اس کو لے کر کسی دوسرے کو دے دوں تو میں شقی ہوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اجتماعی ملکیت کے نظریہ کی تردید ہے۔ کیونکہ اس میں خلیفہ دوم صاف لفظوں میں فرما رہے ہیں کہ مجھ کو (بالفاظ دیگر حکومت کو) تمھاری کسی ملکیت کو منسوخ کرنے کا حق نہیں۔ اگر میں ایسا کروں، تو میں شقاوت کا مرتکب ہوں گا۔ یہ واقعہ اس کے برعکس بات ثابت کر رہا ہے جس کے لئے اسے پیش کیا جاتا ہے ■■■

ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں

ایک حدیث ہے:

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الایمان بضع وسبعون شعبة، فافضلها قول لا اله الا الله، وادناها اماطة الاذی عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کا کہنا ہے اور سب سے کم راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

(رواہ الستہ وغیرہم بالفاظ مختلفہ)

اس حدیث میں "ستر" کا عدد محض زیادتی کے مفہوم کو بتانے کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایتوں میں دوسرے اعداد بھی آئے ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ۷۷ کا عدد بتایا گیا ہے۔ مگر لوگوں کو ہمیشہ یہ شوق رہتا ہے کہ حقیقتوں کو مقداری اصطلاحوں میں بیان کر سکیں، اس لئے بہت سی طبیعتیں اس تلاش میں لگ گئیں کہ وہ ستر شاخوں کی گنتی کریں، حتیٰ کہ ان ستر شاخوں کے تعین کے لئے علماء نے بہت سی مستقل کتابیں لکھ ڈالیں۔ مثلاً فوائد المنہاج از ابو عبداللہ حلیمی، شعب الایمان از بیہقی، شعب الایمان از عبدالجلیل، کتاب النصائح از اسحاق بن قرطبی، وصف الایمان از ابوحاتم وغیرہ۔

امام ابوحاتم بن حبان فرماتے ہیں کہ میں ایک مدت تک اس حدیث کا مطلب سوچتا رہا۔ جب جادتوں کو گنتا تو وہ ستر سے بہت زیادہ ہو جاتیں۔ احادیث میں چھان بین کرتا اور حدیث میں جن چیزوں کو نام لے کر ایمان کی شاخوں کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، ان کو گنتا تو وہ اس عدد سے کم ہو جاتیں۔ قرآن کی طرف متوجہ ہوا اور قرآن میں جن چیزوں کو ایمان کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے، ان کو شمار کیا تو وہ بھی ستر سے کم نکلا۔

اس کے بعد میں نے قرآن اور حدیث دونوں کو جمع کیا۔ دونوں میں جن چیزوں کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے، ان کو گنا، جو چیزیں دونوں میں مشترک تھیں ان کو ایک ایک عدد شمار کر کے میزان نکالی تو دونوں کا مجموعہ، مکررات کو الگ کر کے، اس عدد کے موافق ہو گیا۔

کچھ دوسرے لوگ جو ساری کوششوں کے باوجود اپنی فہرست ایمان کو ۷۰ یا ۷۷ کے موافق نہ بنا سکے، انھوں نے کہہ دیا کہ اللہ و رسولہ اعلم۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے ان شاخوں کی تفصیل بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اجتہاد سے ان تفصیلات کے مراد ہونے کا حکم لگایا ہے، حالانکہ اس مقدار کی تعیین معلوم نہ ہونے سے ایمان میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ خطابی لکھتے ہیں کہ اس تعداد کی تفصیل اللہ اور اس کے رسول کے علم میں ہے اور شریعت مطہرہ میں موجود ہے۔ اس لئے تعیین کے ساتھ ان کی تعداد کا معلوم نہ ہونا کچھ مضر نہیں۔ نووی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاخوں میں سب سے اعلیٰ توحید کو قرار دیا ہے اور سب سے نیچے جو ہے وہ دفع کرنا ہے اس چیز کا جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا احتمال رکھتی ہو۔ باقی سب شاخیں ان کے درمیان ہیں جن کی تفصیل معلوم ہونا ضروری نہیں۔ اجمالاً ان پر ایمان لانا کافی ہے، جیسا کہ سب فرشتوں

پر ایمان لانا ضروری ہے مگر ان کی تفصیل اور ان کے نام ہم نہیں جانتے۔

حقیقت کو مقداری اصطلاحوں میں بیان کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں ہے، اس کے بعد پورے دین کا تصور ہی بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر احادیث میں بعض کلمات و اذکار کی فضیلت آئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث ہے:

عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لو جیٔ بالسموٰات والارض ومن فیھن ومابینھن وماتحتھن فوضِعنَ فی کفۃ المیزانِ ووُضِعتْ شھادۃُ ان لا الٰہ الا اللّٰہ فی الکفۃ الاخریٰ لرجحتْ بھن

اخرجہ الطبرانی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تمام آسمان و زمین لائے جائیں اور جو لوگ ان میں ہیں اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں یا ان کے نیچے ہیں، سب کا سب ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور لاالٰہ الا اللہ کی گواہی دینے کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً وہ جھک جائے گا۔

حقیقت کو مقداری اصطلاح میں بیان کرنے کا ذہن، اس قسم کی احادیث کے سلسلے میں، سب سے پہلے یہ کرتا ہے کہ "گواہی دینے" کو "پڑھنے کے معنے میں لے لیتا ہے۔ حالانکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص محبت کی تعریف میں کہے: محبت نام ہے اپنی زبان سے یہ جملہ بولنے کا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" اب اگر ایک باپ کو اپنے بیٹے سے محبت ہے تو اس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر ایک لاکھ بار محبت محبت کا ورد کر لیا کرے۔

اس کے بعد دوسری شدید تر غلطی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس ذہن کے سامنے وہ روایتیں آتی ہیں جن میں ذکر اور استغفار کے کلمات کی کثرت کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا: باقیات صالحات (مریم) کو کثرت سے کہا کرو۔ پوچھا گیا وہ کیا ہیں۔ فرمایا تکبیر، تہلیل، تسبیح، تحمید اور لاحول ولا قوۃ۔ اسی طرح ایک روایت ہے:

عن ابی بکر ن الصدیق عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: علیکم بلا الٰہ الا اللّٰہ والاستغفار فاکثروا منھا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاالٰہ الا اللہ اور استغفار تمھارے لئے ضروری ہیں، پس ان میں کثرت کرو۔

کہنے یا شہادت دینے کو "پڑھنے" کے معنی میں لینے کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوتا ہے کہ ذکر کی کثرت "ورد کی کثرت" کے معنی میں ڈھل جاتی ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ ذکر کے مسنون اور غیر مسنون کلمات کو یاد کر لیا جائے اور ان کو تسبیح کے دانوں پر شمار کیا جاتا رہے۔ ایسے ایسے مشائخ فن پیدا ہونے لگتے ہیں جن کے ذکر کی مقدار لاکھوں سے گزر کر کروروں کی گنتی تک پہنچ جاتی ہے۔

جامع الاصول میں لکھا ہے کہ لفظ اللہ کا ذکر ورد کے طور پر کم ازکم پانچ ہزار روزانہ کی مقدار ہے۔ اور زیادہ کے لئے کوئی حد نہیں۔ صوفیاء کے لئے کم ازکم پچیس ہزار روزانہ کی مقدار ہے۔ لاالٰہ الا اللہ کی مقدار کے متعلق لکھا ہے کہ کم ازکم پانچ ہزار روزانہ ہونا چاہئے۔ شاہ ولی اللہ نے قول جمیل میں اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ میں ابتدائے سلوک میں ایک سانس میں لاالٰہ الا اللہ دو سو مرتبہ کہا کرتا تھا۔ صوفیاء کے یہاں ایک اصطلاح وضع ہوئی جس کو پاس انفاس کہا جاتا ہے یعنی اس بات کی مشق کہ کوئی سانس اللہ کے ذکر کے بغیر نہ اندر جائے نہ باہر آئے۔ کروروں لوگوں نے ریاضت کرکے باقاعدہ اس کی مشق حاصل کی۔

ذکر کے معنی عربی زبان میں یاد کے ہیں۔ اللہ کا ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ کے خوف اور اس کی محبت سے

سے اس طرح بھر جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنے محبوب ترین دوست کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دے جس کی وجہ سے بار بار کلمات شکر اس کی زبان سے نکلتے رہیں۔ آخرت اس کو اتنی بڑی حقیقت دکھائی دینے لگے جو اس کی ساری زندگی کو بے چین کر دے اور بے تابانہ اس کی زبان سے استغفار کی دعائیں ٹپکنے لگیں۔

ذکر نہ ورد ہے نہ تکرار الفاظ۔ یہ انتہائی واقعہ ہے جو پوری انسانی زندگی کو متاثر کر کے رکھ دیتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ بندہ جب تکبیر (اللہ اکبر) کہتا ہے تو اس کا نور زمین سے آسمان تک سب چیزوں کو ڈھک لیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبہ میں فرمایا، جو شخص لا الٰہ الا اللہ کو اس طرح کہے کہ خلط ملط نہ ہو تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ علی بن ابی طالب نے پوچھا کہ خلط ملط کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا: دنیا کی محبت اور اس کی طلب میں لگ جانا۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص لا الٰہ إلا اللہ اخلاص کے ساتھ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا لا الٰہ الا اللہ کا اخلاص کیا ہے۔ فرمایا: وہ آدمی کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یموت عبد یشهد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ یرجع ذلک الیٰ قلب مومن الا دخل الجنۃ (وعن عمر ان بلفظ) من علم ان اللہ ربہ وانی نبیہ موقنا من قلبہ حرمہ اللہ علی النار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرے کہ اس نے گواہی دی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور یہ بات اس کے قلب سے نکلی ہو، تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ (دوسری روایت میں) جو اس بات کو جان لے کہ اللہ اس کا رب ہے اور میں خدا کا رسول ہوں، اس نے قلب سے اس کا یقین کیا ہو تو جہنم کی آگ اللہ اس کے لئے حرام کر دیتا ہے۔

شیخ محمد مہدی (م ۱۸۱۵ء) مصر کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، پھر اسلام قبول کیا۔ جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ اور اس کے بعد شیخ الازہر کے منصب پر سرفراز کئے گئے۔

احمد فارس شدیاق (۱۸۸۷-۱۸۰۴) لبنان کے مارونی عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اور مطالعہ کے بعد ادبی حیثیت سے بہت نمایاں ہوئے۔ لندن کی تورات سوسائٹی نے ان کو تورات کے ترجمہ کے لئے بلایا۔ اسی طرح کے اور بہت سے علمی اور ادبی مرتبے ان کو حاصل ہوئے۔ آخر میں تونس پہنچ کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام احمد رکھا۔

عالم عرب میں اس طرح کے بہت سے عیسائی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی کسی تبلیغی کوشش کے بغیر اسلام قبول کر لیا۔ عرب کے مسلمان اگر سیاسیات میں نہ الجھتے اور تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تو یقینی ہے کہ وہ زمین ہی ختم ہو جاتی جس پر فلسطین اور لبنان جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ذکر و دعا کی حقیقت

"فلاں دعا بہت مجرب ہے، اس کو پڑھا کرو"۔ "فلاں ذکر کی بڑی فضیلت ہے، صبح و شام اس کا ورد کیا کرو"۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ بے شمار کتابیں لوگوں نے لکھ رکھی ہیں جن میں اس قسم کے "مجربات" جمع کیے گئے ہیں۔ حتی کہ کتنی بزرگی کی دکانیں اسی لیے قائم ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو دعاؤں اور اذکار کے قیمتی نسخے معلوم ہیں، لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں اور وہ پُراسرار طور پر ان کو ایسے مجربات کی تلقین کرتے ہیں جو ان کو سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں۔

مگر یہ ساری باتیں قطعاً بے اصل ہیں۔ دعا یا ذکر کوئی جادو کا منتر نہیں ہے جس کے سارے کمالات کچھ مقرر الفاظ میں چھپے ہوئے ہوں۔ اگر یہ خاص الفاظ مقرر طریقے پر زبان سے پڑھ دیے جائیں تو اس کی تاثیر ظاہر ہو جائے گی اور اگر الفاظ اور طریقے میں کچھ فرق ہو گیا تو منتر کا طلسماتی کمال ظاہر نہیں ہوگا۔ دعا یا ذکر دل کی کیفیات اور اندرونی تڑپ کا نام ہے نہ کہ پُراسرار الفاظ کے کسی مجموعہ کا۔

قصہ مشہور ہے کہ کہیں ایک بند محل تھا۔ اس محل کے اندر بے شمار خزانہ بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ کسی کنجی سے نہیں کھلتا تھا، بلکہ ایک منتر سے کھلتا تھا۔

ایک شخص کو اس محل کی تلاش ہوئی۔ برسوں تک پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے کے بعد اسے ایک شخص ملا جو اس جادوئی محل کا راز جانتا تھا۔ اس نے اس کا پتہ بتایا اور کہا کہ تم اس کے سامنے پہنچو تو کہنا "کھل اے سم سم"۔ یہ کہتے ہی محل کا دروازہ کھل جائے گا اور تم اس میں داخل ہو جانا۔

اب آدمی نے سفر شروع کیا۔ چلتے چلتے بالآخر وہ خزانہ کے اس محل تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس کو کھولنے کا منتر بھول گیا۔ وہ محل کے بھاری دروازہ کے سامنے کھڑا ہو کر طرح طرح کے ملتے جلتے الفاظ دہراتا رہا: ثم ثم، بم بم، چم چم۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کیونکہ وہ تو ایک خاص لفظ کے بولنے ہی سے کھلتا تھا اور آدمی وہ لفظ بھول چکا تھا۔

وہ دوبارہ محل کے عارف کی طرف روانہ ہوا اور دریاؤں اور بیابانوں کا سفر کر کے اس سے ملاقات کی۔ عارف نے دوبارہ اس کو بتایا کہ اس جادوئی محل کا منتر "سم سم" ہے۔ اب اس نے اس منتر کو خوب رٹ ڈالا اور دوبارہ سفر کر کے محل کے پاس پہنچا۔ اب وہ محل کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کو اس کا جادوئی منتر خوب یاد تھا۔ اس نے کہا "کھل اے سم سم"۔ ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ محل کا دروازہ کھل گیا اور خزانوں کی چمکتی ہوئی دنیا اس کے سامنے آگئی۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا اور ذکر بھی اسی طرح "سم سم" کی قسم کے منتر ہیں، مگر یہ دین سے انتہائی ناواقفیت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ اخبات و انابت (دل کا جھکاؤ اور توجہ) ہے نہ کہ لفظی طلسمات۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دیہاتی کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ بیتابانہ اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لمبی تلاش اور دوڑ دھوپ کے بعد جب اونٹ اس کو ملا تو اس کا دل شکر الٰہی کے جذبہ سے بھر گیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:

اللھم انت عبدی وانا ربك خدایا تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔

لفظوں کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ کفر کا کلمہ ہے۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالے کو اتنے پسند آگئے کہ اس کو خدا کے مقبول بندوں میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں "اللہ ہمارے ظاہر کو نہیں دیکھتا، وہ ہمارے قلب اور ہمارے باطن کو دیکھتا ہے۔"

دعا اور ذکر دین کی سب سے اعلیٰ حقیقتیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ پُراسرار قسم کی عربی منتر ہیں۔ ان کو رٹ کر خاص خاص وقت میں دہرا دو، اور محل کے دروازے کھل جائیں گے۔ دعا کی حقیقت بندے کا اپنے مالک کو پکارنا ہے۔ اسی طرح ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور محبت اس طرح دل پر چھا جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔

دعا اور ذکر وہی افضل ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے، خواہ وہ اپنی مادری زبان میں ہو۔ خواہ اونٹ والے کی طرح وہ بے ڈھنگے الفاظ میں کیوں نہ ادا ہوئی ہو۔

خلیفہ ثانی کی نصیحت

حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں عراق پر شاہان کسری کا قبضہ تھا۔ اس وقت جس بادشاہ کی حکومت تھی اس کا نام یزد جرد تھا۔

عراق کے ساتھ لڑائی کے زمانہ میں ایک بار خلیفہ ثانی نے ارادہ کیا کہ وہ خود محاذ جنگ پر جا کر اسلامی فوجوں کی کمان کریں، مدینہ میں مشورہ ہوا۔ اکثر مسلمانوں کی رائے ہوئی کہ آپ کو خود جانا چاہئے۔ مگر خواص نے رائے دی کہ آپ دار السلطنت میں ٹھہریں اور یہاں رہ کر لشکروں کی روانگی کا انتظام کریں، یہی زیادہ بہتر ہے۔

دوسری رائے کے حق میں فیصلہ ہوا اور سعد بن ابی وقاص کو عراق روانہ کیا گیا جہاں اس وقت قادسیہ کے مقام پر جنگ ہو رہی تھی۔ حضرت سعد روانہ ہونے لگے تو حضرت عمر نے ان کو وصیت فرمائی۔ اس وصیت کا خلاصہ یہ تھا:

"سعد! تمھیں یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ تم رسول اللہ کے ماموں کہلاتے ہو اور آپ کے صحابی ہو۔ اللہ برائی کو برائی سے نہیں دھوتا بلکہ برائی کو بھلائی سے دھوتا ہے۔ اللہ اور بندوں کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں۔ اس کے یہاں صرف اس کی بندگی مقبول ہوتی ہے۔ اللہ کے یہاں شریف رذیل سب برابر ہیں۔ سب اس کے بندے ہیں اور وہ سب کا رب ہے۔ اس کے انعامات بندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہر معاملہ میں اس چیز کو دیکھنا جو رسول اللہ کا طریقہ تھا، یہی عمل کی چیز ہے۔ میری اس نصیحت کو یاد رکھنا۔ تم ایک بڑے کام کے لئے بھیجے جا رہے ہو۔ اس سے چھٹکارا صرف حق کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو خیر کا عادی بنانا۔ اللہ کے خوف کو اختیار کرنا۔ اور اللہ کا خوف دو باتوں میں جمع ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت میں اور گناہ سے پرہیز کرنے میں۔ اور اللہ کی اطاعت جس کو بھی نصیب ہوئی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے محبت کے ذریعہ نصیب ہوئی۔

خدا کی کائنات میں غور و فکر سب سے بڑی عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ ایک گھڑی کا سوچنا ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کو یاد کرے، وہ ایسا ہے جیسے اکیلا کفار کے مقابلہ میں چل دیا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ اس دن اپنے سایہ کے نیچے جگہ دے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ پڑیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ عقل والے لوگ کہاں ہیں۔ لوگ پوچھیں گے، عقل والے کون ہیں۔ جواب دیا جائے گا، وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے تھے اور کہہ اٹھتے تھے، خدایا تو نے ان کو عبث پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ ابن ابی الدنیا نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار صحابہ کی ایک جماعت کے پاس آئے۔ وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا، کیا سوچ رہے ہو۔ انھوں نے جواب دیا، اللہ کی مخلوقات میں غور کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں اللہ کی ذات میں غور نہ کرو، اللہ کی مخلوقات میں غور کیا کرو۔

ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص چھت پر لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس پر خدا کی عظمت کا تاثر قائم ہوا اور بولا: "خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ تمھارا پیدا کرنے والا کوئی ضرور ہے، اے اللہ تو مجھے بخش دے۔" خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ بخش دیا گیا۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں، ایک ساعت کا غور تمام رات کی عبادت سے افضل ہے۔ ام درداء سے پوچھا گیا کہ ابو درداء کی محبوب عبادت کیا تھی، فرمایا غور و فکر۔ ابوہریرہ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ساعت کا غور و فکر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی وہ مخفی یاد جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں، اس کا ثواب ستر درجہ زیادہ ہے۔

عبادہ بن صامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ بہترین ذکر خاموش ذکر ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔ ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو، پوچھا گیا، ذکر خامل کیا ہے۔ فرمایا "مخفی یاد۔"

یہی وہ ذکر (یاد الٰہی) ہے جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ جو ایسا کرے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ   نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دنیا ملعون ہے اور جو کچھ

جب آدمی خدا کی حمایت سے محروم ہو جاتا ہے

عن خباب ابن الارت قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃً فاطالہا۔ قالوا یارسول اللہ صلیت صلوۃً لم تکن تصلیہا۔ قال اجل۔ انہا صلوۃُ رغبۃٍ ورھبۃٍ وانی سألتُ اللہ فیہا ثلثا فاعطانی ثنتین ومنعنی واحدۃً۔ سألتہ ان لایُھلِکَ امتی بسَنَۃٍ فاعطانیہا وسألتہ ان لا یسلّط علیھم عدوّاً من غیرھم فاعطانیہا وسألتہ ان لا یذیق بعضھم بأس بعض فمنعنیہا (مسلم، ترمذی، نسائی)

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ ایک نماز پڑھی اور اس کو لمبا کیا۔ لوگوں نے کہا: اے خدا کے رسول آپ نے ایسی نماز پڑھی جو آپ نے اس سے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ امید اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین چیزیں مانگیں۔ اللہ نے دو چیزیں دے دیں اور ایک سے انکار فرمایا۔ میں نے درخواست کی کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کیا جائے۔ یہ قبول ہوگئی۔ میں نے درخواست کی کہ ان کے اوپر ان کے باہر کے دشمنوں کو مسلط نہ فرما۔ یہ قبول ہوگئی۔ میں نے درخواست کی کہ میری امت کے بعض کی طاقت کا مزا بعض کو نہ چکھائے۔ مگر یہ منظور نہیں ہوئی۔

مسلمان اس سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں کہ وہ ارضی وسماوی آفتوں سے ہلاک کئے جائیں۔ وہ اس سے بھی محفوظ ہیں کہ ان کا کوئی خارجی دشمن ان کے اوپر مستقل قبضہ پالے۔ مگر ایک چیز ایسی ہے جہاں وہ خدا کی حفاظت میں نہیں ہیں۔ وہ یہ کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی طاقت کا مزا چکھنا پڑے۔ یہی وہ اصل مقام ہے جہاں مسلمانوں کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اگر یہاں بھی ان پر حفاظت قائم کر دی جاتی تو ان کا امتحان ختم ہو جاتا، اور یہ قیامت سے پہلے کسی کے لئے ممکن نہیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ ایک مسلمان اپنی طاقت کو دوسرے مسلمان کے خلاف استعمال کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اس حد میں داخل ہو گیا جہاں خدا نے اپنے رسول کی دعا کے باوجود اس کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دکھ پہنچائے، وہ موقع پاکر اس کے اوپر چڑھ دوڑے، وہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کو زک دینے کے درپے ہو جائے، وہ اپنی حیثیت کو دوسرے مسلمان کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرے تو گویا یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی اللہ کی پہریداری سے باہر نکل گیا۔ اب وہ شیطان کی حمایت میں ہے۔ اس نے اپنے آپ کو شیطان کے قابو میں دے دیا ہے اور شیطان اس کو اندھا بنا کر اس سے وہ کام کر وا رہا ہے جو اللہ نے اس کے لئے دائمی طور پر حرام قرار دیا تھا۔ کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اپنی طاقت کا مزہ چکھانا، اس کے لئے خوشی کا نہیں بلکہ ماتم کا وقت ہے ایسا ہر واقعہ اس بات کا اعلان ہے کہ آدمی رسول کی شفاعت کے حق سے محروم ہو گیا ہے، اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں نہ اللہ اس کا ساتھی ہے اور نہ اللہ کا رسول۔

خدا کے دوست

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
ان اللہ تعالیٰ قال:۔ من عادیٰ لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب وما تقرب الی عبدی بشیئٍ احبّ الیّ مما افترضتہ علیہ ولا یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتّٰی احبّہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا ولئن سألنی لاعطینّہ ولئن استعاذنی لاعیذنّہ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کرے تو میں اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتا ہوں۔ میری سب سے زیادہ محبوب چیز جس سے میرا بندہ میری قربت حاصل کرتا ہے وہ ہے جو میں نے اس کے اوپر فرض کی ہے۔ اور میرا بندہ نفل اعمال کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اس کو دیتا ہوں اگر وہ میری پناہ چاہے تو میں ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں بندوں کے اوپر فرض کی ہیں، مثلاً پانچ وقت کی نماز۔ سال میں مقرر شرح سے زکوٰۃ، جائز حدود میں کمائی وغیرہ۔ مگر آدمی کا تعلق جب اللہ سے بڑھتا ہے تو اس کا عمل فرض کے دائرہ میں محدود نہیں رہتا۔ اللہ کی طرف بڑھی ہوئی توجہ اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر عمل کرے۔ وہ پانچ وقتوں کے علاوہ اوقات میں بھی اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ وہ مقررہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ وہ اللہ کے کام میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ جائز حدود میں کمائی کرنے کا موقع بھی اس کے لئے باقی نہیں رہتا۔ کوئی آدمی جب اپنے کو اللہ میں اس طرح شامل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کا پورا وجود اللہ میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ شعور کی اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا شعور اللہ کے شعور سے الگ نہیں رہتا۔ معاملات کا تجزیہ کرنا، معاملات کے بارے میں رائے قائم کرنا، معاملات میں تدبیر اختیار کرنا، غرض اس کا ہر عمل سنت الٰہی کے مطابق ہو جاتا ہے۔

اللہ کا جو بندہ اپنے آپ کو اس طرح اللہ میں شامل کرلے وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔ اللہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو دوست کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایسا بندۂ خدا خواہ بظاہر کمزور ہو مگر اس کی پشت پر خدا کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے لڑنا خدا سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے فہم اور ذوق کے اعتبار سے ایسا بن جاتا ہے کہ خدا سے وہی چیز مانگے جو اس سے مانگنے کی ہے۔ اس لئے جب وہ مانگتا ہے تو خدا ضرور اس کی مانگ کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس سے اسی چیز کی پناہ چاہتا ہے جس کی پناہ کے لئے خدا سے درخواست کرنا چاہیے، اس لئے جب وہ خدا سے پناہ مانگتا ہے تو خدا ضرور اس کو اپنی پناہ عطا کرتا ہے۔

برائی کو روکو

ما من قوم یُعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علیٰ ان یغیروا فلم یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقاب (ابوداؤد، ترمذی)

کسی بھی قوم میں اگر گناہ کیے جائیں اور قدرت رکھنے کے باوجود لوگ گنہ گاروں کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ خدا ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرون بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً منہ ثم تدعونہ فلا یستجیب لکم (ترمذی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور ہے کہ تم لوگ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روو۔ ورنہ جلد ہی خدا تم سب پر عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم خدا کو پکارو گے مگر وہ تم کو کوئی جواب نہ دے گا۔

حدیث میں اس قسم کی جو ہدایتیں نقل ہوئی ہیں وہ اصلاً سماجی ہدایتیں ہیں نہ کہ سیاسی ہدایتیں۔ یعنی ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی حکمراں کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور و غل کرو اور انصاف قائم کرنے کے نام پر اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلاؤ۔ اس قسم کی اسلامی سیاست محض موجودہ زمانہ کی سیاسی پارٹیوں کی نقل ہے۔ اس کا مذکورہ اسلامی ہدایات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ہدایات کا مخاطب معاشرہ کا ہر فرد ہے نہ کہ کوئی سیاسی نظام۔

کسی معاشرہ میں ہمیشہ تھوڑے آدمی ہوتے ہیں جو شرارت کرتے ہیں۔ اب اگر معاشرہ ایک زندہ معاشرہ ہو تو جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو ستا رہا ہے۔ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو تکلیف دے رہا ہے۔ ایک صاحب معاملہ دوسرے صاحب معاملہ کے حقوق ادا نہیں کرتا تو ایسے معاشرہ میں مظلوم کو خود اپنے آس پاس ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اس کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔ وہ ظالم کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آئے۔ ایسے سماج میں برائیاں پیدا ہوتی ہیں مگر وہ وہیں کی وہیں دبا دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ اپنے سامنے ظلم و زیادتی کے واقعات دیکھیں مگر غیر جانب دار بن کر رہ جائیں تو دھیرے دھیرے ان خرابیوں سے ایسے فتنے ابھرتے ہیں جو پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

ماحول کا دباؤ سب سے بڑا دباؤ ہے۔ حتیٰ کہ حکومت اور عدالت سے بھی زیادہ۔ اگر آس پاس کا ماحول ظالم کو روکے اور مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جائے تو کبھی برائیاں پھیل نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس جب ماحول برائی کو دیکھنے کے باوجود خاموش رہے تو بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی اور دوسری طرف مظلوم کے اندر انتقام اور بے اعتمادی۔ یہ دونوں چیزیں وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ برائیاں بڑھ کر خود ان لوگوں کو جھلس دیتی ہیں جو اپنے کو مامون سمجھ کر ان کے معاملہ میں غیر جانب دار بن گئے تھے۔

تقویٰ کی علامت

قرآن میں قربانی کے جانور کو شعیرہ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (الحج ۳۷) اگر جانوروں کی قربانی سے سادہ طور پر صرف جانور کی قربانی مراد ہو تو یہاں یہ کہنا بے موقع ہے کہ خدا کو تمہارا ذبح کیا ہوا جانور نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام میں کچھ چیزیں بطور شعیرہ یا علامت (Symbol) مقرر کی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک قربانی کا جانور بھی ہے۔ شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی معنوی حقیقت کے لئے ظاہری علامت کا کام دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے اپنے مخالف اسلام جذبات کو اللہ کی خاطر ذبح کریں۔ یہ ایک نفسیاتی ذبح ہے اور اس نفسیاتی ذبح کی علامت کے طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ آدمی ایک جانور کو ذبح کرے۔

جانور کے ذبح کے وقت آدمی اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے: انّ صلاتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین (میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کی قربانی ایک معنوی حقیقت کی ایک ظاہری علامت ہے۔ اسی شخص کی قربانی قربانی ہے جو جانور کو ذبح کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ وہ اپنے پورے وجود کو اللہ کے لئے قربان کر رہا ہے۔ جس کے لئے ذبح کیا ہوا جانور اس کے اپنے جذبات واحساسات کے ذبیحہ کا محسوس پیکر بن جائے۔

روزہ بھی اسی قسم کا ایک شعیرہ (علامت) ہے۔ ترک طعام حقیقۃً ترک معاصی کی علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔ غذا آدمی کی ضروریات کی آخری حد ہے۔ روزہ میں غذا کا ترک بندہ کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ —— خدایا، دوسری چیزیں تو درکنار، میں پانی اور کھانا تک کو تیری خاطر چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پانی چھوڑ دے۔ روزہ کی اصل حقیقت غلط کاری سے بچنا ہے۔ جو شخص غلط کاری کو نہ چھوڑے اور وقتی طور پر صرف کھانا اور پینا چھوڑ دے اس نے گویا علامتی عمل کیا اور اصلی عمل کو چھوڑے رکھا۔ ایسی بے روح چیز کی خدا کو کیا ضرورت۔

احسن تقویم

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ (التین) میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا نے احسن تقویم (بہترین ساخت) پر پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے بعد خدائی نقشہ کے خلاف چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب سے نچلے مقام پر جا گرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کیا ہے اور دنیا میں اس کا امتحان کس اعتبار سے لیا جا رہا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے جنت کا شہری ہے۔ وہ خدا کا وہی مطلوب انسان ہے جس کو وہ اپنی خصوصی نعمتوں کی دنیا میں بسانا چاہتا ہے۔ انسان عملاً وہی ہے جو اس کو ہونا چاہئے۔

پھر انسان کا امتحان کیا ہے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ دنیا میں آزادانہ ماحول پا کر وہ بگڑ نہ جائے۔ وہ اپنے آپ کو اسی حال میں بچا کر رکھے جس حال میں خدا نے اس کو ابتداءً پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے شعور کو خدا کے تخلیقی نقشہ کا چوکیدار بنا لے۔

جو لوگ ایسا کریں کہ خدا نے جس شخصیت کے ساتھ انھیں پیدا کیا تھا اسی شخصیت کو لئے ہوئے وہ خدا تک پہنچیں، وہ خدا کی جنت کے باشندے قرار دئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کی بنائی ہوئی شخصیت کو محفوظ نہ رکھ سکیں وہ جنت میں بسنے کیلئے نااہل ٹھہریں گے۔ وہ کائناتی کوڑا خانہ میں پھینک دئے جائیں گے۔

مثال کے طور پر خدا کی تخلیق کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں دوعملی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دو دل والا انسان خدا کی پسند کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اب جو شخص ایسا کرے کہ اپنے ذہن میں متضاد افکار کو جمع کرے۔ مثلاً وہ ایک خدا کی بڑائی کا اقرار کرے اور اسی کے ساتھ وہ انسان کی بڑائی میں گم ہو۔ وہ ایسی زندگی گزارے جس میں اپنوں کے لئے کچھ ہو اور غیروں کے لئے کچھ۔ جہاں مفاد کا لالچ یا دباؤ کی مجبوری ہو وہاں وہ ایک رویہ اختیار کرے، اور جہاں مفاد یا دباؤ کا پہلو نہ ہو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان بن جائے۔

جس آدمی نے اپنے فکر و عمل کے لئے اس قسم کے دو معیار بنا رکھے ہوں وہ گویا احسن تقویم پر قائم نہیں۔ وہ خدا کی امانت کا نگہبان نہ بن سکا۔ اس نے خدا کی دی ہوئی شخصیت کو داغدار کر لیا۔ ایسا آدمی قرآن کے الفاظ میں اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو دوعملی اور تضاد فکری سے بچاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو، وہ گویا خدا کے یہاں وہی "انسان" لے کر پہنچا جو خدا نے اپنے منصوبہ کے تحت اسے دیا تھا۔ ایسا آدمی جنت کے باغوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ خدا کے یہ ابدی باغ ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

خدا کی یاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو اللہ کا بہت ذکر کرو (یاایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً، الاحزاب ۴۱) اس کا مطلب بعض لوگ یہ لیتے ہیں کہ خوب زیادہ اللہ اللہ کرو۔ "اللہ" کا لفظ ہزاروں بار دہراؤ۔ مگر اس قسم کے ذکر کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن میں ذکر کسی قسم کی لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یاد کے معنی میں مذکورہ آیت کا مطلب ہے ــــ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا (فاذکرونی اذکرکم، البقرۃ ۱۵۲) اس آیت میں خدا اپنے بندوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ذکر کو تکرارِ الفاظ کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ کیوں کہ خدا ایسا نہیں کرے گا کہ بندہ بندہ بار بار کہہ کر کسی کا ذکر کرے۔ یہاں ذکر لازمی طور پر یاد کے معنی میں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کا بہت زیادہ ذکر کرو (اکثروا ذکر ھادم اللذات) اس حدیث میں بھی ذکر لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ایسا کوئی بھی نہیں کرے گا کہ بیٹھ کر موت، موت، کہنے لگے۔ اس حدیث میں یقینی طور پر موت کا ذکر کرنے کا مطلب موت کو یاد کرنا ہے۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن پڑھتے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: ابو موسیٰ کو آل داؤد کی خوش الحانی دی گئی ہے (لقد اوتی ابو موسیٰ مزماراً من مزامیر آل داؤد)

روایات میں آتا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ہوتی تو اکثر ان سے کہتے کہ اے ابو موسیٰ، ہمارے رب کو ہمیں یاد دلاؤ (یا ابا موسیٰ ذکّرنا ربنا عزّ وجل) حضرت عمر کے اس قول میں بھی ذکر کسی قسم کے تکرار لفظی کے معنی میں نہیں ہے۔ یعنی حضرت عمر کا منشا یہ نہیں تھی کہ حضرت ابو موسیٰ ان کے پاس بیٹھ کر اللہ اللہ یا رب، رب کریں۔ اس فقرہ میں ذکر کا لفظ یاد کے معنی میں ہے۔ یعنی قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر ہمیں خدا کی یاد دلاؤ۔

لغت میں ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس لفظ کا یہی مفہوم شریعت میں بھی ہے۔ ذکر سے مراد اللہ اور اس باتوں کی یاد ہے۔ یعنی آدمی کو خدا سے اتنا گہرا تعلق ہو جائے کہ وہ اس کے دل و دماغ میں سما جائے۔ وہ ہر موقع پر اس کو یاد آتا رہے۔

آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ اللہ یہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون (عنکبوت ۳) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: کیا تم لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ تم کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ ان پر سختیاں گزریں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سن لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے (بقرہ ۲۱۴)

اسی طرح ارشاد ہوا ہے کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں کون لوگ ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (توبہ ۱۶) اسی طرح ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے سمجھا ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں جنھوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جو صبر کرنے والے ہیں (آل عمران ۱۴۲)

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الصالحون ثم الامثل فالامثل۔ یبتلی الرجل علی حسب دینہ فان کان فی دینہ صلابۃ زید لہ فی البلاء (تفسیر ابن کثیر)

سب سے زیادہ سخت آزمائش پیغمبروں کی ہے۔ ان کے بعد صالحین کی، پھر درجہ بدرجہ ان سے مشابہت رکھنے والوں کی۔ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ پس اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمائش میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کی جنت یا اس کی ترقی درجات کا فیصلہ معمول کی دین داری پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان خاص لمحات میں ہوتا ہے جب کہ اس کا رب اس کے دین کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی مقام پر ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

جنت میں کون لوگ آباد کیے جائیں گے

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور عاقبت صرف ڈرنے والوں کے لئے ہے۔ جو شخص بھلائی لے کر آیا تو اس کو ملے گا اس سے بہتر اور جو بدی لے کر آیا تو ایسے لوگوں کو جو بدی کے کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے (قصص ۸۳ - ۸۴)

موجودہ زندگی میں جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ گھمنڈ کی نفسیات سے پاک ہیں اور وہ بگاڑ کا مزاج نہیں رکھتے ہیں، ان کو جنت کی نفیس اور لطیف آبادیوں میں بسایا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ گھمنڈ کو اپنی غذا بنائیں، جن کی فسادی کارروائیوں سے ان کے پڑوسیوں اور ان کے متعلقین کو امن حاصل نہ ہو وہ جہنم کے پُر عذاب ماحول میں پھینک دئے جائیں گے۔

بڑا بننے کا مطلب کیا ہے۔ کوئی بھی شخص خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہیں بتاتا۔ نہ کوئی یہ دعویٰ لے کر اٹھتا کہ وہ زمین و آسمان یا سورج اور چاند سے بڑا ہے۔ بڑائی کا اظہار ہمیشہ انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ آدمی کا بڑا بننا یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے اوپر اپنا اقتدار قائم کرے۔ حالاں کہ وہ صرف عاجز اور بے طاقت وجود کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ کسی انسان کی طرف سے آئی ہوئی تنقید کے اوپر بھیر اٹھے۔ حالاں کہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں جو تنقید سے بالاتر ہو۔ اس کے پاس حق کا پیغام آئے تو وہ اس کو ماننے سے انکار کر دے حالاں کہ عبدیت کا تقاضا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے۔ کسی کے زبان یا قلم سے اس کے احساس برتری کو ٹھیس پہنچے تو وہ اس کو بخشنے کے لئے تیار نہ ہو۔ حالاں کہ برتری کا حق اس دنیا میں صرف ایک اللہ کو ہے۔

زمین میں فساد برپا کرنا کیا ہے۔ یہ کہ معاملات اور برتاؤ میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے خلاف ہو۔ قرآن کے مطابق فساد کی کچھ صورتیں یہ ہیں: اللہ سے نڈر ہو کر زندگی گزارنا (اعراف ۵۶) اللہ کے راستہ سے روکنا (نحل ۸۸) دلیل آجانے کے بعد اس کو نہ ماننا (آل عمران ۶۳) داعی کو حقیر سمجھ کر نظرانداز کرنا (اعراف ۷۴) کرشمے دکھا کر لوگوں کو حق سے پھیرنا (یونس ۸۱) کبر اور ظلم کی وجہ سے حق کا انکار کرنا (نمل ۱۴) شریف آدمیوں کو بے عزت کرنا (نمل ۳۴) چال بازی کا طریقہ اختیار کرنا (بقرہ ۱۱) رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنا (محمد ۲۲) دوسرے کا مال چرانا (یوسف ۷۳) کھیتی کو ویران کرنا اور انسان کو قتل کرنا (بقرہ ۲۰۵) عہد کرنے کے بعد اس کو توڑنا (رعد ۲۵) اسراف کا طریقہ اختیار کرنا (شعراء ۱۵۲) مال و دولت پر فخر کرنا (قصص ۷۷) قوت و طاقت کا غلط استعمال کرنا (فجر ۱۲) کمزوروں کا استحصال کرنا (بقرہ ۲۰۵) باہمی لڑائی پیدا کرنا (مائدہ ۶۴) اختلاف و انتشار برپا کرنا (اعراف ۱۴۲) ناپ تول میں کمی کرنا (ہود ۸۵) کسی کی نسل ختم کرنے کی کوشش کرنا (قصص ۴) مال کو صرف دنیا کے مقاصد میں خرچ کرنا (قصص ۷۷) وغیرہ ●

کون لوگ جہنم میں جائیں گے

جنت والے جہنم والوں سے کہیں گے: تم کو کس چیز نے جہنم میں پہنچایا۔ وہ جواب دیں گے ـــــ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ محتاج کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث کرتے تھے اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر موت۔ (مدثر ۴۲-۴۷)

ان آیات میں چار چیزوں کو جہنم میں جانے کا سبب بتایا گیا ہے: نمازی نہ ہونا، محتاجوں کا سہارا نہ بننا، حق کی دعوت کے خلاف فضول بحثیں نکالنا، روزجزا کو نہ ماننا۔ اس کے برعکس انجام ان لوگوں کا ہوگا جنھوں نے اپنی زندگیوں میں نماز کو داخل کیا ہو، کمزور اور بے سہارا لوگ جن کے دلوں میں اپنے لئے نرم گوشہ پاتے ہوں، جن کا سینہ حق کی آواز کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہو۔ جو یہ سمجھ کر دنیا میں زندگی گزارتے ہوں کہ ایک روز ان کو عالم الغیب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ایسے لوگوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ وہ خدا کے باغوں میں ہمیشہ کے لئے داخل کر دئے جائیں گے۔

نماز کیا ہے۔ اللہ کے آگے جھک جانا، اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔ جب آدمی اس طرح اپنے رب کو پالیتا ہے تو وہ روزانہ پانچ وقت متعین صورت میں اور دیگر اوقات میں غیر متعین صورت میں "نماز" پڑھتا رہتا ہے۔ اللہ کی یاد اس کے دل میں سما جاتی ہے۔ وہ ہر وقت اللہ کی باتوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کی پوری زندگی اور اس کے تمام معاملات میں اللہ کا رنگ اس طرح چھا جاتا ہے کہ کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتا۔

"محتاج کو کھانا کھلانا" اس تعلق کی ایک علامت ہے جو ایک بندۂ خدا کو دوسرے انسانوں سے ہونی چاہئے۔ ایمان آدمی کے اندر جو گھلاوٹ اور اخروی جواب دہی کا جو احساس پیدا کرتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوروں اور محتاجوں کے لئے اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے ہمہ تن عاجز محسوس کرتا ہے اس لئے ہر وہ شخص جو اس کو عجز کی حالت میں نظر آئے، اس سے اس کو ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ بے تابانہ طور پر چاہتا ہے کہ اس کا خدا اس کا سہارا بنے اس لئے اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ اس سے مختلف سلوک کرے جو وہ اپنے رب سے اپنے لئے چاہتا ہے۔

دعوت حق کے خلاف ایسی بحثیں نکالنا جس سے لوگ اس کی صداقت کے بارہ میں شبہ میں پڑ جائیں، اللہ کے نزدیک بدترین جرم ہے۔ دعوت حق کا ظہور دراصل خدا کا ظہور ہے۔ جو لوگ حق کی آواز کو نہ پہچانیں، انھوں نے گویا خدا کو نہیں پہچانا۔ جنھوں نے حق کی دعوت کے خلاف بحث و تکرار کی، انھوں نے گویا خدا کے ساتھ زبان درازی کی جرأت کی۔ ایسے لوگوں پر خدا سخت غضب ناک ہوتا ہے۔ وہ خدا کی رحمتوں سے سب سے زیادہ دور کر دئے جاتے ہیں۔

روز جزا کا یقین تمام نیکیوں کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اور روز جزا پر یقین نہ ہونا تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔ جنت اس کے لئے ہے جو دنیا میں اس طرح رہے گویا کہ وہ آخرت کو دیکھ رہا ہے اور جہنم اس کے لئے جو دنیا میں اس طرح زندگی گزارے گویا کہ وہ آخرت کو کوئی سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتا۔ وہ دنیا کو اپنی دنیا سمجھتا ہے نہ کہ خدا کی دنیا۔

دنیا بے معنی ہنگامہ آرائیوں کا وقتی اسٹیج نہیں

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا ذلک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار۔ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار (ص ۲۸-۲۷)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے بے فائدہ نہیں بنایا۔ یہ ان کا گمان ہے جو منکر ہیں۔ پس منکروں کے لئے خرابی ہے آگ سے۔ کیا ہم ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو ان کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا ہم ڈر رکھنے والوں کو ڈھیٹ لوگوں کے برابر کر دیں گے۔

دنیا میں جو لوگ اپنی خواہشات پر چلتے ہیں اور کسی پابندی کو اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے، وہ گویا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کارخانہ خدا نے بے فائدہ کھڑا کر دیا ہے۔ ایسے لوگ خواہ بظاہر اپنے کو دیندار ظاہر کرتے ہوں یا دین سے بالکل بے تعلق ہوں، وہ مفسدین کے گروہ میں شامل ہیں۔ کیوں کہ ان کی ڈھٹائی بتا رہی ہے کہ وہ دنیا کو خدا کی دنیا نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی ہنگامہ آرائیوں کا ایک وقتی اسٹیج سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ جو چاہے کرتے رہیں، کوئی ایسا دن آنے والا نہیں جب کہ انصاف کا ترازو کھڑا ہو اور ان کے عمل کا ان سے حساب لیا جائے۔ اللہ نے اپنے قانون امتحان کی بنا پر ان کو مہلت دے رکھی ہے۔ اس مہلت نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ مگر بہت جلد وہ جان لیں گے کہ وہ شدید ترین غلط فہمی میں تھے۔ اگرچہ یہ جاننا ان کے کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ وقت اپنے عمل کا بدلہ پانے کا ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

ایک شخص وہ ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ وہ خدا کے بندوں کے درمیان انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ وہ اپنے وسائل کو نمائش اور تخریب میں ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کو اصلاح اور تعمیر کے کاموں میں لگاتا ہے۔ وہ خدا کے حکم کے آگے جھک جاتا ہے نہ کہ اپنی خواہشوں اور امنگوں کو حق کا معیار سمجھنے لگے۔ دوسری طرف وہ انسان ہے جو خدا کی زمین میں متکبر بن کر رہتا ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے مال کو اپنے ذاتی شوق میں برباد کرتا ہے۔ وہ خدا کی دی ہوئی طاقت کو دوسرے انسانوں کی جڑ اکھاڑنے میں لگاتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملے ہوئے مواقع کو اپنی بڑائی قائم کرنے میں استعمال کرتا ہے۔ جب کوئی معاملہ پڑتا ہے تو وہ حق کے آگے جھکنے کے بجائے خود حق کو اپنے آگے جھکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں انسان مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف انسان ہیں۔ ان کا انجام ایک ایسی کائنات میں یکساں نہیں ہو سکتا جو حق اور عدل پر بنائی گئی ہے۔ کائنات اپنی انتہاہ معنویت کے ساتھ ایسے انجام کو ماننے سے انکار کرتی ہے جس میں ڈرنے والے اور ڈھٹائی کرنے والے دونوں یکساں ہو جائیں۔ اس قسم کا گمان کائنات پر اور کائنات کے بنانے والے پر اتہام ہے۔ جو لوگ ایسا گمان کریں وہ صرف اپنے جرم میں اضافہ کرتے ہیں، وہ آنے والے انجام کو بدل نہیں سکتے۔ تخلیق کا پورا کارخانہ اپنے خالق کا تعارف ایک عادل اور حکیم ہستی کی حیثیت سے کر رہا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ ایک ایسے انجام پر ہو جو عدل و حکمت کے سراسر خلاف ہے۔

جب زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے

یہود و نصاریٰ کے یہاں رواج تھا کہ جب ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا یا کسی نئے آدمی کو اپنے دین میں داخل کرتے تو اس کو خاص قسم کے زرد رنگ میں غوطہ دیتے۔ اس رنگ میں رنگنا ان کے نزدیک آدمی کے خدا پرست اور نجات یافتہ ہونے کا نشان تھا۔ قرآن میں کہا گیا کہ اس قسم کا ظاہری رنگ چڑھا لینے سے کچھ نہیں ہوتا، اپنے باطن کو "رنگین" بنانے کی کوشش کرو:

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (بقرہ ۱۳۸) اللہ کا رنگ، اور اللہ سے بہتر کون رنگ ہے۔

گویا دین کسی ظاہری رنگ کا نام نہیں بلکہ معنوی رنگ کا نام ہے ـــــــ وہ دین جو اعضاء و جوارح کی سطح پر اٹکا ہوا ہو، جو رسمی عملیات کو دہرانے کے ہم معنی ہو۔ جو آدمی کے لئے خارجی امور میں بحث و مباحثہ کا موضوع ہو، جو دوسروں کے خلاف شور و غل کا پروگرام دیتا ہو۔ جو جلسوں اور جلوسوں اور اخباروں کی سطح پر نمایاں ہونے کا عنوان ہو، وہ گویا ظاہری اصطباغ کا دین ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے جسم کو اوپر سے "زرد رنگ" میں رنگ لیا اور اندر کا حقیقی وجود بدستور بے رنگ پڑا رہا۔

اصل دین وہ ہے جو آدمی کے اندر ہل چل پیدا کر دے، جو آدمی کے دل و دماغ میں آگ لگانے والا ہو۔ جو آدمی کے اندرونی وجود کو خدا کے رنگ میں رنگ دے۔ پہلی قسم کا دین آدمی کے اوپر اوپر رہتا ہے۔ جب کہ اصل دین آدمی کی حقیقی ہستی میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم کے دین میں ایک شخص کچھ چمتکار دکھا کر یا بعض عملیات کر کے سمجھتا ہے کہ وہ دیندار بن گیا۔ جب کہ اصل دین اس کے اندرونی احساسات سے لے کر اس کی آنکھ اور زبان اور ہاتھ اور پاؤں تک جگہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو بالکل دوسرے قسم کا انسان بنا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قسم کے دین میں آدمی کی اصل ہستی اور اس کا دین دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ جب کہ اصل دین میں دونوں ایک دوسرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نہ دین اس سے جدا رہتا ہے اور نہ وہ دین سے۔

صحیح مذہب وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں اسی طرح شامل ہو جائے جیسے پانی میں رنگ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مذہب بناوٹی مذہب ہے جو آدمی کی اپنی زندگی سے باہر باہر نجات کے عملیاتی راستے بتائے۔ خواہ وہ سیاسی عملیات ہوں یا نام نہاد روحانی عملیات۔

علمائے نفسیات ذہنی اختلال کے وقت آدمی کے لاشعور کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح اوپری رنگ اور حقیقی رنگ کو جاننے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ کوئی ایسا ناخوش گوار واقعہ پیش آئے جس سے آدمی کے نفس کو چوٹ لگے۔ اگر وہ سچا ہے تو ایسے وقت اس کے اندر سے تواضع ابھرے گی۔ کیونکہ خدا پرستی کی حقیقت تواضع ہے۔ اس کے برعکس اگر جھٹکا لگنے کے وقت اس کے اندر نفرت، کبر اور انانیت ابھرے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا دین محض اوپری رنگ کا دین تھا جو معمولی آنچ لگتے ہی اڑ گیا۔

نجات کی دو شرطیں

آخرت میں نجات کن لوگوں کو حاصل ہوگی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دو شرطوں میں سے کم ازکم ایک شرط کا ثبوت دیا ہو۔ اول وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں ظلم کو شامل نہیں کیا ——— اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم نہیں ملایا انھیں کے لئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں (انعام ۸۲)

یہاں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جو آدمی کے لئے یقین کے ہم معنی بن جاتا ہے اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ جو لوگ اللہ کو اس طرح پائیں کہ وہ ان کی نفسیات کا جزء بن کر ان کے اوپر چھا جائے۔ وہ ان کے دل و دماغ کو اپنے احاطہ میں لے لے۔ ان کا ایمان اور ان کا سوچنا اور چاہنا الگ الگ نہ رہیں بلکہ دونوں ایک ہو جائیں۔ ان کا یقین و اعتماد، ان کا خوف و محبت، ان کی دلچسپیاں اور وفاداریاں سب اسی کے لئے ہو جائیں جو ان کا ایمان باللہ ان سے تقاضا کرتا ہے۔ ایسے لوگ اعلیٰ ترین معنی میں ہدایت یافتہ مومن ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ میں جیتے ہیں۔ ان کا سب کچھ اللہ بن جاتا ہے۔ وہ دنیا کی زندگی ہی میں خدا کی پناہ میں آچکے ہوتے ہیں۔ اور جو دنیا ہی میں خدا کی پناہ حاصل کر چکا ہو اس کے متعلق کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ آخرت میں محروم ہو گا۔

دوسرا درجہ وہ ہے جس کو "اعتراف" کہا گیا ہے ——— اور کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے نیک عمل کے ساتھ برا عمل ملا دیا۔ بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے۔ وہ بخشنے والا مہربان ہے (توبہ ۱۰۲) پہلے گروہ کے لئے اگر "عمل" باعث نجات بنے گا تو دوسرے گروہ کے لئے "اعتراف"۔ آدمی کو اپنے رب کے سامنے یا کامل عمل پیش کرنا ہے یا کامل اعتراف۔ ان دو کے بعد نجات کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

آدمیوں میں کچھ مضبوط ارادہ کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ کمزور ارادہ کے لوگ۔ مضبوط ارادہ کے لوگ جب دل سے اللہ کا اقرار کر لیتے ہیں تو ان کا عمل ان کے اقرار سے الگ نہیں رہتا۔ وہ اپنے عمل میں بھی وہی بن جاتے ہیں جو وہ اپنے دل کے اندر بنے ہیں۔ مگر کمزور ارادہ کے لوگ اپنے اقرار اور اپنے عمل میں اتنی یکسانی پیدا نہیں کر پاتے۔ وہ بار بار شیطان اور نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم ایسے لوگوں کے لئے بھی اللہ کے یہاں رحمتوں کا سایہ ہے۔ مگر یہ سایہ اس شرط پر ہے کہ انھوں نے ڈھٹائی کے بجائے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے تاویلوں کا سہارا لینے کے بجائے کھلے طور پر اقرار کر لیا ہو۔ وہ بحث کرنے کے بجائے چپ ہو گئے ہوں۔ جب ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تو بپھرنے کے بجائے انھوں نے اپنا سر جھکا لیا ہو۔ جن کے اوپر عزت نفس کے بجائے شرمندگی طاری ہوئی ہو۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہ اپنے رب کے سامنے حسن عمل نہ پیش کر سکے ہوں تو انھوں نے اپنے رب کے سامنے عجز کے آنسو پیش کئے ہوں۔ جو لوگ یہ آخری چیز بھی نہ پیش کر سکیں ان کو خدا بخشے گا تو کس بہانے بخشے گا۔

آخرت کے بدلے دنیا

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار ولا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم۔ اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدی والعذاب بالمغفرۃ فما اصبرھم علی النار (البقرۃ ۱۷۵-۱۷۴)

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے میں تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھرتے ہیں۔ اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دکھ بھرا عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور نجات کے اوپر عذاب کو ترجیح دی۔ وہ کس قدر جری ہیں آگ کے اوپر۔

یہود کے علمار آسمانی کتابوں کا علم رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی دعوت اٹھائی تو وہ اپنے علم کی بنا پر سمجھ گئے کہ یہ خالص حق کی دعوت ہے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے اس کا اقرار نہ کیا۔ ان میں سے بہت لوگ آپ کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کی دعوت کو ماننے میں انھیں اپنی دنیا لٹتی ہوئی نظر آتی تھی۔

ایک عرصہ کی روایات کے نتیجہ میں قوم کے اندر ان کی بڑائی قائم ہو چکی تھی۔ دینی پیشوائی کے نام پر وہ عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ جب بھی کوئی شخص دینی جذبہ سے کوئی رقم خرچ کرتا تو وہ اس کو انھیں علمار کو یا ان کے ادارہ کو دیتا۔ ایسی حالت میں علمار یہود کو محسوس ہوا کہ رسول اللہ کو رسول ماننے کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس میں انھیں اپنی حیثیت کی نفی نظر آئی۔ انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سوچا کہ جب ہم یہ اعلان کر دیں گے کہ حق وہ ہے جس کو محمد بن عبد اللہ پیش کر رہے ہیں تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ جو لوگ حق کے نام پر ہماری طرف راغب ہیں وہ محمد بن عبد اللہ کی طرف راغب ہو جائیں گے اور ہماری کوئی قیمت لوگوں کے درمیان باقی نہ رہے گی۔

اللہ کی نظر میں یہ بہت بڑا جرم ہے۔ یہ جنت کے بدلے جہنم کو ترجیح دینا ہے۔ ایسا آدمی آخرت میں اسی چیز کو پائے گا جس کو اس نے دنیا میں اپنے لئے پسند کیا تھا۔ آخرت میں خدا اس کو نظر انداز کر دے گا جس طرح دنیا میں اس نے خدا کو نظر انداز کیا تھا۔ اللہ اس کی طرف نہ دیکھے گا، کیونکہ اس نے اللہ کی طرف نہیں دیکھا۔ کیسا عجیب انجام ہے جس طرف یہ لوگ چلے جا رہے ہیں۔

خدا کا سرا اس وقت آدمی کے ہاتھ آتا ہے جب خدا کی طرف بڑھنے میں دنیا کے سرے اس سے چھوٹ گئے ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ مخالفین نے جب وہاں رہنا آپ کے لئے ناممکن بنا دیا تو آپ اللہ کے حکم سے عرب کے صحرا میں پہنچے اور مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کی جو اس وقت ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس موقع پر آپ کی زبان سے جو دعائیں نکلیں ان میں سے ایک یہ تھی:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم۔ ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرات لعلهم یشکرون۔ ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شیئ فی الارض ولا فی السماء (ابراہیم ۳۸)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک میدان میں بسا دیا ہے جہاں کھیتی نہیں۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم رکھیں۔ پس تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو روزی دے میووں سے۔ تاکہ وہ شکر کریں۔ اے ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا یہ واقعہ ایک علامتی واقعہ ہے۔ یہ تاریخ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ایک بندۂ خدا کے ساتھ اس وقت کیا پیش آتا ہے جب کہ وہ بے آمیز حق کی دعوت کو لے کر کھڑا ہو جائے —— وقت کے قائم شدہ نظام میں وہ بے جگہ ہو جاتا ہے، مذہبی ادارے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ دنیا کی ذی زرع وادیاں، اپنی تمام سرسبزی کے باوجود، اس کے لئے خشک ہو جاتی ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بے آب معاشیات کی ایک زمین میں جا بسے اور اپنے رب سے کہے کہ: خدایا! تیرے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں۔ انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا نے ان کو رزق دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو ان کے قدموں کے نیچے سے ان کے لئے رزق کے چشمے جاری کر دے۔ یہ تاریخ انسانی کا نازک ترین لمحہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ کائنات کی نبض رک جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی گردشیں نئے حکم کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ انسانی تاریخ نئے تجربہ سے متعارف ہوتی ہے: بیابان میں "چشمے" پھوٹ پڑتے ہیں۔ چھتیں پھاڑ کر خدا کے خزانے اترتے ہیں۔ داعی کی آواز ہواؤں کے دوش پر پھیلنے لگتی ہے۔ خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ اپنے ان بندوں کی مدد پر اتر پڑتا ہے جن کو بے حقیقت سمجھ کر دنیا والوں نے اپنی مدد سے محروم کر دیا تھا۔ بے آمیز دعوت کا کام اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جو خدا کی مدد کو سب سے زیادہ کھینچنے والا ہے۔ اگرچہ یہ مدد اس وقت آتی ہے جب کہ دعوت کا اظہار اور اس کی پاداش میں داعی کی مظلومی، دونوں اپنی آخری انتہا پر پہنچ چکے ہوں۔ ■

یہ اسلام نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں : اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو (کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ)

قرآن وحدیث میں اتنی سخت تنبیہ کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال چھینتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی آبروریزی کرتا ہے۔ یہ کام صرف عام لوگ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اسلام کے علم بردار بنے ہوئے ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ وہ اسلام سے کم کسی چیز پر راضی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جب کسی کے خلاف ایسا کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اس کو اسلام سے خارج ثابت کرتے ہیں ـــــ یہ مرتد ہے، یہ منافق ہے، یہ بدنیت ہے، یہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے، وغیرہ۔ اس قسم کا الزام لگانے کے بعد مسلمان نفسیاتی طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس شخص کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کرنے کا انھیں لائسنس مل گیا۔ اب ان کے لیے جائز ہے کہ ایسے شخص کو بے آبرو کریں۔ وہ اس کی معاش کو تباہ کریں حتی کہ اس کو قتل کر ڈالیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب شیطانی افعال ہیں۔

اسلام میں کسی کو سزا دینے کا مقرر اصول ہے۔ محض الزام بازی پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ مرتد شرعی طور پر صرف وہ شخص ہے جو خود اپنے ارتداد کا اعلان کرے۔ اور ایسے مرتد کی سزا بھی صرف ایک قائم شدہ عدالت دے سکتی ہے نہ کہ عام افراد۔ منافق کے لیے شریعت میں اس قسم کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کو بھی کوئی سزا نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مر گیا۔ بدنیتی خالص قانونی معنوں میں کوئی جرم نہیں۔ نیت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے صرف اللہ واقف ہے اور وہی کسی آدمی کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق معاملہ کر سکتا ہے۔ کسی انسان کو ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ ایک شخص کو بدنیت قرار دے کر اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کو اپنے لیے جائز کر لے۔

مسلم معاشرہ میں اس قسم کی باتیں صرف اس لیے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کا ڈر نہیں۔ اگر لوگ اللہ سے ڈریں تو وہ کبھی کسی کے خلاف اس قسم کی کارروائی نہ کریں۔

کالی آگ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قال اُوقِدَ علی النار الف سنۃ حتی احمرّت
ثم اُوقِدَ علیھا الف سنۃ حتی ابیضّت
ثم اوقِد علیھا الف سنۃ حتی اسودّت
فھی سوداءُ مظلمۃ
(الترمذی)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم کی آگ کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ لال ہوگئی۔ اس کے بعد پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ سفید ہوگئی۔ پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ کالی ہوگئی۔ اب وہ گہری کالی ہے۔

جہنم کی آگ حقیقۃً کیا ہے اور کس طرح بھڑکتے بھڑکتے کالی ہوگئی ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ مگر آگ کا کالا ہوجانا آج کے انسان کے لیے ناقابل فہم نہیں رہا۔ آج کے علم الافلاک نے بتایا ہے کہ کائنات میں آگ کی ایسی دنیائیں ہیں جو اپنی شدت کے آخری مرحلے میں پہونچ کر کالی ہوگئی ہیں "کالی آگ" آج کے انسان کے لیے ایک معلوم چیز ہے اور اس کو جدید اصطلاح میں کالا غار (Black hole) کہا جاتا ہے۔

فلکیاتی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بہت بعید فاصلوں پر کائنات میں انتہائی بڑے بڑے ستارے (آگ کے گولے) ہیں۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ کہکشاں کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ انرجی خارج کرتے ہیں جب کہ ایک کہکشاں میں کھرب ہا کھرب ستارے ہوتے ہیں۔ ابتداءً یہ ستارے اسی طرح "روشن" دکھائی دیتے تھے جیسے دوسرے ستارے۔ نظریہ یہ ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی قوت کشش کی وجہ سے ان ستاروں نے اپنے مادہ کو اندر کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں ستارہ سکڑتا گیا اور جتنا سکڑتا گیا اتنا ہی اس کی قوت اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی قوت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ روشنی بھی اس سے خارج نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح انتہائی روشن ہونے کے باوجود اب وہ ہماری نظر کے لیے بالکل تاریک ہو گیا ہے۔ کیوں کہ آدمی اپنی موجودہ آنکھوں سے کسی ایسی ہی چیز کو دیکھ سکتا ہے جس کی روشنی اس کی آنکھوں تک پہونچ رہی ہو۔

غیبی چیزوں کا حقیقی علم انسان کو صرف اگلی دنیا میں ہو سکے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں بھی ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جو غیبی حقیقتوں کو ہمارے لیے قابل فہم بنا سکیں۔

منافقت

منافقت اور یہودیت دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مسلم اقوام میں جس بگاڑ کو منافقت کہا گیا ہے، قدیم امتوں کے لیے اسی بگاڑ کا نام یہودیت ہے۔ منافقت یا یہودیت یہ ہے کہ آدمی زبان سے خدا اور رسول کا اقرار کرتا ہو۔ مگر خدا اور رسول کا عقیدہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو۔ وہ آسمانی تعلیمات کو ماننے کا مدعی ہو مگر اس کی زندگی اسلامی تعلیمات کی حقیقی تعمیل سے خالی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں منافق کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں وہ سب وہی ہیں جو یہودیوں کی علامتیں بھی بتائی گئی ہیں۔ مثلاً حدیث میں منافق کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اس کو کوئی امانت سونپی جائے تو وہ اس امانت میں خیانت کرے (اذا اؤتمن خان) ٹھیک یہی علامت یہودیت کی قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہ کریں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو جاؤ (ومنهم من ان تامنه بدينار لا يؤده اليك الا ما دمت عليه قائما، آل عمران ۷۵)

یہودی وہ لوگ تھے جو خدا کی پرستاری کو چھوڑ کر دنیا کے پرستار بن گیے۔ مگر اپنی اس دنیا پرستی کے ساتھ وہ ظاہری طور پر دین کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح منافقت یہ ہے کہ آدمی اندر سے دنیادار ہو مگر ظاہری طور پر وہ دین دار کی صورت بنائے ہوئے ہو۔ یہودی حقیقۃً دین دار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دیندار ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح منافق بھی حقیقۃً دیندار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دین دار ظاہر کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر جو کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں ان میں سے ایک خاص کمزوری یہ ہے کہ وہ دنیوی اہمیت رکھنے والی چیزوں کے معاملہ میں ناقابل اعتبار ہو جاتے ہیں۔ ان سے مالی لین دین کیا جائے، کوئی جائداد ان کے انتظام میں دی جائے، کسی باعزت عہدے پر انھیں

بٹھایا جائے، غرض یہ کہ مادی قیمت رکھنے والی کوئی چیز اگر ان کے حوالے کی جائے تو وہ ان امیدوں پر پورے نہیں اترتے جو ایسی کسی چیز کی حوالگی کے بعد شرعی یا اخلاقی طور پر ان سے کی جاسکتی ہیں۔ وہ بظاہر خوبصورت باتیں کریں گے۔ مگر ان کی باتیں اخلاص کی گہرائی سے خالی ہوں گی۔ وہ نمائشی اخلاق برتیں گے مگر ان کی زندگی میں حقیقی اخلاق کا کہیں پتہ نہ ہوگا۔

مال میں خورد برد کرنا، وعدہ پورا نہ کرنا، جائداد میں ناجائز تصرف کرنا، عہدہ کو شخصی مفاد کے لیے استعمال کرنا، یہ سب امانت میں خیانت ہے۔ اور یہ تمام خیانتیں جس طرح یہودیوں میں پائی جاتی تھیں اسی طرح وہ ان تمام نام نہاد مسلمانوں میں بھی پائی جائیں گی جن کو قرآن وحدیث میں منافق کہا گیا ہے۔ یہودیت جھوٹی دین داری کا نام ہے اور اسی طرح منافقت بھی جھوٹی دین داری کا نام۔

نفاق اور منافقین کے سلسلہ میں چند حدیثیں یہ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلۃ منہن کانت فیہ خصلۃ من نفاق حتی یدعہا۔ اذا اؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاہد غدر واذا خاصم فجر (متفق علیہ) زاد فی روایۃ لمسلم: وان صام وصلی وزعم انہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر وہ ہوں وہ پورا منافق ہے۔ اور جس شخص کے اندر ان میں سے کوئی خصلت ہو تو اس کے اندر اسی کے بقدر نفاق ہوگا، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں: جب وہ امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے۔ اور جب بولے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے تو پھر جائے۔ اور جب بحث کرے تو جھگڑنے لگے۔ ایک روایت میں مزید ہے کہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور سمجھے کہ میں مسلم ہوں۔

عن عمر بن الخطاب ؓ عن النبی صلی اللہ

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ

علیہ وسلم قال : انما اخاف علیٰ ھٰذہ الامۃ کل منافق یتکلم بالحکمۃ ویعمل بالجور (رواہ البیہقی)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اس امت پر ایسے منافق سے ڈرتا ہوں جو حکمت کی باتیں کرے اور اس کا عمل ظالمانہ ہو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصلتان لاتجتمعان فی منافق۔ حسنُ سمتٍ ولا فقہ فی الدین

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں کبھی منافق کے اندر جمع نہیں ہوسکتیں۔ خوش خلقی اور دین کا صحیح فہم۔

قرآن میں متعدد مقامات پر نفاق اور منافق کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ منافقین وہ لوگ ہیں جن کے اندر روگ ہے :

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون (البقرہ ــ ۱۰)

ان کے دلوں میں مرض ہے تو اللہ نے ان کے مرض کو بڑھادیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس بنا پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا کہ اس سے مراد دین کا مرض ہے نہ کہ جسم کا مرض (ھذا مرض فی الدین ولیس مرضاً فی الاجساد) اس سلسلہ میں صحابہ و تابعین سے جو تفسیریں منقول ہیں، ان میں سے ایک تفسیر میں مرض کو شک کہا گیا ہے۔ اور دوسری تفسیر میں مرض کو ریا بتایا گیا ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۸)

نفاق کی اصل جڑ یہی شک ہے۔ اسی سے تمام منافقانہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ منافق دکھاوے کی باتیں کرتا ہے، کیوں کہ اس بارہ میں وہ شک میں مبتلا رہتا ہے کہ خدا اس کے دل کے حال تک سے باخبر ہے۔ منافق بغض و حسد میں مبتلا ہوتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کسی کو ملا ہے وہ اللہ کے دیئے سے ملا ہے، منافق برے اعمال کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس یقین سے خالی ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے یہاں پکڑا جائے گا۔ منافق جھوٹی کارروائیاں کرتا ہے، کیوں کہ خدا کے بارہ میں بے یقینی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کو ڈر نہیں ہوتا کہ ایک روز اس کے جھوٹ کا پردہ کھلے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے بے عزت ہو کر رہ جائے گا۔

جھوٹی شکایت

انسانی سماج میں جو چیز سب سے زیادہ عام ہے وہ جھوٹی شکایت ہے اور جو چیز اس سے بھی زیادہ عام ہے وہ ہے جھوٹی شکایت کو سن کر فوراً اسے مان لینا۔ مگر یہ دونوں ہی چیزیں سراسر باطل ہیں۔ شکایت کا پیدا ہونا اگر بذات خود کوئی اہمیت رکھتا ہو تو دنیا کا کوئی شخص بھی قابل اعتبار نہیں، حتیٰ کہ نعوذ باللہ پیغمبر بھی نہیں۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے بارہ میں شکایت کرنے والوں نے شکایتیں نہ کی ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہہ معصوم تھے۔ مگر سیرت اور حدیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ کے زمانہ کے یہود اور منافقین نے آپ کے اوپر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کو صحابی کہا جاتا ہے ان میں بھی ایسے افراد نکلے جنھیں آپ کے بارہ میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس کا اظہار ہوا۔ یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

غزوۂ حنین کے بعد کافی مال غنیمت ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال کو لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ اس دوران ایک مسلمان کا واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

خرجتُ انا وتليدُ بن كلاب الليثي حتى أتينا عبد الله بن عمرو بن العاصؓ وهو يطوف بالبيت معلّقاً نعله بيده۔ فقلنا له۔ هل حضرتَ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم حين كلّمه التميمي يوم حُنين۔ قال نعم۔ جاء رجل من بني تميم يُقال له ذوالخُويصِرة۔ فوقف عليه وهو يعطي الناس۔ فقال يا محمد۔ قد رأيتُ ما صنعتَ في هٰذا اليوم

راوی کہتے ہیں کہ میں اور تلید بن کلاب لیثی نکلے۔ یہاں تک کہ ہم عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے پاس پہونچے۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا، کیا آپ اس وقت موجود تھے جب تمیمی نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا۔ انھوں نے کہا ہاں۔ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا۔ اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا اور آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اجل فکیف رأیتَ۔ فقال لم اَرَكَ عَدلتَ۔ قال فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال ویحکَ۔ اذا لم یکن العدل عندی فعند من یکون

(الجزء الرابع صفحہ ۱۴۴)

اس نے کہا اے محمدؐ، آج آپ نے جو کیا اس کو میں نے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا برا ہو۔ اگر میرے یہاں انصاف نہ ہو تو پھر کس کے یہاں انصاف ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں مذکورہ مسلمان نے جو بات کہی، وہ اپنے نزدیک اس کی مضبوط بنیاد رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دیکھا کہ جنگ میں انصار اور مہاجرین دونوں نے حصہ لیا۔ دونوں نے یکساں طور پر سرفروشی کی۔ مگر جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ قریش کو اور عرب قبیلوں کو دے دیا۔ مدینہ کے انصار کو آپ نے کچھ نہیں دیا (واعطی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اعطی فی قبائل قریش وقبائل العرب و لم یُعطِ الانصار شیئاً، صفحہ ۱۴۵)

اس معاملہ میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ حتی کہ حسان بن ثابت انصاری نے ایک نظم لکھی جس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ تھا:

زادَ الهمومُ فماءُ العينِ مُنحدِرُ سَحّاً اذا حَفَلتهُ عَبرَةٌ دِرَرُ

رنج وغم بڑھ گیے، پس آنکھ کا پانی برابر بہہ رہا ہے، جب کہ یہ پانی بہتے ہوئے آنسوؤں نے جمع کیا ہے۔

یہ شکایت بظاہر درست ہونے کے باوجود اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط تھی۔ شکایت کرنے والے سارے معاملہ کو بس شرکتِ جہاد کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مصلحت اسلام کے اعتبار سے دیکھا۔ شرکتِ جہاد عام حالات میں یقیناً قابل اعتبار ہے۔ مگر جب اس کا مقابلہ مصلحت اسلام سے ہو تو مصلحت اسلام کا پہلو قابل ترجیح قرار پائے گا ــــ غلط زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں ایک چیز نادرست نظر آسکتی ہے۔ مگر صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو وہی چیز عین درست نظر آنے لگے گی۔

یہودی کردار

روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مال آیا۔ آپ نے اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں کسی کو زیادہ ملا اور کسی کو کم۔ چنانچہ اس بنا پر کچھ لوگوں نے آپ کی دیانت داری پر شبہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں :

مررت برجلین واحد هما یقول لصاحبه واللہ ما اراد محمد بقسمته وجه اللہ ولا الدار الآخرة

میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرا۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم محمدؐ نے اپنی اس تقسیم میں اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر نہیں چاہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا : موسیٰ پر اللہ کی رحمت ہو، ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر کیا (رحمة اللہ علی موسیٰ لقد اوذی باکثر من هذا فصبر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۵۲۱) قرآن کی حسب ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

یاایها الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرأه اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیها (الاحزاب ۶۹)

اے ایمان والو، تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو ستایا پھر اللہ نے ان کی کہی ہوئی باتوں سے موسیٰ کی برارت کردی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس طرح ستایا اس کی تفصیل بائبل کی کتاب خروج اور کتاب گنتی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا میں کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو اپنی قوم کے باغی اور منحرف لوگوں سے بہت سی ذلت اور توہین برداشت کرنی پڑی، حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جو کہ ان کی قیادت پر حسد کرتا تھا :

(Moses had) to suffer many indignities and insults from a rebellious and recalcitrant people, even from his closest relatives, who were jealous of his leadership.
Jewish Encyclopedia, Volume V, p. 442

دین سے دور

حدیثوں اور آیتوں سے واضح طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں کے لیے نجات اور کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ پر چلیں۔ رسول نے اپنے عمل سے جو سنت چھوڑی ہے اور آپ کے اصحاب نے جس طرح اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کیا ہے وہی تمام مسلمانوں کے لیے واحد نمونہ ہے جس کو انھیں اختیار کرنا ہے۔ اس طریقہ میں خود سے کوئی اضافہ کرنا سراسر بدعت ہے۔ اور بدعت اللہ کے نزدیک جرم ہے۔

سنت کے طریقہ کو چھوڑنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ سنت کے کچھ جزئی اور بے ضرر پہلوؤں کو لے لیا جائے اور سنت کے زیادہ اہم پہلوؤں کو چھوڑ دیا جائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ جزئی اور ظاہری پہلوؤں کو اختیار کرنے سے ان کی زندگی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جب کہ سنت کے اہم پہلو آدمی سے اس کی زندگی میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے اس پورے ڈھانچہ کو بدل دینا چاہتے ہیں جو اس نے اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت قائم کر رکھا ہے۔

یہی صورت حال بہت بڑے پیمانہ پر یہودیوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف بھیجے گئے۔ حضرت مسیح نے اپنی ایک تقریر (متی ۲۳: ۲۳ — ۲۸) میں ان کو ان سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو۔ پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہوئے ہیں۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔

اعمال کے نتائج

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمانہ کو برا نہ کہو۔ زمانہ تو میں ہوں۔ سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں ہی رات اور دن کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں (لَاتَسُبُّوا الدَّھرَ وَأَنَا الدَّھرُ بِیَدِیَ الاَمرُ اُقَلِّبُ اللَّیلَ وَالنَّھَارَ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ خدا ہی کے قانون کے مطابق حالات پیدا ہوتے ہیں اور خدا ہی کے حکم کے مطابق زمانہ گردش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں زمانہ یا حالات کو برا کہنا خود حکیم خداوندی کو برا کہنا ہے۔ ایسا کہنا بے فائدہ ہے اور اسی کے ساتھ سرکشی بھی۔

نادرشاہ ایرانی نہایت ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۷۳۹ میں دہلی پر حملہ کیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ جو بھی ملے اس کو قتل کر دو۔ اس قتل عام میں ۳۰۰۰۰ لوگ مارے گیے۔ اس کے بعد اس نے شہر کو لوٹنے کا حکم دیا۔ ۲۶ مئی ۱۷۳۹ کو جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ لوٹ کا جو مال تھا اس کی مقدار تیس کرور روپیے تھی۔ سونے، چاندی اور جواہرات اس کے علاوہ تھے۔ شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تخت طاؤس بھی اسی موقع پر وہ اپنے ساتھ ایران لے گیا۔ (۹/۳۸۵)

کہا جاتا ہے کہ دہلی والوں پر جب یہ مصیبت اور تباہی آئی تو کچھ لوگ مرزا مظہر جان جاناں کے پاس گیے اور کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہم کو نادرشاہ کے اس عذاب سے نجات دے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

کسی قوم میں جب اخلاقی بگاڑ آتا ہے تو اس کی عملی طاقت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر اختلافات ابھرتے ہیں جو اس کی اجتماعی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے اندر یہ مزاج پیدا ہوتا ہے کہ وہ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان کر دے۔ اپنی ذات سے بلند مقاصد کے لیے قربانیاں دینے کا حوصلہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ اس کے افراد بے اصول انسانوں کی ایک بھیڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ سچائی کے آگے جھکنے کے بجائے طاقت کے آگے جھکنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں کسی قوم کے لیے اسی طرح مہلک ہیں جس طرح لکڑی کے لیے گھن۔ جس لکڑی کو گھن لگ جائے وہ کھڑی نہیں رہ سکتی، اسی طرح جس قوم کے اندر یہ کمزوریاں پیدا ہو جائیں وہ تباہی اور بربادی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

جب آدمی انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجائے

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ حکومت (۹۷۳ - ۱۰۱۳ ق م) میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایلات کے مقام پر یہودیوں کی آبادی تھی۔ انھوں نے قانون سبت کی خلاف ورزی کی۔ ان کی شریعت میں سبت (سنیچر) کے دن معاشی سرگرمیاں ممنوع تھیں۔ مگر وہ اس دن مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ سنیچر کے دن مچھلیاں کثرت سے دریا میں آتی تھیں اور بقیہ دنوں میں پانی کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ یہود نے یہ شرعی تدبیر کی کہ دریا کے کنارے گڑھے بنائے۔ وہ دریا کا پانی کاٹ کر گڑھے میں ملا دیتے۔ سنیچر کے دن جب مچھلیاں گڑھے میں آجاتیں تو وہ نکلنے کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے دن اتوار کو ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔ یہ تدبیر وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ ان پر یہ بات صادق نہ آئے کہ وہ سبت کے دن شکار کرتے ہیں۔ دین کے نام پر یہ بے دینی اللہ کو اتنی زیادہ ناپسند ہوئی کہ ان پر اللہ کی لعنت ہوئی۔ وہ بندر اور سور بنا دئے گئے (مائدہ ۶۰) —— عملاً یہی حالت اگرچہ پوری قوم یہود کی تھی۔ تاہم ایک خاص مقام کے یہودیوں کے باطن کو ظاہری طور پر بھی مجسم کر دیا گیا تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو (بقرہ ۶۶)

بے دینی کو دین کے نام پر کرنا بدترین جرم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے آدمی کے اندر سے صحیح اور غلط کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بے حس انسان بن جاتا ہے۔ دین اور بے دینی دونوں اس کو یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آتی ہے جب کہ اس میں بندر اور سور کی اخلاقیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بندر کی خصوصیت کیا ہے۔ فساد اور بے حیائی۔ کسی مکان میں بندروں کا غول داخل ہو جائے تو وہ فوراً بے معنی اچھل کود اور توڑ پھوڑ شروع کر دے گا۔ ایسا ہی کچھ حال اس قوم کا ہو جاتا ہے۔ وہ زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتی۔ تاہم عملاً وہ خدا کی زمین پر اس طرح رہنے لگتی ہے جیسے اس زمین کا کوئی مالک نہیں ہے۔ جیسے نہ کبھی خدا سے اس کا سامنا ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب دینا ہے —— بدنظمی، غیر ذمہ دارانہ زندگی، بے معنی کارروائیاں، آپس کی چھین جھپٹ، ایک دوسرے پر غرانا، ہمدردی اور انصاف کے بجائے ظلم و فساد کو اپنا شیوہ بنا لینا، یہ اس کی عام زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بظاہر انسان مگر عملاً بندر صفت ہو جاتے ہیں۔

سور کی خصوصیت کیا ہے۔ ستھری چیز کو چھوڑ کر گندی چیز کو اپنی خوراک بنانا، اس کی ایک صورت وہ ہے جو کمائی اور لین دین میں ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی حلال ذرائع پر قانع نہ رہ کر حرام سے اپنا پیٹ بھرنے لگتا ہے (مائدہ - ۶۲)۔ دوسری صورت وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنا لیں (اعراف ۱۴۶)

ایسے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ مثبت چیزوں کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں، ان کو اصلاح کے کاموں کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ ایسے کاموں کی طرف وہ تیزی سے لپکتے ہیں جن کا نتیجہ نسلوں اور کھیتوں

دنیا سے آخرت لینا

قرآن میں قارون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر فرعون سے مل کر اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کے خزانوں کا یہ حال تھا کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی۔ اس دولت سے قارون کے اندر فخر اور گھمنڈ پیدا ہو گیا۔ اس وقت کچھ صالح بندوں نے اس کو نصیحت کی کہ دولت پر فخر نہ کر۔ اللہ نے تجھ کو جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کا طالب بن اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول (وابتغ فیما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا، القصص ۷۷)

اس کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین کے کچھ اقوال یہ ہیں:

وقيل معناه واطلب بدنياك آخرتك فان ذالك حظ المومن منها (تفسیر النسفی)

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی دنیا کے ذریعہ آخرت چاہو۔ کیونکہ یہی اس سے مومن کا حصہ ہے۔

يعني ما تحصل بها آخرتك فان حقيقة نصيب الانسان من الدنيا ان يعمل للآخرة فان الدنيا مزرعة الآخرة. كذا قال مجاهد وابن زيد. وقال السدى نصيبك من الدنيا الصدقة وصلة الرحم وقال على رضى الله عنه لا تنس صحتك و قوتك وشبابك وغناك ان تطلب الآخرة. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اغتنم خمسا قبل خمس، حياتك قبل موتك وصحتك قبل سقمك وفراغك

یعنی دنیا سے وہ چیز لینا نہ بھولو جس سے تم اپنی آخرت حاصل کر سکو۔ دنیا سے انسان کا اصل حصہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرے۔ کیوں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ مجاہد اور ابن زید کا قول یہی ہے۔ اور سدی نے کہا کہ دنیا سے تمہارا حصہ صدقہ اور صلہ رحمی ہے۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم اپنی صحت اور اپنی قوت اور اپنی جوانی اور اپنی دولت کے معاملہ میں یہ نہ بھولو کہ تم اس کے ذریعہ سے آخرت چاہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیز

قبل شغلك وشبابك قبل هرمك و غناك قبل فقرك۔ وقال الحسن امر ان يقدم الفضل ويمسك ما يغنيه يعني ما يكفيه۔

(التفسیری المظہری)

سے پہلے پانچ چیز کو غنیمت جانو۔ اپنی موت سے پہلے اپنی زندگی کو۔ اپنی بیماری سے پہلے اپنی صحت کو۔ اپنی مشغولیت سے پہلے اپنی فراغت کو۔ اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی کو۔ اور اپنی محتاجی سے پہلے اپنی دولت مندی کو۔ اور حسن بصری نے کہا کہ یہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حقیقی ضرورت کے بقدر مال روک کر ضرورت سے زیادہ کو آگے بھیجو۔

موجودہ دنیا جو انسان کو دی گئی ہے، وہ آخرت کی کمائی کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ جس شخص نے دنیا میں آخرت کے فائدہ والا کام کیا، اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ لیا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا میں صرف دنیا کے فائدہ والا کام کرتا رہا۔ اس نے دنیا سے آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ موت کے بعد دوسری دنیا میں اس طرح پہونچے گا کہ وہاں اس کے لیے کچھ نہ ہوگا۔

یہ انجام صرف عام دنیا داروں کا نہیں ہوگا۔ یہی انجام ان لوگوں کا بھی ہوگا جو بظاہر دین والے کام کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کا مقصد دنیوی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دین کا کام کرکے اگر کوئی شخص مال، قیادت، شہرت، عزت، بڑائی چاہے تو اس نے بھی گویا دنیا سے اپنی آخرت کا حصہ نہیں لیا۔ وہ بھی آخرت میں اتنا ہی نامراد ہوگا جتنا بدنام قسم کے دنیا دار، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

تنقید اور عملی کارروائی

ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں۔ اس سے امت میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ حالاں کہ آپ خود لکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں جب بنی اسرائیل بچھڑے کو پوجنے لگے تو حضرت ہارون نے خاموشی اختیار کرلی۔ تذکیر القرآن میں آپ نے لکھا ہے کہ بہت سے مواقع پر دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باہمی لڑائی سے بچنے کے لیے خاموشی کا طریقہ اختیار کرلیا جائے، حتیٰ کہ شرک جیسے معاملہ میں بھی (حصہ دوم صفحہ ۸۷)

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کو غلط صورت میں نقل کیا۔ میں نے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی گمراہی پر لسانی اظہار تو پوری طرح کیا، مگر جب وہ اصلاح قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے تو ان کے خلاف عملی کارروائی نہیں کی۔ گویا فکری تنقید تو ہر حال میں ضروری ہے۔ البتہ عملی اقدام حالات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ متعلقہ آیات کے سلسلہ میں یہاں صفوۃ التفاسیر (محمد علی الصابونی) سے دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں:

(قال ابنَ امّ ان القوم استضعفوني وكادوا يقتلونني) اي ان القوم استذلوني وقهروني وقاربوا قتلي حين نهيتهم عن ذالك فانا لم اقصّر في نصحهم

(المجلد الاول، صفحہ ۴۷۳)

"ہارون نے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے، قوم نے مجھ کو دبالیا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں" یعنی قوم نے مجھ کو کمزور سمجھا اور مجھ پر غالب آگئی اور میرے قتل کے قریب ہوگئی جب کہ میں نے ان کو اس سے روکا۔ پس میں نے نصیحت میں کوتاہی نہیں کی۔

(اني خشيت ان تقول فرقت بين بني اسرائيل) اي اني خفت ان زجرتهم بالقوة ان يقع قتال بينهم

المجلد الثاني، صفحہ ۲۴۵

"مجھے ڈر تھا کہ تم کہوگے کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی" یعنی مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں انھیں طاقت سے روکوں تو ان کے درمیان جنگ برپا ہو جائے گی

تفریق امت سے بچنا ضروری ہے، مگر اس کا اعتبار عملی احتساب میں کیا جائے گا نہ کہ نظری احتساب میں۔

یہ فرق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ تعلیم دی کہ اپنے مخالفوں سے کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا (قل انی علی بینۃ من ربی وکذبتم بہ، الانعام ۵۷) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اس دنیا میں دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اس کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت واضح دلیل ہوتی ہے نہ کہ محض ادعار۔

دوسری طرف قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو تاکہ تم غالب آجاؤ (وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون، حم السجدہ ۲۶) اس آیت کی تفسیر میں حسب ذیل روایت آئی ہے:

قال الضحاک عن ابن عباس (والغوا فیہ) عیبوہ (تفسیر ابن کثیر) ضحاک راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ والغوا فیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کو عیب لگاؤ۔

جو لوگ کسی بات کو دلیل سے رد نہ کر پائیں اور وہ اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوں، تو اس کے بعد وہ تعییب کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی طرح طرح کے عیب لگا کر اس کو بدنام کرنا۔ پیغمبروں کے مخالفین ہر زمانہ میں اپنے پیغمبروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

کہنے والے کے الفاظ کو اگر کمی بیشی کے بغیر اس کی اصلی صورت میں نقل کیا جائے اور پھر اس کو عقلی یا نقلی دلیل سے رد کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ تنقید ہے، اور تنقید عین جائز ہے۔ لیکن اگر کہنے والے کے الفاظ کو اس کی اصلی صورت میں نقل کیے بغیر اس پر بے دلیل مخالفانہ ریمارک دیا جائے تو یہ تعییب ہے، اور تعییب سراسر ناجائز ہے۔

جب ایک شخص دلیل کی زبان میں کلام کرے، اور اس کے مخالفین اس کے برعکس عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان بول رہے ہوں تو یہ فرق اس بات کا ثبوت ہے کہ شخص مذکور بلاشبہ حق پر ہے اور اس کے مخالفین بلاشبہ ناحق پر۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق دلیل کی زبان پیغمبروں کی زبان ہے۔ اور عیب جوئی کی زبان اہلِ کفر کی زبان۔

مذاق اڑانا حرام ہے

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ، ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو (الحجرات ۱۱) حافظ ابن کثیر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ینھی تعالیٰ من السخریۃ بالناس ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا۔

والمراد من ذلک احتقارھم واستصغارھم اور اس سے مراد ان کو حقیر جاننا اور ان کو چھوٹا

وھذا حرام سمجھنا ہے اور یہ حرام ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے تفسیری نوٹ میں لکھتے ہیں "عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزار کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے۔ مگر ضد و نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔"

دلیل کی بنیاد پر کسی کی تنقید کرنا عین جائز ہے۔ مگر بلا دلیل کسی کا مذاق اڑانا سراسر حرام ہے۔ جب آدمی کسی کا مذاق اڑاتا ہے تو اس کے پیچھے دراصل کبر ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اور دوسرے کو حقیر خیال کرتا ہے۔ یہی وہ نفسیات ہے جس کے تحت کسی کی زبان سے وہ الفاظ نکلتے ہیں جس کو تمسخر یا مذاق اڑانا کہا جاتا ہے۔

یہ متکبرانہ نفسیات کسی کے اندر کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہے دنیوی یا مادی چیزوں کو اہم سمجھنا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے گرد دولت، شہرت، قیادت اور مناصب جمع ہو جائیں ان کو لوگ بڑا سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جس آدمی کے گرد یہ رونقیں دکھائی نہ دیں اس کو حقیر سمجھ لیا جاتا ہے، یہی حقیر سمجھنا لوگوں کو جرأت دلاتا ہے کہ وہ ایسے آدمی کا مذاق اڑائیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ اصل بڑائی وہ ہے جو خدا کے یہاں حاصل ہو۔ اور خدا کے یہاں بڑائی کا معیار دنیوی رونقیں نہیں ہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

مذاق اڑانے والے کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ اس کو قیامت کا پردہ پھٹنے کے بعد اس بات پر شرمندہ ہونا پڑے کہ اس نے ایک بندہ خدا کا اس بنا پر مذاق اڑایا کہ وہ دکھائی دینے والی بڑائی سے خالی تھا حالانکہ عین اس وقت نہ دکھائی دینے والی بڑائی اس کے اندر پوری طرح موجود تھی۔

ایک آیت

سورہ لقمان کے آخر میں ارشاد ہوا ہے : بے شک قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی بارش اتارتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قیامت کی ساری تفصیلات انسان کے علم میں نہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں۔ ہم اپنی بشری محدودیت کی وجہ سے ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ پھر بھی کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرتا۔ زندگی کے تمام معاملات اسی قسم کی " ناکافی " معلومات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی معلومات کو قیامت کے انکار کے لیے معقول وجہ مان لینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

بارش آتی ہے اور آنے والی ہے، مگر انسان کو قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی آج بھی محکمہ موسمیات اس معاملہ میں اتنا ہی عاجز ہے جتنا قدیم دور کا انسان اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا۔

عورت حاملہ ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جننے والی ہے۔ مگر کیا جنے گی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پیدا ہونے والا کتنی مدت تک دنیا میں رہے گا اور کب مر جائے گا۔ وہ کیا کمائے گا۔ وہ برا نکلے گا یا بھلا۔ وہ دوسروں کو کیا دے گا اور خود کیا حاصل کرے گا۔ اندر کا انسان باہر آکر کیا ثابت ہوگا۔ یہ سب باتیں لامعلوم رہتی ہیں۔ پھر بھی انسان یقین رکھتا ہے کہ عورت کے پیٹ سے ایک جان ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ مذکورہ عدم واقفیت کو اس کے انکار کی وجہ نہیں بنا لیتا۔

کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کچھ حاصل کرے گا۔ آدمی پروگرام بناتا ہے مگر اس کی تکمیل ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے۔ مگر اس کا منصوبہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا، اس کو کوئی نہیں جانتا۔

موت ہر ایک کے لیے یقینی ہے۔ مگر کون شخص کہاں مرے گا اور کہاں اپنی کتاب زندگی کا آخری صفحہ لکھے گا، اس کے بارے میں کوئی بھی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

کب، کیا، کتنا اور کہاں کے سوالات جن کو لوگ قیامت کے انکار کے لیے بنیاد بناتے ہیں، ٹھیک انھیں سوالات کی موجودگی میں دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی کمتر واقفیت کی بنا پر قیامت کے بارے میں کیوں شبہ کیا جانے لگے۔

اور اللہ ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے (ویعلم ما فی الارحام) اس آیت کی تفسیر عام طور پر یہ مشہور ہو گئی ہے کہ یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ مگر آیت کے الفاظ میں اس تفسیر کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں۔ "رحم کے اندر کیا ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔" ان الفاظ میں ہر وہ بات آسکتی ہے جو پیدا ہونے والے کی زندگی اور مستقبل سے متعلق ہو۔ یہاں ایسا کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مذکر اور مؤنث کے ساتھ خاص کیا جائے۔

جہاں تک قرآن کی قدیم تفسیروں کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو باتیں کہی جاتی رہی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک تفسیر کا حوالہ نقل کرتے ہیں۔

(ویعلم ما فی الارحام) ای من ذکر او انثی شقی او سعید۔ صفوۃ التفاسیر، محمد علی الصابونی

خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے، یعنی مذکر یا مؤنث، برا یا بھلا۔

اس آیت میں مذکر اور مونث کا قصہ زیادہ تر عوامی ذوق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ عوام کو چوں کہ اس سے بہت زیادہ دل چسپی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پیدا ہونیوالی اولاد لڑکا ہے یا لڑکی، اس لیے یہ تفسیر مشہور ہو گئی۔ ورنہ خود قدیم تفاسیر میں شقی اور سعید کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ پیدا ہونے والا بڑا ہو کر برا نکلے گا یا بھلا ثابت ہوگا۔ "برا اور بھلا" کے الفاظ انتہائی عام اور وسیع ہیں ان میں انسان کی زندگی سے متعلق ہر بات موجود ہے۔ انسان زیادہ عمر کو پہنچ کر جو کچھ بنتا ہے وہ سب ان دو لفظوں میں شامل ہے۔

مذکر اور مؤنث کے بارے میں پہلے بھی انسان اندازے کرتا تھا اور موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اصل بات بدستور انسان کے لیے لامعلوم ہے اور وہ یہ کہ مکمل معنوں میں پیدا ہونے والے کے بارے میں پیشین گوئی کی جائے کہ وہ کیسا عورت یا مرد ثابت ہوگا اور کیسا عورت یا مرد ثابت نہیں ہوگا۔ رحم مادر کا یہ راز اب بھی انسان کے لیے لامعلوم ہے۔

دو طریقے

قرآن میں قیامت کے احوال کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا. وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا. رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا

(الاحزاب ۶۸ - ۶۶)

جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دگنا عذاب دے اور ان پر بھاری لعنت کر۔

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ اور اسی کے مطابق آخرت کے انجام کے اعتبار سے ان کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ گروہ جو خدا کی کتاب اور رسول کی سنت میں غور کرے اور اس میں جو رہنمائی ملے اس کو کسی تبدیلی کے بغیر اختیار کر لے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے معاملات کا رُخ ان کے دنیوی لیڈروں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی رایوں سے متعین ہوتا ہے۔ اوّل الذکر لوگ ہی اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں۔ دوسرے لوگ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہیں قرار پا سکتے۔ خواہ وہ اپنے بڑوں کی پیروی کو خود ساختہ طور پر قرآن و حدیث کے الفاظ میں کیوں نہ بیان کرتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس بدقسمتی سے دوسری نوعیت کے گروہ کا کیس ہے۔ آج مسلمانوں کی بھیڑ جن راستوں کی طرف چلی جا رہی ہے وہ خدا اور رسول کا راستہ نہیں بلکہ ان کے نعرہ باز لیڈروں کا راستہ ہے۔ آپ ان لوگوں کو قرآن کی آیتیں سنا کر بتائیے کہ تمہارا راستہ قرآن کا راستہ نہیں۔ یہ خدا کے رسول کی سنّت کے مطابق نہیں تو وہ ہرگز آپ کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں تو وہی کرنا ہے جو ہمارے بڑوں نے ہم کو بتایا ہے، ہم تمہاری دلیلوں سے اپنا راستہ بدلنے والے نہیں۔

غلط فہمی

محمد دوم یا محمد فاتح (۱۴۸۱-۱۴۳۲) ترکی کا مشہور مسلم حکمراں ہے۔ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کو نئے نام (استانبول) کے ساتھ اپنی راجدھانی بنایا۔ محمد فاتح کے سیاسی کارناموں سے متاثر ہو کر بعض لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرائیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں شرکت کرنے والوں کو خصوصی بشارت دی ہے۔

ایک صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ترکی کے شہر قسطنطنیہ کے بارہ میں رحمۃ للعالمین ؐ پیش گوئی فرماتے ہیں کہ وہ سالار خوش قسمت ہوگا جو دیار قیصر کو بلاد اسلامیہ میں شامل کرے گا...... صدیوں کے بعد یہ پیشین گوئی جس ترک کے ہاتھوں پوری ہوئی وہ محمد فاتح کے نام سے تاریخ کی زینت ہے۔ (صراط مستقیم، نومبر ۱۹۸۵)

حدیث کے اصل الفاظ کو دیکھے بغیر اگر اس مضمون کو پڑھا جائے تو بظاہر مذکورہ بات صحیح معلوم ہوگی۔ مگر حدیث کے اصل الفاظ کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات بالکل غلط ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث بخاری میں ہے۔ اس کے متعلقہ حصہ کے الفاظ یہ ہیں: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر) یعنی میری امت کے پہلے لشکر کے لوگ جو کہ قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) کا غزوہ کریں گے وہ سب بخشے ہوئے لوگ ہیں۔

اس حدیث میں قسطنطنیہ کی فتح کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اس پر پہلا غزوہ کرنے کا ذکر ہے۔ مضمون نگار کے ذہن نے شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے غزوہ کو فتح کے ہم معنی بنایا اور پھر اس کو محمد فاتح پر چسپاں کر دیا۔ حالاں کہ حدیث کے الفاظ کی بنا پر شارحین حدیث عام طور پر اس کا مصداق یزید کی مہم کو قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر نے یزید بن معاویہ کو اس کا مصداق ٹھہراتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں: اور یزید پہلا شخص ہے جس نے قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا (وقد کان یزید اول من غزا مدینۃ قیصر، البدایہ والنہایہ)

ایک لفظ کے بدلنے سے کس طرح بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

دو نمونے

اس دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ کسی صورت حال میں کس قسم کا جواب پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے انسانوں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک صحیح جواب پیش کرنے والے، اور دوسرے غلط جواب پیش کرنے والے۔ صحیح جواب کیا ہے اور غلط جواب کیا۔ اس سلسلہ میں یہاں دور اول کی دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

قرآن میں مختلف طریقہ سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے: من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً (کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے) اس سلسلہ میں ایک روایت حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے:

قال سعید بن جبیر عن ابن عباس. لما نزل قوله تعالی (من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنًا فیضاعفه له اضعافا کثیرة) قالت الیهود یا محمد، افتقر ربک فسأل عبادہ القرض

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۳)

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اس کو کئی گنا لوٹائے، تو مدینہ کے یہود نے کہا کہ اے محمد، تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے اس لیے اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے۔

یہ ایک قسم کے کردار کی مثال ہے۔ یعنی وہ مثال جب کہ آدمی بات کو صحیح رخ سے نہ لے۔ وہ اس میں شوشہ نکال کر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے برعکس وہ داعی کی بات میں عیب نکال کر یہ ظاہر کرے کہ اس کی بات اس قابل ہی نہیں کہ اس پر عمل کیا جائے۔

اب دوسرے قسم کے کردار کی مثال لیجئے۔ مذکورہ قرآنی آیت میں ایک شخص کو صرف استہزاء کا مواد ملا تھا۔ مگر یہی آیت جب دوسرے آدمی کے سامنے آئی تو اس پر بالکل مختلف رد عمل ہوا۔ روایات میں آتا ہے۔

عن عبد اللہ ابن مسعود قال لما نزلت

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب قرآن کی

هٰذہ الآیۃ (مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول اللہ وان اللہ لیرید منا القرض ۔ قال نعم یا ابا الدحداح۔ قال ارنی یدك یا رسول اللہ ۔ قال فناولہ یدہ۔ قال فانی قد اقرضت ربی حائطی ۔ ولہ حائط فیہ ست مائۃ نخلۃ و ام الدحداح فیہ وعیالھا ۔ قال فجاء ابوالدحداح فناداھا یا ام الدحداح. قالت لبیك ۔ قال اخرجی فقد اقرضتہ ربی عزوجل ۔ فقالت لہ ربح بیعك یا ابا الدحداح ونقلت منہ متاعھا و صبیانھا ۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۳۰۷)

یہ آیت اتری: کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو وہ اس کو کئی گنا بڑھا دے۔ اس آیت کو سن کر حضرت ابوالدحداح نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اے ابوالدحداح۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ اور ان کا ایک باغ تھا جس میں چھ سو کھجور کے درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام الدحداح اپنے بچوں کے ساتھ اس میں تھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوالدحداح آئے اور آواز دی کہ اے ام الدحداح۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ابوالدحداح نے کہا کہ اس باغ سے نکلو۔ کیوں کہ وہ میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ام الدحداح نے کہا کہ اے ابوالدحداح، آپ کا سودا کامیاب رہا۔ اور اپنا سامان اور بچے لے کر وہاں سے چلی آئیں۔

قرآن کی جو آیت اوپر نقل کی گئی ہے، وہ انھیں الفاظ کے ساتھ یہود کے سامنے آئی۔ اور ٹھیک انھیں الفاظ کے ساتھ ابوالدرداء انصاری کے سامنے آئی۔ مگر دونوں کا رد عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کلام کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کا صحیح جواب دینے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔ اگر آدمی سنجیدہ نہ ہو تو وہ نہ خدا کے کلام کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے اور نہ انسان کے کلام کے ساتھ۔

آدمی کی جانچ

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ظاہری چیزوں کو سامنے رکھ کر اصل حقیقتوں کو پردہ کے پیچھے چھپا دیا گیا ہے۔ اب آدمی کی جانچ یہ ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر باطن تک پہونچ جائے۔ وہ شہود سے بلند ہو کر غیب کو دیکھ لے۔ وہ چھپی ہوئی حقیقتوں کو اس طرح جان لے جیسے کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی حالت میں موجود ہیں۔ ہمارے سامنے ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور آدمی کا امتحان اس میں ہے کہ کون پردہ کو پھاڑ کر پردہ کے دوسری طرف دیکھ لیتا ہے اور کون پردہ کے اس پار دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ظاہر میں اُلجھے بغیر باطن تک پہونچ جائے ——— ایک چیز جو بظاہر خرید کر مل رہی ہے اس کو بطور عطیہ ملنے والی چیز سمجھنا، ایک چیز جو بازار سے مل رہی ہے اس کو کائناتی خزانہ سے ملنے والی چیز سمجھنا، ایک چیز جو بظاہر انسان سے مل رہی ہے اُس کو خدا سے ملنے والی چیز سمجھنا، اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ اور وہی شخص صاحب معرفت ہے جس کو ایمان بالغیب کا یہ درجہ حاصل ہو جائے۔

جینے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اندھا بن کر جینا، ایک ہے آنکھ والا بن کر جینا۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ کون شخص کس طرح جیتا ہے۔ جو شخص آج کی امتحان گاہ میں اندھا بن کر جئے گا وہ آئندہ آنے والی مستقل دنیا میں ہمیشہ اندھا ہو کر بھٹکتا رہے گا۔ جو شخص آج کی امتحان گاہ میں بینا بن کر جئے گا وہ آئندہ کی دنیا میں آنکھوں والا ہوگا۔ دنیا کی تمام نعمتیں مزید اضافہ کے ساتھ اس کو ابدی طور پر دے دی جائیں گی۔ (من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمی واضل سبیلاً)

آپ کھانے کے دسترخوان پر بیٹھے ہیں۔ آپ کے سامنے میز پر دودھ اور گوشت اور پھل رکھا ہوا ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس کو بس "بازار سے خریدی ہوئی چیز" سمجھ کر کھانا شروع کر دے۔ غفلت اور بے فکری کے ساتھ کھا کر ڈکار لے اور پھر دوبارہ اپنے غفلت کے مشغلوں میں لگ جائے۔

یہ اندھے شخص کا کھانا ہے۔ کیوں کہ دودھ اور گوشت اور پھل "بازار سے خریدی ہوئی چیز" نہیں، وہ قدرت کے عظیم شاہکار ہیں۔ ساری کائنات کے ناقابل بیان عمل کے بعد یہ ممکن ہوا ہے کہ زمین پر دودھ اور پھل اور گوشت موجود ہو اور انسان اس کو کھا کر بھوک مٹائے اور قوت اور زندگی حاصل کرے۔

دوسرا شخص وہ ہے کہ جب اس کے سامنے دودھ اور گوشت اور پھل آیا تو اس کو دیکھتے ہی اس کے ذہن نے سوچنا شروع کیا۔ اچانک اس پر منکشف ہوا کہ یہ قدرت کے کارخانہ کی مصنوعات ہیں۔ خدا کی زندہ فیکٹری (گائے بھینس) گھاس چرتی ہے اور اس کو دودھ اور گوشت میں تبدیل کرتی ہے۔ درخت زمین سے اور فضا سے مٹی اور پانی اور گیسیں لیتا ہے اور اس کو پھول اور پھل میں تبدیل کرتا ہے۔ پھر اور آگے بڑھ کر جب وہ سوچتا ہے کہ ان فیکٹریوں کا قیام کیسے ممکن ہوا تو اس کے سامنے پوری کائنات کا نظام آجاتا ہے۔ اس کو دکھائی دیتا ہے کہ ایک لامحدود کائنات کھرب ہا کھرب سال تک گردش کرتی رہی تب موجودہ دنیا کا نظام قائم ہوا۔ موجودہ دنیا اپنی تمام وسعتوں کو لیے ہوئے کامل ہم آہنگی کے ساتھ مساعدت کرتی ہے اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی درخت پھل دے اور کوئی جانور دودھ اور گوشت تیار کرے۔

یہ سب سوچ کر اس کے اندر ایک عجیب تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ دودھ یا گوشت یا پھل اپنے منہ میں ڈالتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی ایک بے پایاں نعمت کو اپنے منہ میں ڈال رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں آدمیوں کا کھانا ایک نہیں، اس لیے دونوں آدمیوں کا انجام بھی ایک نہیں۔ جس طرح پتھر کھانے والے کا انجام اور پھل کھانے والے کا انجام ایک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان دو آدمیوں کا انجام بھی ایک نہیں ہو سکتا جن میں سے ایک نے اندھے پن کے ساتھ کھایا ہو اور دوسرے نے آنکھ والا بن کر کھایا ہو (قل ھل تستوی الاعمیٰ والبصیر وھل تستوی الظلمات والنور)

اندھوں کے لیے دوزخ ہے اور آنکھ والوں کے لیے جنت۔ آدمی نے جو چیز دنیا میں پائی ہے وہی وہ آخرت میں بھی پائے گا، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

منافقت

ایک لمبی حدیث ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد انسان کے اوپر کیا احوال گزریں گے۔ اس سلسلہ میں حدیث کا ایک جزء یہ ہے :

وان کان کافراً اومنافقاً یقول له ماتقول فی هذا الرجل. فیقول لا ادری. سمعت الناس یقولون شیئاً فیقول لادریت ولا تلیت ولا اهتدیت. ثم یفتح له باباً الی الجنة فیقول له هذا منزلك لو آمنت بربك. فاما اذ کفرت به فان الله عزوجل ابدلك به هذا فیفتح له باباً الی النار.

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۵۴۳)

اگر مرنے والا منکر یا منافق ہے تو فرشتہ اس سے پوچھے گا کہ تم اس آدمی (پیغمبر) کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ وہ جواب دے گا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے لوگوں کو سنا کہ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر وہ کہے گا کہ میں نے اس کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ میں نے اس کی پیروی کی اور نہ میں نے اس سے رہنمائی حاصل کی۔ پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھولا جائے گا۔ پھر فرشتہ اس سے کہے گا کہ یہ تمہاری جگہ تھی اگر تم اپنے رب پر ایمان لاتے۔ مگر جب تم نے اس کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں یہ دیدیا۔ پھر اس کے لیے جہنم کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جائے گا۔

اس حدیث میں مرنے کے بعد جس انجام کا ذکر ہے، اس میں کافر کے ساتھ منافق کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ منافق کا لفظ پہلی بار مدینہ میں استعمال کیا گیا۔ وہاں کون لوگ تھے جن کو منافق کہا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کلمہ کا اقرار کرتے تھے۔ نماز اور دوسری عبادات پر بظاہر عمل کرتے تھے۔ البتہ ان کے دل میں ایمان پوری طرح نہیں اترا تھا۔ وہ ان مواقع پر پیچھے رہ جاتے تھے جہاں قربانی کی قیمت پر اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہو۔ وہ مصلحت کی سطح پر مسلمان بنے تھے نہ کہ حقیقۃً قلبی شہادت کی سطح پر۔

دینِ اکابر

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے، اور امت مسلمہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ۷۲ فرقے آگ والے ہیں، صرف ایک جنت والا ہے۔ یہ ایک فرقہ "الجماعت" ہے (ابوداؤد) "الجماعت" سے کیا مراد ہے، اس کی تشریح ترمذی کی روایت سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، یہ الجماعت کون لوگ ہیں۔ آپ نے جواب دیا: جو اس پر ہو جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (مَن کَانَ عَلیٰ مَا اَنَا علیہِ وَاَصْحَابِی)

فرقوں کی یہ کثرت کیسے ہوتی ہے، اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: انھوں نے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں (اِتَّخَذُوا اَحْبَارَھُم وَرُھبَانَھُم اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ وَالمَسِیحَ ابنَ مَریَم وَمَا اُمِرُوا اِلَّا لِیَعبُدُوا اِلٰھًا وَاحِدًا، التوبہ ۳۱)

جب لوگ دینِ خدا پر ہوں تو دین ایک رہتا ہے۔ تمام لوگوں کے لیے دین کا ایک ہی ماخذ ہوتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ لوگ ہر معاملہ میں قرآن کی طرف دیکھتے ہیں اور اس میں جو ہدایت ملے اس کو بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ معلوم ہوجانے کے بعد وہ دوبارہ کوئی بحث نہیں نکالتے۔ جن لوگوں میں یہ مزاج ہو ان کا دین ایک رہے گا۔

مگر جب قوم میں زوال آتا ہے تو اس کے اکابر اس کے لیے دین کا ماخذ بن جاتے ہیں۔ اب قرآن کو یا تو ثواب اور تبرک کے طور پر پڑھا جاتا ہے یا اپنے اکابر کے دین کو صحیح ثابت کرنے کے لیے۔ خدا کی کتاب اصل رہنما کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیتی ہے۔

خدا ایک ہے مگر اکابر ایک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم جب دین اکابر پر ہوتی ہے تو اس کے یہاں فرقوں کی کثرت ہوجاتی ہے۔ ملت کا "۷۳ فرقوں" میں بٹنا دراصل "۷۳ اکابر" کے حلقوں میں تقسیم ہونے کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان آج اسی دین اکابر پر ہیں۔ ان کے یہاں اکابر کے نام پر سرگرمیاں ہیں مگر خدا کے نام پر کوئی سرگرمی نہیں۔ اکابر کی بڑائی بیان کرنے سے ان کے زبان وقلم نہیں تھکتے مگر خدا کی بڑائی بیان کرنے والا ان کے درمیان کوئی نہیں۔

راہِ عمل

قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں جو حدیثیں آئی ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے :

عن عُمَر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذا الکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اٹھاتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کو گرا دیتا ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ کسی گروہ کے پاس قرآن کی محض موجودگی وہ چیز ہے جو اس کو ترقی اور کامیابی کے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ زمانہ کے مسلمان ہرگز تباہی اور بربادی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ آج مسلمانوں کے پاس ہر جگہ قرآن موجود ہے۔ آج پریس کا دور ہے۔ قرآن کے نہایت صحیح نسخے کروروں کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں پھیل گیے ہیں۔ کوئی گھر اور کوئی مسلم بستی ایسی نہیں ہے جہاں قرآن کے نسخے لوگوں کے پاس موجود نہ ہوں۔

پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے۔ کیوں کر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ کوئی قوم اوپر اٹھتی ہے، اور دوسری قوم قرآن کے ذریعہ سے گر کر تباہ ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ نتیجہ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار کریں وہ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں، اور جو لوگ قرآنی نقطۂ نظر کو اختیار نہ کریں وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن میں زندگی کی تمام حقیقتیں بتا دی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ (الانبیاء ۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری جس میں تمہارا ذکر ہے۔

اس آیت میں "ذکر" سے کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں ہم دو حوالے نقل کرتے ہیں :

(فیہ ذکرکم) ای ذکر ما تحتاجون الیہ — یعنی ان تمام باتوں کا تذکرہ جو دین کے معاملہ

من امر دینکم (التفسیر المظہری) فیہ ذکر دینکم — میں تمہیں درکار ہیں۔ قرآن میں تمہارے دین کا بھی
ودنیاکم (تفسیر النسفی) — ذکر ہے اور تمہاری دنیا کا بھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ فتنے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اے جبریل، پھر اس کا حل کیا ہے۔ حضرت جبریل نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ اس میں آپ سے پہلے کی خبر ہے اور اس میں آپ کے بعد کی خبر ہے اور اس میں فیصلہ موجود ہے (نزل جبریل علیہ السلام علی عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ انہا ستکون فتن۔ قال فما المخرج منہا یا جبریل۔ قال کتاب اللہ۔ فیہ نبأ ماقبلکم و نبأ ماھو کائن بعدکم وفیہ الحکم بینکم، جامع الاصول، جزء ۸، صفحہ ۴۶۴)

جب قرآن کی حیثیت یہ ہے تو ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے مسائل کے لیے قرآن کو دیکھیں اور اسی کے اندر اس کا حل تلاش کریں۔ قرآن کے اندر جب تمام باتیں ہیں تو یقیناً اس کے اندر ہمارے موجودہ سنگین مسائل کا بیان بھی ہونا چاہیے، اور یہ بھی کہ ان مسائل کا واقعی حل کیا ہے۔ ہمیں قرآن میں دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمارے مسائل کے بارہ میں ہمیں کیا نقطۂ نظر دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں تمام مسائل کے بارہ میں اعلیٰ رہنمائی موجود ہے۔ مگر اس رہنمائی کو پانے کے لیے صرف قرآن کو پڑھ لینا کافی نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو اس کامل آمادگی کے ساتھ پڑھا جائے کہ جو رہنمائی قرآن میں ملے گی اس کو میں بے چون وچرا قبول کرلوں گا۔

قرآن کی رہنمائی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر قرآن سے رہنمائی حاصل کریں۔ جو قرآن کی رہنمائی کو ماننے کے لیے اس طرح تیار ہوں کہ قرآن اگر ان کی سوچ کی تصدیق نہ کرے تو وہ پکار اٹھیں کہ "میں غلطی پر تھا" مفاد یا ذاتی وقار کا سوال جن کے لیے سچائی کو مان لینے میں رکاوٹ نہ بنے۔

سچائی کو پانے کے لیے اپنے آپ کو جھوٹا کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اپنے جھوٹ کو کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ نہ کرے وہ اس دنیا میں سچائی کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔

ایک آیت

قرآن کی ایک آیت ہے : یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً (البقرہ ۲۰۸) ایک صاحب نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے گویا کہ اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ انقلابی جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں اور تمام دنیا میں اسلام کی مکمل حکومت قائم کر دیں۔ مگر اس قسم کے " انقلابی مشن " کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت کا خطاب فردِ مسلم سے ہے۔ ایک ایک مسلمان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کو خدا کے حکم پر ڈھال لو، تم پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اس آیت میں فرد کے داخلِ اطاعت ہونے کا ذکر ہے نہ کہ نظامِ حکومت کو داخلِ اطاعت کرنے کا۔

عربی میں ایک لفظ اُدْخلوا (پیش کے ساتھ) ہے۔ دوسرا لفظ اَدْخِلوا (زبر کے ساتھ) ہے۔ سورۃ البقرہ (۲۰۸) میں پہلا لفظ ہے، اور سورۃ المومن (۴۶) میں دوسرا لفظ۔ اُدخلوا کے معنی ہیں داخل ہو جاؤ۔ اور اَدخِلوا کے معنی ہیں داخل کرو۔ بالفاظِ دیگر، پہلے لفظ کا خطاب اپنے آپ سے ہے، اور دوسرے لفظ کا خطاب دوسروں سے۔ سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں اُدخلوا (پیش کے ساتھ، نہ کہ زبر کے ساتھ) ہے۔ یعنی اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو مکمل اسلام میں داخل کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خود بحیثیت ایک فرد کے پوری طرح اسلام کے اندر آجاؤ۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: " اے ایمان والو، داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے "۔ اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: " اسلام کو پورا پورا قبول کرو۔ یعنی ظاہر و باطن اور عقیدہ و عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو۔ یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کر لو، یا کوئی عمل کرنے لگو۔ سو اس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے۔ کیوں کہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کر لیا جائے۔ مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں، اگر بدونِ حکمِ شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے، جیسے عید کے دن عید گاہ میں نوافل کا پڑھنا یا ہزارہ روزہ رکھنا، یہ بدعت ہو گا۔ خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو "۔ صفحہ ۴۰

پیغمبر اسلام

قرآن میں ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل (آل عمران ۱۴۴)
اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام محمد صلے اللہ علیہ وسلم ویسے ہی ایک رسول تھے جیسے دوسرے تمام رسول۔
آپ میں اور دوسرے رسولوں میں درجہ اور منصب کا کوئی فرق نہیں۔ خدا کے تمام رسول ایک ہی دین
لے کر آئے۔ ان میں سے کوئی رسول نہ دوسرے رسولوں سے افضل تھا۔ اور نہ ان میں سے کسی کا دین دوسروں
کے دین کے مقابلہ میں زیادہ کامل۔
اس سلسلے میں یہاں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا تخیروا بین الانبیاء (متفق علیہ)

مجھ کو نبیوں کے درمیان ممتاز نہ ٹھہراؤ۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تفضلوا بین انبیاء اللہ (بخاری)

اللہ کے نبیوں میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما ینبغی لاحد ان یقول انی خیر من یونس بن متی (متفق علیہ)

کسی شخص کو نہیں چاہئے کہ وہ کہے کہ میں یونس ابن متی سے بہتر ہوں۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال انا خیر من یونس بن متی فقد کذب (بخاری)

جس شخص نے کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے جھوٹ کہا۔

پھر محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے رسولوں میں کیا فرق تھا۔ وہ فرق یہ تھا کہ دوسرے رسول صرف
رسول تھے اور آپ اس کے ساتھ آخری رسول (ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین) دوسرے
رسول سلسلۂ رسالت کی درمیانی کڑی تھے اور آپ سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی۔
ایک شخص جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ آپ کے یہاں

کچھ ایسی چیزیں پاتا ہے جو دوسرے انبیاء کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ اب چوں کہ قرآن آپ کی اضافی حیثیت صرف یہ قرار دیتا ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ مانیں کہ یہ مزید چیزیں خاتم النبین ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان مزید چیزوں کی توجیہہ ختم نبوت کے تصور کے تحت کی جائے گی نہ کہ کسی اور تصور کے تحت۔ جو چیزیں آپ میں اور دوسرے رسولوں میں مشترک ہیں وہ آپ کی حیثیتِ رسالت کے خانہ میں جائیں گی۔ اور جو چیزیں آپ میں اور دوسرے نبیوں میں مشترک نہیں وہ آپ کی حیثیت خاتم النبیین کے خانہ میں۔

مثلاً محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کے مخالفین پر سیاسی فتوحات حاصل ہوئیں۔ آپ کا دین زمین کے ایک بڑے حصہ میں غالب اور حکمراں ہو گیا۔ یہ ایسی چیز جو دوسرے نبیوں کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ یہ فرق کیوں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آپ خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کا لایا ہوا دین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ (انّا نحن نزلنا الذکر وانّا له لحافظون) کوئی طاقت اس میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہ کر سکے۔ آسمانی کتاب میں تحریف کے بعد نیا نبی آنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چوں کہ آپ کے بعد خدائی اسکیم میں کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی مستقل اور قابل اعتماد حفاظت کا انتظام کر دیا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جو سیاسی غلبہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔

یہ خدا کی ایک خاص مصلحت تھی جس کے لئے آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو عرب میں اور اطراف عرب میں کامل غلبہ دیا گیا۔ اس طرح خدا کی آخری کتاب کی پشت پر ایک ایسی طاقت و حکومت کھڑی کر دی گئی جو صدیوں تک مسلسل اس کی حفاظت کرتی رہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام دشمن طاقتیں قرآن کو مٹا ڈالتیں یا اس کو اس طرح بدل دیتیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت و رہنائی کے لئے اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیاسی غلبہ کو جمع کرنا آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت کے لئے تھا۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ سیاسی غلبہ کے ذریعہ یہ مقصد صد فی صد حاصل ہوا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جو تصویر قرآن وحدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ اور آپ کی صحیح اور سچی تصویر یقینی طور پر وہی ہے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہو۔

تکمیل ایمان

عن ابی امامة ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مَن احبَّ لِلّٰہ و أبغضَ لِلّٰہ. وأعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان (رواہ ابوداؤد)

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

آدمی کلمہ کے الفاظ ادا کرکے ایمان کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا ایمان اللہ کی نظر میں اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کے اندر مذکورہ خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

آدمی کے ایمان کی تکمیل یہ ہے کہ اس کی پوری شخصیت اس ایمان میں ڈھل جائے جس کا اس نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے۔ ایمان کے بعد اس کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے جذبات کا مرکز ومحور ایک اللہ کی ذات بن جائے۔ وہ کسی کو چاہے تو خدا کے لیے چاہے۔ کسی کو نہ چاہے تو خدا کے لیے نہ چاہے۔ کسی کو کچھ دے تو خدا کے لیے دے اور کسی کو دینے سے رکے تو اس لیے رکے کہ خدا نے اس کو دینے سے منع کیا ہے۔

دنیا میں آدمی کی پوری زندگی انھیں چیزوں کے تحت گزرتی ہے۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت، وہ اپنا اثاثہ کسی کو دیتا ہے اور کسی کو دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہ محبت اور نفرت اور یہ دینا اور نہ دینا اگر اپنی ذاتی پسند کے تابع ہو تو وہ غیر مومنانہ روش ہے اور اگر وہ خدا کی مرضی کے تابع ہو تو اسی کا نام مومنانہ روش ہے۔

اس معاملہ میں کوئی شخص جتنا زیادہ اپنے رویہ کو خدا کے ماتحت کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ کامل ہوتا چلا جائے گا اور جتنا زیادہ اس معاملہ میں وہ کمی کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے نزدیک ناقص قرار دیا جائے گا۔

آدمی اس دنیا میں اپنے تمام معاملات محبت اور نفرت کے جذبہ کے تحت کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اس محبت اور نفرت کا اللہ کی مرضی کے تابع ہونا مومنانہ روش ہے، اور اس محبت اور نفرت کا ذاتی خواہش کے تابع ہونا غیر مومنانہ روش۔

بے معنی مسائل

حدیث میں آیا ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الاغلوطات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔ اغلوطات سے مراد وہ مسائل ہیں جو واقع ہونے سے پہلے فرضی طور پر قائم کئے جاتے ہیں (ھی المسائل التی لم تقع)

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال	اللہ نے تمہارے لئے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال ضائع کرنے کو ناپسند کیا ہے۔

یہ تعلیم بے حد حکمت پر مبنی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج باقی نہ رہے تو وہ ہر بات کو بحث کا موضوع بنائیں گے، ہر چیز کو منطق کے پیمانہ سے ناپیں گے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دین کا اصل سرا چھوٹ جائے گا اور بے معنی مسائل پر لفظی بحث کے سوا ان کے پاس اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ خدا کا سادہ دین انسانی اضافوں کے بعد مشکل اور پیچیدہ دین ہو کر رہ جائے گا۔

ایک مثال لیجئے۔

ایک مرتبہ کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کیا تم مسلمان ہو۔ اس کی زبان سے نکلا: انا مومن انشاء اللہ (خدا نے چاہا تو میں مومن ہوں) یہ بات بحث کی نہ تھی۔ مگر ماہرین فقہ نے غیر ضروری طور پر اس کو بحث کا موضوع بنایا۔ اب ان کے درمیان یہ بحث چل پڑی کہ اس قسم کا جواب دینا جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گروہ نے کہا کہ جائز ہے۔ کیونکہ کسی کا مومن ہونا یا نہ ہونا خدا کی مشیت ہی پر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنے ایمان میں شک ہے۔

شافعی مسلک کے لوگ اس کے قائل تھے کہ انا مومن انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اس کے برعکس حنفی مسلک کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا کہنا جائز نہیں۔ جب یہ بحث بڑھی تو یہ سوال پیدا ہوگیا کہ ایسے لوگوں کے درمیان نکاح درست ہوگا یا نہیں۔ ایک گروہ نے کہا کہ حنفی عورت کا نکاح شافعی مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ کیونکہ اس کو اس کے ایمان پر شک ہے (لا یصح لانہا تشک فی ایمانہا) دوسروں کا فتویٰ یہ تھا ذمی عورت پر قیاس کرتے ہوئے نکاح درست ہوگا (یصح قیاسا علی الذمیۃ)

اس سے اندازہ کیجئے کہ غیر ضروری بحثوں میں پڑنے کے بعد صراط مستقیم کا سرا کس طرح چھوٹ جاتا ہے۔

قرآن جامع العلوم ہے

کسی شاعر کا شعر ہے:

جمیع العلم فی القرآن لکن　　تقاصر عنہ افہام الرجال

قرآن میں سارا علم موجود ہے۔ مگر لوگوں کی فہم اس کو پانے سے قاصر ہو رہی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری اس عربی شعر کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کسی غبی کا شعر ہے۔ اور زیادہ جلال آنے پر اس شعر کے کہنے والے کو غبی الاغبیا ر کہتے تھے (حیات انور) مگر قرآن میں خود اس کتاب کو کتاب مفصل (الانعام ۱۱۴) کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کی تفصیل (یوسف ۱۱۱) موجود ہے۔ ان حالات میں شاعر نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ، قرآن کی بات کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ قرآن میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ مطلق اور عام ہیں۔ مگر تمام محقق علماء اس مطلق کو مقید کرتے ہیں۔ مذکورہ شعر کو بھی اسی معنی میں سمجھنا چاہئے۔ ورنہ قرآن میں تو ساری شریعت بھی موجود نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں سارا علم موجود ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن بجلی یا پٹرولیم انجینیرنگ کی ٹکسٹ بک ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ علم انسانی کے سرے قرآن میں موجود ہیں۔ وہ تمام اصولی اور اساسی باتیں قرآن میں موجود ہیں جو انسان کے لئے اس کی زندگی کی تعمیر کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

قرآن کا اصل اور براہ راست موضوع توحید اور آخرت ہے۔ وہ انسان کے سامنے خالق کا تعارف کراتا ہے اور آنے والی ابدی زندگی کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تاہم اصل موضوع کی تفصیل کے دوران ضمنی طور پر وہ تمام باتیں بھی مذکور ہو گئی ہیں جو حیات دنیا کی تعمیر کے لئے اساسی اہمیت رکھتی ہیں۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کا قصہ نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ اس قصہ سے اصلاً جو سبق دیا ہے وہ تمام تر توحید اور رسالت اور آخرت کے مسائل ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس میں بہت سے ایسے اشارے بھی شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق حیات دنیا کی تعمیر سے ہے۔ مثلاً مدین کے سفر کے دوران حضرت شعیب کی لڑکی کا اپنے والد سے یہ کہنا کہ انّ خیر من استاجرت القوی الامین (القصص ۲۶)

یہاں نہایت مختصر لفظوں میں وہ دو اہم ترین خصوصیت بتا دی گئی ہے جو آجر کو اجیر کے تقرر کے وقت سامنے رکھنا چاہئے ایک یہ کہ وہ محنتی ہو اور دوسرے یہ کہ وہ دیانت دار ہو۔ یہ دو الفاظ اتنے جامع ہیں کہ ان پر جو اضافہ بھی کیا جائے گا وہ انھیں دونوں میں سے کسی کے تحت آجائے گا۔

ایسی بحثیں نہ چھیڑو جو لوگوں کو اللہ سے غافل کر دے

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا اولئک لھم عذاب مھین۔ واذا تتلی علیہ آیتنا ولی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا فبشرہ بعذاب الیم (لقمان ۶-۷)

اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے کہ مول لیتا ہے غافل کرنے والی بات کو تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بھٹکا دے اور اس کی ہنسی اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ گھمنڈ کے ساتھ اس طرح منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس کو سنا ہی نہیں۔ جیسے اس کے کان بہرے ہیں۔ اس کو خبر دے دو دکھ والے عذاب کی۔

اس آیت میں لھو الحدیث سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں بعض واقعات تفسیر کی کتابوں میں آئے ہیں عبداللہ بن مسعود رضؓ نے اس کی تفسیر غنا سے کی ہے اور ضحاک نے شرک سے (ابن کثیر) مگر مفسرین کے اصول کے مطابق، اس کا شان نزول گو خاص ہو تاہم عموم الفاظ کی وجہ سے اس کا حکم عام رہے گا۔ جو لھو یا شغل بھی سبیل اللہ سے ہٹانے کا سبب بنے وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل ہوگا۔ ابن جریر نے کہا ہے کہ ہر وہ کلام لھو الحدیث ہے جو اللہ کی آیتوں سے روکے اور اس کے راستہ کے اتباع سے ہٹائے (کل کلام یصد عن آیات اللہ واتباع سبیلہ) حسن بصری نے کہا کہ ہر وہ چیز لھو الحدیث ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے ہٹانے والی ہو مثلاً فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، بے کار مشغلے، گانا بجانا وغیرہ (کل ما شغلک عن عبادۃ اللہ وذکرہ من السمر والاضاحیک والخرافات والغناء ونحوھا، روح المعانی)

موجودہ زمانہ میں کون سی چیزیں ہیں جو لھو الحدیث کا مصداق ہیں ــــــ وہ تمام تفریحی تماشے اور وہ سستا لٹریچر اس میں شامل ہے جو اپنی سنسنی خیزی اور رومانیت کی وجہ سے لوگوں کے لئے ذہنی شراب بنا ہوا ہے۔ اس میں وہ مقدس حلقے بھی شامل ہیں جنھوں نے بناوٹی قصے کہانیوں کی ایک مذہبی طلسم ہوش ربا تیار کر رکھی ہے اور اس کو سنا سنا کر لوگوں کو مدہوش رکھتے ہیں۔ وہ شعر و شاعری اور خطابت بھی اس میں شامل ہے جو لفظ بازی کے کرتب دکھا کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس میں وہ سیاسی تحریکیں بھی شامل ہیں جو سیاست کی چاشنی تقسیم کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کئے ہوئے ہیں۔ پھر اس میں وہ تمام مذہبی مناظرے بھی شامل ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو غیر متعلق بحثوں میں الجھا کر سواد اعظم سے دور کر دیتے ہیں۔ غرض وہ تمام آوازیں جو عوامی دلچسپی کا سامان پیدا کر کے لوگوں کو حق کی سنجیدہ دعوت سے ہٹائیں اور اللہ کے سیدھے سادے دین سے بے رغبت کریں۔ وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل رہیں گی۔ خواہ اپنے اس مشغلہ کو انھوں نے ارادۂ حق سے روکنے کے لئے جاری کیا ہو یا ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے بطور واقعہ یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہو۔

غلط استدلال

امام البخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب الدعوات (بابُ اذابات طاهراً) میں البراء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو کس طرح سوؤ اور اس وقت کون سی دعا پڑھو۔ یہ ایک لمبی روایت ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے:

آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔ فَإِنْ مُتَّ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ۔ وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَقُولُ۔ فقلتُ استذكرهُنَّ: وَبِرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔ قَالَ لَا۔ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔

میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے اتاری اور تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ اس کے بعد اگر تم مر گیے تو تم فطرت پر مروگے۔ اور تم اس قول کو آخری قول بناؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر میں نے یاد کرتے ہوئے دہرایا: وبرسولک الذی ارسلت۔ آپ نے کہا کہ نہیں۔ وبنبیک الذی ارسلت

اس واقعہ کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حدیث بالمعنی کی روایت جائز نہیں (لا یجوز روایۃ الحدیث بالمعنی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دعا سکھائی تھی اس میں بِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ کا لفظ تھا۔ صحابی نے اس کو دہرایا تو ان کی زبان سے بِرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ نکل گیا۔ دونوں کا مطلب ایک تھا مگر لفظ میں فرق ہو گیا تھا۔ آپ نے اس لفظی فرق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ خود اپنے کہے ہوئے لفظ ہی کو دہرانے کی تاکید فرمائی۔ اس سے یہ نکلا کہ روایت بالمعنی کا طریقہ صحیح نہیں، بلکہ لفظ کی تبدیلی کے بغیر بعینہ روایت کرنا ضروری ہے۔

اگر اس دلیل کو مان لیا جائے تو احادیث کا بیشتر ذخیرہ قابل رد ٹھہرے گا۔ کیوں کہ بیشتر حدیثوں کی حیثیت روایت بالمعنی ہی کی ہے۔ مگر یہ استدلال بذات خود درست نہیں۔ یہ حدیث کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اس کا ایک غلط مفہوم بیان کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ روایت بالمعنی صحیح ہے یا روایت باللفظ۔ اس کا تعلق تمام تر ایک ادبی مسئلہ سے ہے۔ برسولک الذی ارسلت میں لفظی تکرار کی وجہ سے ایک ادبی نقص پیدا ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ نے بنبیک الذی ارسلت کہنے کے لیے فرمایا جو ادبی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے —— اس دنیا میں خدا اور رسول کے کلام کو بھی غلط مفہوم دیا جا سکتا ہے۔ پھر ایک انسان کے کلام سے غلط مفہوم نکالنا کیوں کر ممکن نہ ہوگا۔

نو پرابلم انسان

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن الذی لا یأمن جارہ بوائقہ (البخاری، کتاب الادب) خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور پڑوسی کو ستانا دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان ہوگا تو پڑوسی کو ستانا نہیں ہوگا، اور جہاں پڑوسی کو ستایا جا رہا ہو وہاں ایمان موجود نہ ہوگا۔

اگر کسی مقام پر پھول ہو تو آس پاس کے لوگوں کو خوشبو مل رہی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ پھول تو موجود ہو مگر ماحول کو اس سے بدبو کا تحفہ ملے، اسی طرح مومن خدا کا زندہ پھول ہے۔ وہ جہاں بھی ہو وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو خوشبودار سلوک کی نعمت دے رہا ہوگا۔ اور اگر کسی ماحول میں لوگوں کو بدبودار سلوک کا تجربہ ہو رہا ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہاں نہ ایمان ہے اور نہ وہاں مومن کا کوئی وجود ہے۔

ایمان کیا ہے، ایمان شخصیت کی تعمیر ہے۔ ایمان ایک انسان کو عام انسان کے درجہ سے اٹھا کر خاص انسان بنا دیتا ہے۔ اب وہ ایک محتاط انسان بن جاتا ہے۔ اب وہ صرف اپنے آپ میں نہیں جیتا بلکہ دوسروں کی رعایت کو بھی وہ اپنے لیے لازم قرار دے لیتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کی سرگرمیاں دوسرے کے لیے تکلیف کا سبب تو نہیں بنیں گی۔ اس کی اس محتاط روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے پڑوسیوں کو اس کی طرف سے کسی برے تجربہ کا سابقہ پیش نہیں آتا۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، اس کو لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ مومن ایک نو پرابلم انسان ہوتا ہے۔ وہ خواہ جہاں بھی ہو، ہر جگہ اس کے پاس کے لوگوں اور اس سے تعلق رکھنے والوں کو اس سے راحت ملتی ہے، کسی کے لیے بھی وہ مسئلہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

ایمان کا اول درجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے لیے نفع بخش بنیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ لوگوں کو آپ اپنے ضرر سے بچائیں۔ اس کے بعد ایمان کا کوئی تیسرا درجہ نہیں۔

بے ضرر ہونا

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (البخاری) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہی بات دوسری روایت میں اس طرح آئی ہے کہ: المسلم من سلم الناس من لسانہ (احمد) یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان (اور جس کے ہاتھ) سے لوگ محفوظ رہیں۔

ان دونوں روایتوں میں سے ایک میں "مسلم" کا لفظ ہے اور دوسری میں "لوگ" کا، مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک عام ادبی اسلوب ہے کہ کبھی کلام میں لفظی اعتبار سے بظاہر خصوص ہوتا ہے مگر اس سے عموم مراد ہوتا ہے، اور کبھی باعتبار الفاظ عموم ہوتا ہے اور اس سے خصوص مراد ہوتا ہے۔ یہ اسلوب بہت سی حدیثوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک روایت ہے کہ المسلم اخو المسلم (البخاری) یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ یہی بات دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ: إن العباد کلھم إخوۃ (ابوداؤد) یعنی تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

مسلم وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے۔ جو خدا کی عظمتوں کا اس طرح ادراک کرے کہ اپنا وجود اس کو ہر اعتبار سے غیر عظیم دکھائی دینے لگے۔ ایسے انسان کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں اسی کا ایک پہلو وہ ہے جو مذکورہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

ایسا انسان ہر لمحہ اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر ایسی شخصیت کی تخلیق کرتا ہے جو دوسروں کے لیے کامل طور پر بے ضرر ہو۔ اس کی زبان کسی کے خلاف نہیں کھلتی۔ اس کے ہاتھ سے کسی کو دکھ کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ گویا اس کے لیے نااہل ہو جاتا ہے کہ اس کی طاقت اور صلاحیت کبھی بھی اور کسی حال میں بھی کسی کے خلاف استعمال ہو۔

مومن و مسلم انسان کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنتا اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاتا۔ خدا کی عظمت و جلال کا احساس اس کو ایک ایسے درخت کی مانند بنا دیتا ہے جس کا کانٹا توڑ دیا گیا ہو اور اب اس میں صرف پھول ہی پھول باقی رہ جائیں۔

مومن وہ ہے جو لوگوں کے درمیان نو پرابلم انسان بن کر رہے۔

روایت کو توڑنا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد امت کو سب سے زیادہ جس فتنہ سے ڈرایا تھا وہ باہمی لڑائی کا فتنہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کسی بھی عذر کو لے کر باہمی لڑائی نہ کرنا۔ کیوں کہ میری امت میں اگر ایک بار تلوار اٹھ گئی تو قیامت تک وہ دوبارہ میان میں نہیں جائے گی (اِذا وُضع فی امتی السیف لم یرفع عنهم الی یوم القیامة) مسند احمد

ایک عرب عالم اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لوگوں نے جب خلیفہ عثمانؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس میں ایک بڑا سوراخ کر دیا اور جب انھوں نے امام حسینؓ کو قتل کیا تو انھوں نے اسلام کے لباس کو پھاڑ کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا (حین قتلوا عثمان احدثوا خرقا واسعا فی ثوب الاسلام وحین قتلوا الحسین مزقوا الثوب تمزیقاً)

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی سماج ہمیشہ روایات کے اوپر چلتا ہے۔ کوئی صحت مند روایت کسی سماج میں نہایت مشکل سے قائم ہوتی ہے۔ اور جب کسی سماجی روایت کو کھلم کھلا توڑ دیا جائے تو دوبارہ اس کو قائم کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سماجی روایت کو توڑنا سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں انسانی احترام کی روایت قائم کی تھی۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے مقدس شہر میں خلیفۂ راشد کو بے دریغ قتل کیا۔ اور جب دوبارہ ایک مسلم گروہ نے نواسۂ رسولؐ کو کھلے عام قتل کر دیا تو انھوں نے انسانی جان کے احترام کی روایت کو آخری حد تک توڑ ڈالا۔ اس کے بعد کسی کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اس روایت کو دوبارہ قائم کرے۔ چنانچہ رسولؐ کی پیشین گوئی کے مطابق، وہ پوری مسلم تاریخ میں جاری و ساری ہو گئی۔

کوئی شخص اگر کسی ظلم کو مٹانا چاہتا ہے تو بطور خود وہ خواہ کتنا ہی مخلص ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ روایات کو توڑے بغیر اپنا کام کرے۔ ورنہ ظلم کے خلاف اٹھنے والا خود سب سے بڑا ظالم قرار پائے گا۔

ایک حدیث

ابن ماجہ اور الترمذی (کتاب الزھد) میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے (ازهد في الدنيا يحبك الله وازهد فيما عند الناس يحبك الناس)

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو ذہنی یکسوئی عطا کرتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حقائق مادی سے اوپر اٹھ کر حقائق معنوی کو اپنی ساری توجہات کا مرکز بنا سکے۔ یکسوئی کا یہ عمل اس کی زندگی میں جاری رہتا ہے۔ وہ مسلسل مادیت سے روحانیت کی طرف سفر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شخصیت مکمل طور پر ایک روحانی شخصیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دنیا سے بے رغبتی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک ارتقا یافتہ شخصیت بن سکے۔ یہی ارتقا یافتہ شخصیت وہ چیز ہے جو آدمی کو خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ آدمی عبد رہتے ہوئے اپنے مزاج اور اپنے شاکلہ کے اعتبار سے خدا کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو خدا کی قربت میں جگہ ملے، وہ خدا کا پسندیدہ بندہ بن جائے۔

جب آدمی کے دل میں خدا کی محبت بیٹھتی ہے تو فطری طور پر وہ غیر متعلق چیزوں سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام زہد ہے۔ یہ زہد ہی خدا سے قریب ہونے کی قیمت ہے۔ زہد نہیں تو خدا کی قربت بھی نہیں۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہونا کیوں آدمی کو لوگوں کے لیے قابل قدر اور قابل محبت بنا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا آدمی لوگوں کی نظر میں ایک بلند انسان بن جاتا ہے۔ لوگوں کی چیزوں میں رغبت رکھنے والا آدمی لوگوں کو اپنے برابر کا انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس کے حق میں لوگوں کے اندر قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ نہیں جاگتا۔ اس کے برعکس جو آدمی لوگوں کو بے نیاز دکھائی دے اس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھیں گے ——— خدا کا محبوب بننے کا راز خدا کا طالب بننا ہے، اور لوگوں کا محبوب بننے کا راز لوگوں سے بے نیاز ہو جانا۔

تسبیح خواتین

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو خاص طور پر ایک تسبیح بتائی۔ یہ عام طور پر تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم ۳۳ بار کہو: سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ پھر ۳۳ بار کہو: الحمد للہ، الحمد للہ۔ پھر ۳۴ بار کہو: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہ سب ملاکر ایک سو بار ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس میں تمہارے لیے بہت زیادہ ثواب ہے۔

اس تسبیح کو تسبیح فاطمہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ ہی کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے واسطہ سے امت کی تمام خواتین کو ذکر کا یہ قیمتی تحفہ عطا فرمایا ہے۔ بظاہر وہ تسبیح فاطمہ ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ تسبیح خواتین ہے۔

اصل یہ ہے کہ فطری طور پر عورتوں کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو وہ فوراً ایک دوسرے کی باتوں کا غیر ضروری چرچا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی کے بارہ میں جا و بے جا باتیں ان کا موضوع گفتگو بن جاتی ہیں۔ یہ عورتوں کی ایک عام کمزوری ہے جس سے بہت کم عورتیں اپنے کو محفوظ کر پاتی ہیں۔

مذکورہ تسبیح عورتوں کو اس گناہ سے بچانے کی ایک تدبیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح خواتین کو ایک اچھی مشغولیت دے دی ہے جس میں اپنے آپ کو مصروف کر کے وہ ثواب بھی حاصل کریں اور آخرت کے نقصان سے بھی بچ جائیں۔

خاص طور پر زیادہ عمر کی عورتوں کے لیے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ایک عورت کی عمر جب بڑھتی ہے تو اس کے بعد اس کی عملی مصروفیت اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اپنے خالی وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے بے جا تذکرہ میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ تسبیح کی صورت میں خدا کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کو قلبی سکون حاصل ہوگا اور آخرت میں جنت کا ابدی آرام۔

دلیل نبوت

عن ابی سعید الخدری قال۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : انّ اکثرَ ما اخافُ علیکم ما یُخرج اللہ لکم من برکات الارض۔ قیل وما برکات الارض۔ قال زَھرۃ الدنیا (فتح الباری ۱۱/۲۴۸)

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے اوپر میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ تمہارے اوپر زمین کی برکتیں نکال دے گا۔ پوچھا گیا کہ زمین کی برکتیں کیا ہیں۔ فرمایا : دنیا کی رونق۔

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الرقاق کے تحت درج کیا ہے۔ یعنی وہ باب جس میں دل کو نرم کرنے والی باتیں ہیں۔ یہ بلاشبہ حدیث کا ایک پہلو ہے۔ اس کو پڑھ کر آدمی دنیا کے فتنہ کو سمجھتا ہے اور اس کے اندر آخرت کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔

تاہم اسی کے ساتھ اس حدیث کا ایک اور پہلو ہے۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ ایسا ہوگا کہ زمین کے اندر چھپی ہوئی برکتیں باہر آجائیں گی۔ اس کی رونق اور اس کی چمک دمک کو دیکھ کر تم فتنہ میں پڑجاؤ گے اور دنیا کی طرف دوڑ پڑو گے۔

زمین کے اندر کی یہ برکتیں صنعتی انقلاب کے بعد نکل کر آج سب کے سامنے آگئی ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ساری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو یہ جانتا ہو کہ زمین کے اندر ایسی بارونق چیزیں چھپی ہوئی ہیں، اس کو صرف پیغمبر ہی جان سکتا تھا جس کا رشتہ براہ راست خدا سے جڑا ہوا ہو اور جو عالم الغیب سے معلومات لے کر بولتا ہو۔

یہ حدیث دراصل جدید صنعتی انقلاب کی پیشین گوئی ہے۔ اس انقلاب کے بعد جو پر رونق دنیا سامنے آئی ہے وہ تمام فتنوں سے زیادہ بڑا فتنہ ہے۔ اس کی دل فریبیاں تمام انسانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ یہ دنیا اتنی پر کشش ہے کہ ہر آدمی سب کچھ بھول کر اس کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ خوش قسمت وہ ہے جو اس عظیم فتنہ سے بچ جائے۔ وہی وہ شخص ہے جس کو آخرت میں عظیم انعام دیا جائے گا۔ یہ حدیث مستقبل میں ہونے والے ایک واقعہ کو ماضی میں بتاتی ہے۔ وہ ایک نامعلوم کی پیشگی خبر ہے۔ اس اعتبار سے وہ آپؐ کے پیغمبرِ خدا ہونے کی دلیل ہے۔

اجنبی دین

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء (صحیح مسلم بشرح النووی ۲/۱۰۰۶) یعنی اسلام جب شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ اور پہلے کی طرح دوبارہ وہ اجنبی ہو جائے گا۔ پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے۔

آغاز میں اسلام کس طرح اجنبی تھا۔ مکہ میں وہ امت ابراہیم میں ظاہر ہوا۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو پیغمبر ابراہیم سے منسوب تو کرتے تھے مگر عملاً وہ اپنے خود ساختہ بزرگوں کے دین پر قائم تھے۔ بظاہر وہ اپنے کو موحد سمجھتے تھے مگر انھوں نے وسیلہ اور شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے بڑے خدا کے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بنا لیے تھے۔ وہ خدا کی عبادت کے بھی مدعی تھے مگر خدا کی عبادت کے ساتھ انھوں نے بہت سی نئی نئی رسمیں بھی شامل کر لی تھیں۔ وغیرہ۔

ابتدائی دور کی اجنبیت کی اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعد کے دور کی اجنبیت کیسی ہوگی۔ وہ دوبارہ یہ ہوگی کہ لوگ اپنے دین کو خدا اور رسولؐ سے لینے کے بجائے اپنے مزعوم اکابر سے لینے لگیں گے۔ ان کے یہاں دین کی روح ختم ہو جائے گی البتہ دین کی صورت کی دھوم مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہے گی۔ اسلام ان کی زندگی کا رہنما بننے کے بجائے ان کی قومی اور مادی زندگی کا ضمیمہ بن جائے گا۔ خدائی ہدایت کے الفاظ تو ان کے یہاں باقی رہیں گے مگر ہدایت الٰہی کی معنویت ان کے یہاں سے رخصت ہو جائے گی۔ خدا کا خوف اور آخرت کی تڑپ والا دین ان کے درمیان موجود نہ ہوگا، البتہ ظاہرداری والا دین خوب فروغ پائے گا۔

جب امت مسلمہ کا یہ حال ہوگا تو وہ سچے دین سے ناآشنا ہو جائے گی۔ اس کے سامنے جب دین کو اس کی اصل ابتدائی حالت میں پیش کیا جائے گا تو اس کو وہ ایک اجنبی دین معلوم ہوگا۔ وہ اسلام کے نام پر اسلام کا انکار کر دے گی۔ ایسے لوگ اپنے بنائے ہوئے دینی ڈھانچہ کو جانیں گے لیکن خدا اور رسولؐ کے دین کو پہچاننے کے لیے وہ عاجز ثابت ہوں گے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اجنبیت کے دور میں خدا کے دین کو پہچانیں۔

مظلوم کے لیے خوش خبری

فورٹ وین جرنل گزٹ (Fort Wayne Journal-Gazette) امریکی ریاست انڈیانا کا ایک علاقائی اخبار ہے۔ اس نے ایک مقامی ریسٹوراں کے بارے میں ایک خبر چھاپی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ انسپکٹر نے ریسٹوراں کی جانچ کی تو اس نے اس کے ایک کمرے میں چوہے کی بیٹ (rat droppings) پائیں۔ اخبار کے ہیڈلائن رائٹر نے اس خبر کی سرخی یہ لگا دی کہ جانچ کرنے والے نے ہوٹل میں چوہے پائے۔ یعنی ریسٹوراں میں صرف چوہے کی کچھ بیٹ ملی تھی مگر سرخی میں یہ لکھ دیا کہ ریسٹوراں میں زندہ چوہے پائے گئے۔

یہ ۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ مذکورہ اخبار نے اگرچہ اگلے دن اس کی معذرت چھاپ دی تھی مگر ریسٹوراں کا مالک اس معاملہ کو عدالت میں لے گیا۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اس غلط سرخی (inaccurate headline) کی وجہ سے میرے ہوٹل کی بدنامی ہوئی اور مجھے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ لمبی سماعت کے بعد عدالت نے ریسٹوراں کے دعوی کو قبول کرتے ہوئے اخبار کے اوپر تقریباً تین کروڑ روپیہ (985,000 $) کا جرمانہ عائد کیا جو اس کو ریسٹوراں کے مالک کو ادا کرنا ہوگا۔ (دی پائنیر ۲۴ جون ۱۹۹۴)

ہندستان جیسے ملکوں میں تو اس طرح کی زیادتیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ حال ہے کہ اگر ایک آدمی کسی کے خلاف ایسی زیادتی کر بیٹھے تو مظلوم آدمی خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ عدالت سے رجوع کرکے وہ اس کا بھرپور معاوضہ حاصل کرسکتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عقیدہ کی رو سے اس وقت خوش ہونا چاہیے جب کہ کوئی شخص ان کے خلاف ظلم و زیادتی کا کوئی واقعہ کرے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو جانی و مالی نقصان پہنچائے، اس کی جائداد غصب کرلے، اس کے اوپر خلاف واقعہ الزام لگائے، اس کی کردارکشی کرے تو آخرت کی عدالت میں ظالم کو بلایا جائے گا اور اس کی نیکیاں اس سے لے کر مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ اور اگر اس کے پاس نیکیوں کی مقدار کم ہو تو مظلوم کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ مظلوم ہلکا پھلکا ہو کر جنت میں جائے گا اور ظالم اپنے ساتھ دوسروں کے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا جہنم میں داخل ہوگا۔

ذکر و فکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے (ولذکر اللہ اکبر)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک گھڑی کا سوچنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے
(تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ)

ذکر و فکر سے متعلق جو آیتیں اور حدیثیں ہیں، ان کا ایک مطلب خالص روحانی ہے۔ یعنی اللہ کی صفتوں کو یاد کرنا اور ان سے ان جذبات و کیفیات کا دل میں پیدا ہونا جن کو قرآن میں خشوع، تضرع، اخبات، انابت وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیفیت دین کا اصل مطلوب ہے اور یہی خود عبادت کا بھی خلاصہ ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے ایک اور بہت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ علم کی فوقیت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عمل (Physical activity) کے مقابلہ میں ذہنی عمل کی اہمیت زیادہ ہے۔ جسم کی حرکت سے آدمی جو کام کرتا ہے، اس سے بہت زیادہ قیمت اس کام کی ہے جو وہ دماغ کی حرکت کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ ایک گھڑی کا دماغی کام ایک سال کے جسمانی کام کے برابر ہے۔

ایک مزدور بھی محنت کرتا ہے اور ایک انجینیر بھی۔ مگر مزدور کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے، اس سے بہت زیادہ معاوضہ وہ ہے جو انجینیر کو ملتا ہے۔ اسی مثال سے جسم اور ذہن کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جسمانی محنت اگر ہتھوڑا چلاتی ہے تو دماغی محنت مشین چلاتی ہے۔ جسمانی محنت پاؤں سے سفر کرتی ہے تو دماغی محنت کار اور ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ جسمانی محنت ظاہر کو جانتی ہے تو دماغی محنت حقیقت کا پتہ کر لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر تلوار سے لڑتی ہے تو دماغی محنت لڑائی کیے بغیر جنگ جیت لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر آدمی کو دکھائی دینے والی دنیا تک پہنچاتی ہے تو دماغی محنت کے ذریعہ آدمی غیب تک اور خدا کی چھپی ہوئی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔

حدیث کا مطالعہ

ایک شخص جب حدیث کا تفصیلی مطالعہ کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ حدیثوں میں کافی اختلاف ہے جو عام طور پر قرآن میں نظر نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر وہ الجھن میں پڑ جاتا ہے اور حدیث کی صحت کا انکار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کم فہمی کی بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں حدیث اس بات کا ریکارڈ ہے کہ ان غیر متغیر اصولوں کو روزانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح منطبق کیا گیا۔ عملی زندگی چوں کہ ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتی، اس لئے فطری طور پر انطباق میں فرق ہو جاتا ہے۔ حدیثوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ دراصل اسی فطری فرق کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ وہ حکم کا اختلاف نہیں بلکہ انطباق کا اختلاف ہے۔

مثال کے طور پر ہدیہ کے مسئلہ کو لیجئے۔ ایک طرف بہت سی روایتیں ہیں جن میں ہدیہ اور تحفہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے برعکس روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً مؤطا (باب ما جاء فی المهاجرة) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے کو ہدیہ دو، اس سے باہمی محبت پیدا ہوگی اور عداوت جاتی رہے گی (تهادوا تحابوا وتذهب الشحناءُ) مؤطا الامام مالک، صفحہ ۶۵۳۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہدیہ اور تحفہ کے لین دین سے آپس میں انسیت اور محبت بڑھتی ہے۔ اسی طرح ہدیہ اور تحفہ نہ دینے سے دوری پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ہدیہ دے اور اس کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا برعکس اثر ہوگا۔ آپس میں نفرتیں بڑھیں گی۔ باہمی تعلقات میں کھنچاؤ اور تناؤ کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح کی کیفیت دیر تک باقی رہے تو ایسے ماحول میں کوئی تعمیری کام کرنا ہی سرے سے ناممکن ہو جائے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایا کے تبادلہ کی تلقین بھی کی اور خود بھی اس پر عمل فرمایا۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ہدیہ دیا جاتا تو آپ خوشی کے ساتھ اس کو قبول فرماتے تھے (کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبل الهدیة)

فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۵/ ۲۴۹)

اب جہاں تک اہلِ اسلام سے ہدیہ قبول کرنے کا تعلق ہے، اس میں احادیث میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ لیکن غیر مسلموں کے سلسلہ میں روایات میں اختلاف ہے۔ کچھ روایتیں بتاتی ہیں کہ کسی غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے شوق کے ساتھ اس کو قبول فرمایا۔ دوسری طرف ایسی بھی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ (انی لا اقبل ھدیۃ مشرک) فتح الباری ۵/ ۲۷۳

سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ (باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین) میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم فدک (غیر مسلم حکمراں) کا ہدیہ قبول فرمایا۔ پھر عین اسی باب میں دوسری روایت ہے کہ ایک غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا (سنن ابی داؤد ۳/ ۷۰ - ۱۶۹)

یہاں واضح طور پر ایک ہی معاملہ میں دو مختلف مسلک اختیار کیا گیا۔ مگر یہ کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اس فرق کا سبب نفس حکم کا فرق نہیں ہے بلکہ حالات کا فرق ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ حالات کی رعایت ہمیشہ ایک حکم کے انطباق میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار حاکموں اور سرداروں سے ہدیہ قبول فرمایا۔ مثلاً تبوک کی مہم (رجب ۹ ھ) میں آپ نے تیس ہزار اصحاب کے ساتھ سفر فرمایا تھا۔ اس مہم کے ذیل میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس علاقہ کے مقام ایلہ کا حاکم یوحنا بن روبہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اس نے آپ کو ایک سفید خچر کا ہدیہ پیش کیا جو واضح طور پر اس بات کی علامت تھی کہ وہ آپ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے خوشی کے ساتھ اس کا ہدیہ قبول فرمایا۔ اس کے بعد معتدل فضا میں اس سے بات ہوئی۔ اس نے آپ سے صلح کرلی اور جزیہ دینے پر راضی ہوگیا۔ (فتح الباری ۳/ ۴۰۵)

یہ واقعہ واضح طور پر تالیف قلب کا واقعہ ہے۔ ایک حاکم جس سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے، اگر اس کا ہدیہ قبول نہ کیا جائے تو تلخی پیدا ہوگی اور بہتر تعلق قائم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اس کا ہدیہ قبول کرنا اور اپنی طرف سے اس کو ہدیہ پیش کرنا قربت اور انس کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر مسلم حاکموں سے ان کا تحفہ قبول فرمایا۔ سرداروں اور حکمرانوں سے ہدیہ قبول کرنے کے متعدد واقعات حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔

ایک انسان جو ایک مشن کا علم بردار ہو وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ لوگوں کے ہدیے اور تحفے قبول نہ کرے۔ ہدایا کے لین دین سے مشن کی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور ہدایا کو لینے سے انکار کرنا مشن کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ اس لئے اسلام میں یہ پسندیدہ بات نہیں کہ ہدایا کے لینے سے انکار کر دیا جائے۔

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ سنن ابی داؤد (۱۷۰/۲) اور بعض دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مشرک عیاض بن حمار المجاشعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی بطور ہدیہ پیش کی۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا: فانی نھیت عن زبد المشرکین (تو مجھے مشرکوں کا عطیہ لینے سے منع کیا گیا ہے) فتح الباری ۲۷۳/۵

واقعات بتاتے ہیں کہ یہ انکار حقیقۃً کوئی انکار نہ تھا بلکہ وہ شفقت کا ایک معاملہ تھا۔ اپنی زبان میں ہم اس کو ایک قسم کا ترغیبی انکار کہہ سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیاض بن حمار آپ کی تحریک توحید سے متاثر تھے اور ذاتی طور پر آپ کے عقیدت مند بن چکے تھے۔ مگر ابھی تک انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ آپ نے مذکورہ الفاظ میں ہدیہ کا انکار کر کے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ حسب توقع اس کا مفید اثر ہوا اور جلد ہی انھوں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ اب ان کو اسلام کی تاریخ میں عیاض بن حمار المجاشعی رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے (حیات الصحابہ ۲۴۵/۲)

سادہ پہچان

عن انس بن مالك، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه (رواہ البخاری ومسلم)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

ایک مسلمان کو دوسرے انسانوں کے لیے کیسا ہونا چاہیے، اس حدیث میں اس کی نہایت سادہ پہچان بتائی گئی ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے بھی وہی پسند کرنے لگے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

کسی آدمی کے ساتھ بد زبانی کی جائے تو اس کو برا لگے گا اور اگر اس کے ساتھ نرم بول بولے جائیں تو اس کو اچھا معلوم ہوگا۔ اسی ذاتی تجربہ کے مطابق وہ دوسروں پر بھی عمل کرے۔ وہ دوسروں کے ساتھ تلخ کلامی نہ کرے، وہ ہمیشہ ان کے ساتھ نرم انداز میں بات کرے۔

کسی کو اس کا جائز حق نہ دیا جائے تو وہ اس کو سخت ناپسند کرے گا۔ آدمی یہی معاملہ دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔ اس کے اوپر دوسروں کا جو حق ہے اس کو وہ ادا کرے، وہ دوسروں کی حق تلفی سے آخری حد تک اپنے آپ کو بچائے۔

کسی کے ساتھ وعدہ کیا جائے اور پھر اس کو پورا نہ کیا جائے تو اس کو بے حد تکلیف پہنچے گی۔ آدمی اسی سے دوسروں کے بارہ میں سبق لے لے۔ وہ کسی سے وعدہ کرے تو ضرور اس کو پورا کرے، وہ کسی کے ساتھ وعدہ خلافی کا سلوک نہ کرے۔

کسی کو نقصان پہنچایا جائے تو اس کو فوراً غصہ آجاتا ہے۔ اس ذاتی تجربہ سے وہ دوسروں کے بارہ میں جان لے۔ وہ کبھی دوسروں کو نقصان پہنچنے نہ دے، وہ ہمیشہ یہ کوشش کرے کہ اس کی ذات دوسروں کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

مومن ایک حساس انسان ہوتا ہے۔ اس کی حساسیت اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسروں کے حق میں ویسا ہی بنے جیسا وہ دوسروں کو اپنے حق میں دیکھنا چاہتا ہے۔

صفتِ مومن

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کسی ایک بِل سے دو بار ڈسا نہیں جاتا: لا يُلدَغُ المومنُ من جُحرٍ واحدٍ مرّتين (فتح الباري بشرح صحيح البخاري، جلد ۱۰/ ۵۴۶)

یہ حدیث تمثیل کی زبان میں یہ بتاتی ہے کہ مومن کسی غلط اقدام کا دوبارہ تجربہ نہیں کرتا۔ کسی معاملہ میں ایک بار کا غلط اقدام اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری بار اس کا اعادہ نہ کرے۔

مومن کے اندر یہ صفت کیسے آتی ہے۔ اس کا راز توبہ ہے۔ ایمان آدمی کے اندر جو ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس ذہن کا ایک اہم پہلو توبہ ہے۔ توبہ کے لفظی معنی پلٹنے کے ہیں۔ یعنی آدمی اگر بھول سے ایک غلطی کر جائے تو فوراً ہی اس کے اندر اپنی غلط کاری کا احساس جاگ اٹھے۔ یہ احساس اتنا شدید ہو کہ وہ غلطی کی حالت سے لوٹ کر اصلاح کی حالت کی طرف آجائے۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی کے اوپر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں آزاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک قادرِ مطلق خدا کی نگرانی میں ہے۔ اور لازمی طور پر ایک ایسا دن آنے والا ہے جب کہ خدا اس کے تمام اعمال کا حساب لے۔ جب کسی آدمی پر یہ سنگین حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ اس کو اس معاملہ میں انتہائی حد تک حساس بنا دیتی ہے کہ وہ کسی غلطی پر قائم نہ رہے۔ اگر کسی اتفاقی سبب سے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو فی الفور اس کا اندرونی احساس جاگ اٹھتا ہے اور وہ غلطی سے توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔

غلطی پر اصرار نہ کرنے کا یہ جذبہ جو مومن کے اندر آخرت کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے وہی دنیا کے معاملات میں بھی لازمی طور پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ یہ صفت مومن کی شخصیت کا ایک لازمی جز بن جاتی ہے۔ اسی طرح یہ صفت اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ غلطی پر قائم نہ رہ سکے۔ ایک غلط اقدام کے بعد وہ دوسری بار اس کا تجربہ نہ کرے۔

صحیح عمل سنجیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور غلط عمل غیر سنجیدگی کا۔ سنجیدہ انسان کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ ہمیشہ محتاط روش کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے وہ غلط اقدام سے بچ جاتا ہے۔ اس کے معاملہ میں غیر سنجیدہ انسان بے سمجھی اور بے احتیاطی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس لیے اس کا اقدام غلط بھی ہوتا ہے اور بے نتیجہ بھی۔

مبنی بر قلب

الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ، و اذا فسدت فسد الجسد کلہ، الا و ہی القلب۔

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/۱۵۲)

سن لو کہ جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو کہ گوشت کا یہ ٹکڑا دل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح کا حقیقی طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح جسمانی اعتبار سے آدمی اس وقت صحت مند ہوتا ہے جب کہ اس کا دل ٹھیک کام کر رہا ہو۔ اسی طرح کسی انسان کی دینی اور اخلاقی اور روحانی اصلاح اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کا فکر درست ہو، اس کا شعور صحیح طور پر کام کرنے لگے۔

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں — اصلاحی اور انقلابی۔ اصلاحی تحریک فرد کی تبدیلی کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن تحریکوں کو انقلابی تحریک کہا جاتا ہے، ان کا نشانہ سسٹم (اجتماعی نظام) کو بدلنا ہوتا ہے۔ اصلاحی تحریک کے مطابق، افراد کے سدھار سے اجتماعی زندگی میں سدھار آتا ہے۔ اس کے برعکس انقلابی تحریکوں کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ نظام پر قابض لوگوں کو ہٹا کر اس کے اوپر اپنا کنٹرول حاصل کیا جائے تاکہ لوگوں کو بدلا جا سکے۔

موجودہ زمانہ میں تبلیغی تحریک مبنی بر قلب تحریک ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری اکثر تحریکیں مبنی بر نظام کے اصول پر قائم ہیں۔ مبنی بر نظام تحریکوں کا اصول فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کا آخری نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھیں اور پھر کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہو جائیں۔

اس دنیا میں کوئی نتیجہ صرف کسی ایسی تحریک ہی سے نکل سکتا ہے جو مبنی بر قلب کے اصول پر اٹھائی گئی ہو، جو ایک ایک انسان کو اپنا نشانہ بنائے، جو ایک ایک انسان کے اندر فکر و شعور کی روشنی پیدا کرے، جو ایک ایک انسان کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ اس کو خدا پرست انسان بن کر دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔

اسلامی تحریک وہی ہے جو اسلامائزیشن آف مین کے فطری اصول پر جاری کی جائے۔ اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کے نام پر چلائی جانے والی تحریک غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اس کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

فرق کو جانئے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن خیر کی باتیں سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت تک پہنچ جائے (صفحہ ۹)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے۔ پس وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (والکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن، فحیث وجدھا فھو (حق بھا) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۱/۸

یہاں حکمت کی بات سے مراد صرف وہ بات نہیں ہے جو قرآن اور حدیث میں ہو بلکہ ہر وہ صحیح بات ہے جو کسی جگہ پائی جائے۔ اس سے مراد دراصل دانش مندی (Wisdom) کی بات ہے۔ اور دانش مندی کی بات کسی بھی شخص کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک جاہل اور عام آدمی کے ذریعہ بھی۔ دانش مندی کی بات دراصل فطرت کی بات ہوتی ہے۔ اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش مندی کی ہر بات اسلام کی اپنی ہی بات ہے۔ اور مومن کو اسے خود اپنی چیز سمجھ کر لے لینا چاہیے۔

اس کی وضاحت کے لیے یہاں ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ ایک عیسائی عالم نے خدا سے دعا کی تو اس نے اپنی دعا میں یہ الفاظ کہے۔ اے خدا مجھے وہ طاقت دے کہ میں جس چیز کو بدل سکتا ہوں اس کو بدلوں اور وہ تحمل دے کہ میں اس چیز کے ساتھ رہ سکوں جس کو میں بدل نہیں سکتا اور وہ دانش مندی کہ میں فرق کو جانوں:

Oh God give me the strength to change the things which I can, and the serenity to live with things I cannot change, and the wisdom to see the difference.

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی عیسائی یا غیر عیسائی کی بات نہیں ہے بلکہ وہ فطرت کی بات ہے۔ اور اسلام چوں کہ دینِ فطرت ہے اس لیے دانش کی ہر بات خود اسلام کی بات ہے مومن کو چاہیے کہ دانش کی ہر بات کو خود اپنی بات سمجھ کر قبول کرلے۔

فطری روش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مکہ میں ایک اختلافی واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں اس طرح آیا ہے :

اریقت دماء من بطنین من قریش فجمع ابوسفیان کبارھم وقال ھل لکم یامعشرقریش فی الحق اوما ھو افضل منہ۔ فقال القوم وھل من شئ افضل من الحق فقال ابوسفیان نعم انہ العفو فقام القوم وتصالحوا۔

قریش کے دو خاندانوں کے درمیان خون بہانے کا واقعہ ہوا، اس کے بعد ابوسفیان نے ان کے بڑوں کو جمع کیا۔ اور کہا۔ اے قریش کے لوگو، تم کو اپنا حق لینا ہے یا وہ جو اس سے بہتر ہے لوگوں نے کہا کیا حق وصول کرنے سے بھی بہتر کوئی چیز ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ ہاں وہ معاف کردینا ہے۔ اس کے بعد لوگ اٹھے اور آپس میں صلح کرلی۔

عرب جاہلیت کا یہ واقعہ دراصل فطرت انسانی کا واقعہ ہے اس وقت عرب کے لوگ اپنی فطرت پر قائم تھے، وہ فطری انسانی اوصاف سے متصف تھے اور جب کوئی انسان یا کوئی گروہ اپنی ابتدائی فطرت پر قائم ہو تو اس کا وہی حال ہوتا ہے۔ جس کی ایک تصویر مذکورہ واقعے میں دکھائی دیتی ہے۔

کسی سماج میں قتل کی قسم کا کوئی بڑا واقعہ پیش آجائے تو فوراً لوگوں کے اندر انتقام کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں مگر زیادتی کا انتقام لینا کوئی اصلاحی کام نہیں۔ یہ ایک برائی کو دو برائی میں تبدیل کرنا ہے۔ اس لیے خیر کی بات یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو معاف کردیں اور ٹوٹے ہوئے انسانی رشتے کو آپس میں جوڑلیں۔

زیادتی کا انتقام لینا پوری آبادی کو منفی عمل کا کارخانہ بنا دیتا ہے اس کے برعکس جب عفو اور درگزر کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔ منفی ماحول دوبارہ مثبت ماحول میں تبدیل ہوجاتا ہے زندگی کا قافلہ جو بظاہر ایک رکاوٹ سے دوچار ہوگیا تھا، وہ دوبارہ اپنے سفر پر رواں دواں ہوجاتا ہے۔

عمل کے درجے ہیں

ابو اُمامہ صُدَیّ بن عَجْلان الباہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک دو قطروں اور دو نشانات سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں۔ آنسو کا قطرہ جو اللہ کے ڈر سے نکلا ہو اور خون کا قطرہ جو اللہ کی راہ میں بہے۔ اور دو نشانات میں سے ایک نشان وہ ہے جو اللہ کی راہ میں لگے اور دوسرا نشان وہ ہے جو اللہ کے فرائض میں سے کسی فرض کی ادائگی میں پڑا ہو (لیس شیئ احب الی اللہ تعالیٰ من قطرتین واثرین۔ قطرۃ دموع من خشیۃ اللہ وقطرۃ دم تھراق فی سبیل اللہ۔ واما الاثران فاثر فی سبیل اللہ تعالیٰ واثر فی فریضۃ من فرائض اللہ تعالیٰ، رواہ الترمذی)

ہر عمل کے درجے ہوتے ہیں۔ آدمی کسی عمل میں جتنا زیادہ اپنے آپ کو شامل کرے، اس کو کرنے کے لئے اسے جتنا زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑے اتنا ہی اس عمل کا درجہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنے ظاہر کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ والا نہیں بنتا بلکہ اس نفسیاتی حالت کے اعتبار سے بنتا ہے جس کے تحت کسی نے اس عمل کو انجام دیا ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ انسان کے عمل کی نیکی بڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ دس گنا سے سات سو گنا تک پہنچ جاتی ہے (کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنۃ بعشر امثالھا الی سبعمائۃ ضعف، مسلم)

یہی معاملہ مذکورہ چیزوں کا بھی ہے۔ خواہ آنسو یا خون کا قطرہ ہو یا کوئی عبادتی نشان، اس کے بھی درجات ہیں۔ اور درجات کے لحاظ سے ان کا ثواب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک آنسو وہ ہے جو جلسۂ عام میں کسی کی آنکھ سے نکلتا ہے۔ یقیناً اس کا بھی ثواب ہے۔ مگر وہ آنسو جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرکے آنکھوں سے ٹپک پڑے اس کا درجہ اور بھی زیادہ ہے۔ ایک آنسو وہ ہے جو مشکلات و مصائب کے وقت نکلتا ہے۔ اس پر بھی آدمی کو ثواب ملے گا مگر اس آنسو کا درجہ اور بھی زیادہ بڑا ہے جو کامیابیوں کو دیکھ کر رازقِ حقیقی کے لئے نکل پڑے۔ ایک آنسو وہ ہے جو اپنے مسائل و معاملات کو سوچ کر نکلتا ہے۔ اس کا بھی ثواب ہے۔ مگر ان آنسوؤں کے درجہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو اللہ کی دنیا میں اللہ کی کاریگری کو دیکھ کر ایک بندہ کی آنکھ سے بہہ پڑتے ہیں۔

یہی معاملہ "خون" کا ہے۔ ایک خون کا قطرہ وہ ہے جو فوری مقابلہ کے وقت چوٹ کھا کر

آدمی کے جسم سے نکلتا ہے۔ یقیناً اللہ کے یہاں اس کا ثواب ہے۔ مگر اللہ کا ایک بندہ جب اللہ کی راہ میں برسہا برس تک مشقتیں اٹھاتے ہوئے اپنے خون کو خشک کرتا ہے تو اس کا ثواب اور بھی زیادہ ہے۔ ظالموں کا ایک گروہ آدمی کے جان ومال پر حملہ کرتا ہے اور وہ اس کے دفاع میں اپنے جسم کو زخمی کر لیتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے تو اس خون بہانے کا بھی ثواب ہے۔ مگر جب اللہ کا ایک بندہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے کہ لوگ جہنم کی طرف چلے جارہے ہیں اور لوگوں کو جہنم سے بچانے کی جدوجہد میں وہ اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتا ہے تو یہ اتنا بڑا عمل ہوتا ہے کہ اس کی بڑائی کو ناپنے کے لئے سارے گز چھوٹے ہو جاتے ہیں اور اس کو تولنے کے لئے سارے ترازو ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔

یہی معاملہ "نشان" کا بھی ہے۔ ایک نشان یہ ہے کہ ایک جنگ پیش آئی۔ آدمی اس میں کود پڑا اور لڑائی کے نتیجہ میں اس کے جسم پر کٹنے یا زخم لگنے کا کوئی مستقل نشان پڑ گیا۔ یا ایک شخص اللہ کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے اور سجدہ کی کثرت سے اس کی پیشانی پر نشان پڑ جاتا ہے۔ یقیناً ایسے نشانات کا بھی خدا کے یہاں ثواب ہے۔ مگر ایک شخص وہ ہے جو دیکھتا ہے کہ خدا کی دنیا میں بے شمار ہنگامے جاری ہیں لیکن خدا کے دین کی گواہی نہیں دی جارہی ہے۔ وہ بتیابانہ خدا کا گواہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے دوست اور رشتہ دار اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اس کے فائدوں اور مصلحتوں کا ڈھانچہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کو بے عزت کیا جاتا ہے، اس کو زخم پہنچائے جاتے ہیں، اس کی معاشیات کو اجاڑا جاتا ہے۔ اذیتوں پر صبر کرتے کرتے اس کا سینہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اس کا سکون غارت ہو جاتا ہے۔ اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ وہ جیتے جی قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اللہ کے راستہ کو نہیں چھوڑتا، پھر بھی وہ اللہ کی گواہی کے مقام سے نہیں ہٹتا۔

ایسے شخص پر بھی "نشانات" پڑتے ہیں۔ اس کی جوانی قبل از وقت بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کا شاداب جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا پھول سا چہرہ گرد وغبار میں اٹ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں آنسو بہاتے بہاتے بے رونق ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا پرستوں کی نظر میں ایک برباد شدہ انسان کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ زخم اور یہ نشانات مذکورہ زخموں اور نشانات سے مختلف ہوتے ہیں، بہت سے لوگوں کو وہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔ مگر اللہ کی نظر میں ان کا درجہ اتنا زیادہ ہے کہ سارے زمین وآسمان اور انھیں کے بقدر ایک اور زمین وآسمان بھی ان کی قیمت نہیں ہو سکتے۔

ISBN 81-87570-08-3
Rs. 70